ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، وہ اس
بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت و بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرة
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین۔

ادارۂ الفرقان

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

مسئول
محمد منظور نعمانی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب، جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی گویا مشترک تالیف ہے، اپنی اس خصوصیت میں اب بھی بے نظیر ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا صحیح اور مسنون طریقہ بھی تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و محبت اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو دراصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ عمدہ ... قیمت مجلد .... ۳/ /

آسان حج یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے ایسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اور معمولی اردو ہی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں

طباعت معیاری ... قیمت ... صرف -/۸/

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کوئی خاص مقبولیت و تاثیر عطا فرمائی ہے پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار گجراتی میں شائع ہو چکی ہے

اسلام کے متعلق ضروری واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ کامل مسلمان اور مومن کامل بننے کے لیے بھی اس کا مطالعہ اور عمل ان شاء اللہ کافی ہے زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور پرتاثیر ہے۔ کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری قسم اول کاغذ ۳۰ پونڈ چکنا مجلد -/۸/۲ قسم دوم کاغذ ۲۲ پونڈ چکنا غیر مجلد -/۸/۱

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد قیمت تین روپے -/-/۳

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ لیکن دل نشین انداز میں کی گئی ہے کہ سطر سطر سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ... -/۶/

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے

قیمت .... -/۱۲/

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت -/۶/

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت -/۸/۱

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب ... . قیمت -/-/۱

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

تمہید از مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل دید

حاصل مطالعہ او مسوط مقدمہ ...... -/۸/۲

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی۔ قیمت -/۸/۱

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ ... قیمت -/-/۱

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید اصغر حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے ...... قیمت -/۱۰/

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت -/۱۲/

ہندوستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (سکہ پاکستان) ۶ـ
" (سکہ ہندوستان) ۵ـ
ششماہی ۳ـ

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ [illegible]
اعزازی خریداروں سے
سالانہ ۱۵ـ

جلد (۲۶) | بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ مطابق جولائی ۱۹۵۹ء | شمارہ (۱۲)

نہایت اہم

آئندہ سے الفرقان ہر انگریزی مہینے کی یکم کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، لہٰذا محرم (اگست) کا پرچہ انشاء اللہ یکم اگست ۱۹۵۹ء کو شائع ہوگا، اور اسکے بعد بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا ——

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رسالہ پر آپکی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں، یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائیگا (جسمیں آپکے ۹ ر زائد خرچ ہونگے اور رسالہ دیر سے بھی پہنچے گا) —— چندہ یا کوئی دوسری اطلاع ۲۰ر اگست تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے۔
پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً ہوائی ڈاک سے بھیجدیں —— جو حضرات پہلے سے خریدار نہیں ہیں اُن کیلئے بھی یہی طریقہ ہے

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الفرقان کا چھبیسواں (۲۶) سال ختم ہو رہا ہے، ہمیں اپنے ناظرین سے شرمندگی ہے کہ ایک خاص نمبر کا جو وعدہ ہم نے اِس سال کے اندر کیا تھا، اس کے ایفاء کی صورت نہ بن سکی، اس میں زیادہ دخل اِس بات کا رہا کہ نمبر کا جو خاکہ ذہن میں تھا اُس میں کافی کام الفرقان کے مرتّب کو خود کرنا تھا، اور اس پورے سال میں صورتِ حال کچھ ایسی رہی کہ باہر سے قلمی تعاون کی کمی کی بناء پر سال کے بیشتر شمارے راقم مرتّب کو قریب قریب خود ہی تیار کرنے پڑے، اِس مشغولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِتنا وقت اور ایسی یکسوئی کسی طرح میسر نہ آسکی، جو اس کام کے لئے ضروری تھی، نمبر کا تقاضہ خود ہمارے اپنے دل کا تھا کہیں باہر کا نہیں تھا، اِسلئے جی چاہتا ہے کہ جس صورت میں وہ تقاضہ اُبھرا تھا، ٹھیک اُسی صورت میں اُس کو پورا کیا جائے، ورنہ چلتا ہوا کام تو ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال ہم اس معذرت کے بعد یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نمبر کا مسئلہ ابھی ہمارے ذہن سے نکلا نہیں ہے ہماری دلی خواہش ہے کہ یہ کام حسبِ تخیل ہو جائے، لیکن اَب ہم کسی خاص وقت کی تعیین نہیں کرنا چاہتے البتہ کوشش رہے گی کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جائے۔ والاتمام من اللہ۔

بعض حضرات نے صرف اس نمبر کی توقع پر الفرقان کی خریداری قبول کی تھی، ان میں سے کسی صاحب کیلئے اگر ہماری یہ معذرت قابلِ قبول نہ ہو، اور الفرقان کے عام شماروں کو وہ اپنے چندہ کا بدل بھی نہ سمجھتے ہوں تو ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ ان کا کُل یا جزو چندہ جس قدر وہ مطالبہ کریں واپس کر دیں۔

یہ نیک کام!

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا جو مضمون شوال کے الفرقان میں شائع ہوا تھا، اس کا ردِ عمل پورے زور شور سے شروع ہو گیا ہے، ہمیں اس ردِ عمل کا کوئی نوٹس نہیں لینا ہے ——— مولانا اصلاحی صاحب اگر ضرورت سمجھیں گے تو خود کچھ لکھیں گے ——— لیکن "دیدۂ عبرت نگاہ" کو اگر کچھ باتیں اس میں عبرت کی نظر آئیں تو اعراض بھی نہیں کرنا چاہیئے۔

اس مضمون پر ایک مضمون تازہ فاران میں، خود ایڈیٹر فاران کا شائع ہوا ہے، اس مضمون کی سرخی کیساتھ لکھا گیا ہے ——— "کاش! اس کی نوبت نہ آتی" ——— ہماری زبان پر آرہا ہے کہ "کاش! یہ نہ لکھا گیا ہوتا" ——— سر مضمون لکھا گیا ہے:-

ع

"قلم کانپا زباں تھرا گئی اظہار سے پہلے"

ہمارا اسے پڑھ کر دل کانپ اٹھا ہے، اور بے اختیار جناب باری میں عرض پرداز ہے کہ:- بارِ الٰہا! اپنے مخلصین اور درد مندانِ دین کی حفاظت فرما ——— اسلئے کہ ہم مدیر فاران کو مخلص سمجھتے ہیں اور انکے دل میں دین کا گہرا درد محسوس کرتے ہیں۔

یہ مضمون، جسے ہم کہتے ہیں کہ "کاش! نہ لکھا گیا ہوتا" یوں کہنے کو تو مولانا اصلاحی کے مضمون کا ایک الزامی جواب ہے، مگر در اصل یہ کچھ اور ہے، یہ افسادِ ذات البین کا ایک عبرت انگیز مرقع ہے ———

وہ "افسادِ ذات البین" جس کے بارے میں زبانِ رسالت سے صاف صاف وارد ہوا ہے:-

هِيَ الْحَالِقَةُ ——— یہ استرا ہے ——— بالوں کو مونڈنے والا نہیں بلکہ (آدمی کے) دین کا صفایا کر دینے والا!۔

(ترمذی و ابی داؤد)

مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا نعمانی کے متعلق چند تعریفی کلمات لکھ دیئے تھے، بس پورے مضمون میں سے صرف اسی کو لیکر ایڈیٹر فاران نے پوری کتاب کھول دی ہے کہ جب تم جماعت اسلامی میں تھے تو مولانا نعمانی کے متعلق تم نے اس کے برعکس کیا کیا لکھا تھا! وہ کتاب جسے یہ دونوں دوست آج نہیں انھیں دنوں لپیٹ کر رکھ چکے تھے جب یہ وجود میں آئی تھی، الفرقان کے صفحات اس پر گواہ ہیں! اگر ایڈیٹر فاران نے

ملاحظہ چاہئے تو دیکھئے الفرقان بابت ماہ ثانی ۱۳۷۸ھ مکاتبت مولانا اصلاحی و مولانا نعمانی۔ مولانا اصلاحی مولانا نعمانی کو لکھتے ہیں: "بہرحال اب میں ... اس بات کو کسی طرح جائز نہیں سمجھتا کہ آپ سے بدگمان رہوں"، (بقیہ صلا پر)

داستان کے اس خاتمہ کو جھٹلا کر بھرپور کوشش کی ہے کہ جو کام اس داستان سے اس وقت نہ ہو سکا تھا جب یہ داستان نہیں، ایک تازہ واقعہ تھی، وہ آج ہو جائے جبکہ یہ برسوں کی مسافت پر دفن ہو چکی ہے ——— کس قدر نیک کام ہے جو ایڈیٹر فاران نے پوری دلسوزی کے ساتھ اور اظہارِ حق کے جذبہ سے سرشار ہو کر انجام دیا ہے!۔

اس نیک کام میں فاران کے نیک دل ایڈیٹر نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے، پُرانی داستانوں کے اوراق ہی انھوں نے نہیں چھانے ہیں، بلکہ قوتِ فکر سے ایک نئی چیز بھی پیدا کر کے . . . ہدیۂ ناظرین کی ہے، اور وہ یہ ہے، کہ:—

"اس مقالہ[1] کے آغاز میں "ادارہ[2]" کی طرف سے جو نوٹ دیا گیا ہے، اُس کا اختتام قرآن کریم کی اس آیت پر ہوتا ہے:—

وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

مجلّہ "الفرقان" کے مدیر مسئول اور مرتب اللہ کے فضل سے دونوں صاحب تقویٰ بھی ہیں اور اہلِ علم بھی ہیں، لہٰذا قرآن کی آیت اس طرح استعمال کرنے کی جرأت یہی حضرات کر سکتے ہیں ہم گنہگاروں اور بے علموں کی تو یہ مجال نہیں ہو سکتی، اُن کی نگاہ میں مولانا اصلاحی کو اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت اب کی ہے، جبکہ وہ (سابق) جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہو چکے ہیں، اور مولانا مودودی کی عربی دانی، علم و فضل اور فکر و عمل، ان سب کو مجروح فرما چکے ہیں، مگر ہمیں مولانا اصلاحی کے ہدایت یاب ہونے میں کبھی شک نہیں رہا"۔ . . . الخ

(فاران، جولائی، ۱۹۶۱ء)

(صفحہ ۳ کا بقیہ حاشیہ) اس لئے میں آپ پر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اب میرا دل آپ سے بحمداللہ صاف ہے، اور میں آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے تمام الفاظ کی تلخیوں کو فراموش اور مجھے معاف کر کے مجھ سے اپنے دل کو صاف کر لیں"۔ اس کے جواب میں مولانا نعمانی نے جو خط لکھا تھا اُس کا ایک فقرہ یہ تھا ——— "دل میں آپ کی . . . . بالکل وہی جگہ ہے جو کبھی پہلے تھی، آپ کے مضمون کے بعد بھی اس میں کوئی فرق نہیں آسکا ہے"۔

[1] مولانا امین احسن صاحب کا مذکورہ مقالہ۔

[2] ادارۂ الفرقان (ع)۔

یہ ادارتی نوٹ راقم سطور (مرتب) کے قلم سے تھا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کوئی صاحب یہ معنی بھی اس آیت کو پہنا سکتے ہیں، مگر جب آدمی کسی بات پر کمر باندھ کے بیٹھ جاتا ہے تو پھر دیکھئے وہ کیسی کیسی دُور کی کوڑی لاتا ہے! -

یہ آیت کس سیاق میں آئی ہے، اس کا اندازہ اس پورے پیرے سے ہوسکتا ہے جس کا جزو یہ آیت ہے وہ پیرا صرف اتنا ہی سا ہے :-

"ہم اب اس مضمون پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں ——— وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ"

مدیر فاران جیسے سخن شناس ناقد سے یہ کہنے کی تو جرأت ہمیں نہیں، کہ :- ع

سخن شناس نئی دلبر خطا اینجاست

پس اس کے سوا کیا کہا جائے کہ سخن فہمی کا ایک نیا انداز انھوں نے ہم پر کھولا ہے، جس کے لئے مرتب الفرقان ان کا ممنون ہے، ورنہ وہ اگر کسی اور کے قلم سے بھی یہ عبارت دیکھتا تو اس کا مطلب صرف یہی سمجھتا کہ بحث اور اظہار حق کی سعی جس حد تک کی جاسکتی تھی کرلی گئی، اب یہ آگے اللہ کے اختیار ہے کہ وہ کس کو قبول حق کی توفیق دیتا ہے کس کو نہیں -

---

مدیر فاران نے اس دوسرے تیر کا نشانہ تو مولانا امین احسن صاحب کے دل پر باندھا تھا، ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ تیر نشانے پر بیٹھا یا نہیں! اس کو خود مولانا ہی بہتر بتا سکیں گے، البتہ جو ناوک فساد انھوں نے مدیر الفرقان کے قلب و جذبات کا نشانہ باندھ کر چلایا ہے، اس کے متعلق ان کی خدمت میں عرض ہے :-

بر و ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

کسی کی خاطر!! اس مضمون میں بحث کا ایک اور بھی پہلو ہے، اس کی تمہید میں مضمون نگار نے "حکمت عملی" کی بحث کو بھی چھیڑا ہے، اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا لہجہ بین السطور اور بعض بعض فقرے تک بول رہے ہیں کہ اس بحث میں مضمون نگار کا دل مولانا مودودی کے موقف اور ان کی

روش پر مطمئن نہیں ہے، مگر دین کیلئے گہرے درد و سوز اور تمام تر اخلاص کے باوجود اس کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مودودی صاحب کی غلطی کو کسی طرح نبھا لیا جائے ـــــــ مسئلہ میں جو حق ہے وہ ضرور اپنی جگہ پر رہے مگر مودودی صاحب کے وقار پر بھی آنچ نہ آنے پائے، خواہ اسکی قیمت پر حق میں التباس ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے۔

"حکمت عملی"، جس سے بحث ہے، کس چیز کا نام ہے؟ اور مولانا مودودی صاحب کا "نظریۂ حکمت عملی" ہے کیا؟ خود مولانا ہی سے پہلے اس کو سُن لیجئے! ـــــــ اُنہے اس نظریہ کو سب سے پہلی بار پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس معاملہ میں (کسی نصب العین کیلئے عملی جدوجہد کرنے کے معاملہ میں - ع) صرف نظریت کام نہیں دیتی، بلکہ اس کے ساتھ عملی حکمت ناگزیر ہے، اس حکمت کو نظر انداز کر دینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے، کیونکہ وہ یا تو قافلہ میں شامل نہیں ہوتا، یا پھر قافلہ کو لیکر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی، مگر جسے چلنا ہی نہ ہو، بلکہ چلانا بھی ہو، وہ ہر بات کو محض اُس کے خیالی حُسن کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا، اُسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے، کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے، جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے، یا فراہم ہونی ممکن ہے اور جو جو مزاحمتیں راستہ میں موجود ہیں، ان سب کو دیکھتے ہوئے کون سی بات قابلِ قبول ہے اور کون سی نہیں!"

اس سے زیرِ بحث "حکمتِ عملی" کا مطلب سمجھ لیجئے! ـــــــ آگے بڑھئے:-

"(اقامتِ دین کیلئے جدوجہد کرنے والا) جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا، اور پھر دورانِ سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثنا اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہ رکھوں گا، وہ عملاً اس مقصد کیلئے کوئی کام نہیں کر سکتا، یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے - وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راستہ کی کن کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے کن کن مواقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے، کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت

لچک کی گنجائش نکالنی چاہیئے "

(اس کے بعد حضور نبی کریمؐ کے اسوۂ حسنہ سے "اس لچک کی ایک عملی مثال" آتی ہے، اور اس کی روشنی میں توضیح کی جاتی ہے):—

"مگر یہ معاملہ دین کے سارے اصولوں کے بارے میں یکساں نہیں ہے جن اصولوں پر دین کی اساس قائم ہے، مثلاً توحید و رسالت وغیرہ، ان میں عملی مصالح کے لحاظ سے لچک پیدا کرنے کی کوئی مثال حضورؐ کی سیرت میں نہیں ملتی، نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے "

یہ مولانا کا نظریہ "حکمتِ عملی" ہوا!! —— اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے، کہ "لچک" سے مراد قربانی ہے، اس نظریہ پر اعتراضات کے بعد مولانا نے اپنے مدعا کی توضیح کرتے ہوئے یہی ظاہر کیا ہے (ملاحظہ ہو ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء) —— نیز یہ کہ خود مولانا کے بیان کے مطابق اس نظریہ کا پس منظر یہ ہے کہ الیکشن میں اُمیدواری سسٹم (جس کو مولانا اور پوری جماعت اسلامی قطعاً ناجائز سمجھتی تھی) کو انگیز کرنے کا مسئلہ تھا جس پر مولانا نے یہ نظریہ پیش کیا، اور اس کے ماتحت یہ فیصلہ ہوا کہ اُمیدواری، اسلام میں اگرچہ ناجائز ہے، اور اسکی بنا پر نہ ہمیں خود اُمیدوار بننا چاہیئے اور نہ کسی اُمیدوار کو ووٹ دینا یا اس کی کامیابی کیلئے کوئی تعاون کرنا چاہیئے، مگر ہم چونکہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر جگہ اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق آدمی کھڑے کر سکیں، اس لئے اگر ہمیں اقامتِ دین کے لئے عملاً کوئی کام کرنا ہے تو کم از کم اتنا ناگزیر ہے کہ خود اُمیدوار بن کر کھڑے ہونیوالے جو لوگ ہمارے مقصد کیلئے مفید ہو سکتے ہوں ان کو ہم خود بھی ووٹ دیں اور دلوائیں بھی ورنہ ہم اپنے مقصدِ اصلی کو نقصان پہنچانے کے مرتکب ہونگے —— (حوالہ۔ ایضاً)۔

اب آپ جناب فاران کی سُنئے! —— فرماتے ہیں:—

"جہانتک اصل موضوع و مبحث (حکمتِ عملی کا دین میں مقام) کا تعلق ہے، اس پر جتنے مضامین موافق و مخالف ابتک آئے ہیں، یا پچھلے علماء اور اہلِ فکر نے جو کچھ لکھا ہے[1]، اُسے پڑھ کر

---

[1] "پچھلے علماء اور اہلِ فکر" کی کوئی چیز تو اس عنوان سے ابتک سامنے لائی نہیں گئی ہے، ہاں حافظ ابن قیمؒ کی ایک فقہی بحث کا ترجمہ حال ہی میں ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے، یہ غالباً اسی کی طرف اشارہ ہے، اس کو شائع کرتے ہوئے اگرچہ یہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق حکمت عملی کی بحث سے ہے، مگر سمجھا ہم نے بھی یہی تھا، کہ (بقیہ حاشیہ)

ایک صائب الرائے شخص موازنہ اور محاکمہ کر سکتا ہے کہ کس کا موقف درست ہے، اور کس نے اپنی بات کی پچ میں کتنی دھاندلی کی ہے، جہاں تک دین کے اصل احکام کا تعلق ہو اس میں بیشک اللہ اور رسول کے علاوہ اور کسی کو ردوبدل کا حق حاصل نہیں ہے: "حکمت عملی" دین کے احکام کا حالات و مواقع کے لحاظ سے ان کے صحیح استعمال کا نام ہے، دینی احکام کے ردوبدل کو "حکمت عملی" نہیں کہتے!"

یہ خط کشیدہ جملے حق کی شہادت ہیں —— کہ حکمتِ عملی، بمعنی حالات و مواقع کے لحاظ سے احکامِ دینیہ کا صحیح استعمال تو درست ہے، لیکن یہ کہ عملی نقطۂ نظر سے قول کر کسی حکم کے ترک و اختیار کا فیصلہ کیا جائے، اس معنیٰ میں حکمت عملی کی دین میں کوئی گنجائش نہیں —— مگر اس سیاق وسباق اور اس محتاط انداز میں کہ جھنڈا مودودی صاحب ہی کا اونچا رہے! —— یا کم از کم کوئی آنچ تو ان پر نہ آنے پائے!!۔

اور سنئے!:-

"جو چیزیں نص کے ذریعہ حلال وحرام ہیں، ان کی برابری کسی حیثیت سے بھی وہ اجتہادی مسائل نہیں کر سکتے، جن کے جواز و عدمِ جواز کا فقہاء حکم لگاتے ہیں۔ . . . . اگر حالات کی تبدیلی کے ساتھ قیاسی و اجتہادی مسائل میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اور اس تبدیلی کو جسے دوسرے لوگ "تضادِ قول وعمل" سمجھتے ہوں، وہ عالم دین (جس نے تبدیلی کا ارتکاب کیا ہو - ع) "حکمت عملی" سے توجیہ کر دے تو اس پر یہ پھبتی چست کرنی ایک طرح کی زیادتی ہے کہ اس نے شریعت کو اپنے اہواء کے تابع کر لیا ہے!۔

(ص کا بقیہ حاشیہ) یہ ابنِ قیمؒ کی بحث کا اپنے مقصد کیلئے ایک گونہ حکمتِ عملی کے ساتھ استعمال ہے، اور ہم نے اس پر کچھ لکھ بھی لیا تھا لیکن اس خیال سے کہ جب ہم اس بحث کو بند کر چکے ہیں، تو جب تک شدید ضرورت ہی داعی نہ ہو اس کا دروازہ پھر سے نہیں کھولنا چاہئے، ہم نے اس کی اشاعت کا فیصلہ نہیں کیا، ورنہ جو خود نہیں سمجھ سکتے ہیں انہیں بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ اپنی بات کی پچ میں ایک جلیل القدر پچھلے عالم وامام کا کتنا غلط استعمال ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگرچہ اس بحث کا تعلق ہمارے یہاں کے موضوع ومبحث سے بالکل نہیں ہے، مگر اللہ کے فضل سے کسی کا بھی چاہت کے باوجود اس میں ایک ایسی چیز موجود ہے جو زیر بحث نظریۂ حکمتِ عملی سے امام ابن قیمؒ کی کامل براءت ظاہر کر دی گئی ہے — ص

ص یہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے ایک مقبول بندے کی حفاظت کا غیبی انتظام ہے۔

مولانا مودودی ہوں یا دوسرے علماء دین اور مفتیانِ شریعت ہوں، ان میں سے وحی تو کسی پر بھی نہیں آتی، یہ بھی نہیں ہے کہ انکی زبان و قلم سے جو حرف بھی نکل جائے، اُسے لازماً حق ہی ہونا چاہئے، یہ بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ حالات کے لحاظ سے شرعی اجتہاد کیا جاتا ہے، مگر وہ درست نہیں ہوتا، آگے چل کر حالات ہی کے اعتبار سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ پہلی بات درست نہ تھی، اس فیصلہ میں صورتِ حال اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے نہیں رکھا گیا تھا، تجربہ کے بعد اس غلطی کا پتہ چل جانے پر "حکمتِ عملی" کی توجیہہ کے بجائے اسکو غلطی اور فروگذاشت سے تعبیر کیا جائے، تو غلطی کا یہ اعتراف بہت سے دلوں کے خلجان کو دور کر دے گا، اور بحث و نزاع کیلئے کم سے کم گنجائش نکل سکے گی، مگر نتیجہ کے اعتبار سے ان دونوں موقفوں میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا"

بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس حصۂ مضمون میں کہاں کہاں پانی مر رہا ہے؟ اور "اگر" اور "مگر" کا یہ مضطربانہ حال کیا کچھ کہے دے رہا ہے؟ ——— اور اس اضطراب نے یہ کیا ذہنی کیفیت پیدا کر دی ہو کہ غلطی کا اعتراف اور "حکمتِ عملی کی توجیہہ" کا فرق ہی درمیان سے اُٹھ گیا ہے؟؟ ——— اس کے ساتھ اس پر بھی غور کیجئے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ مودودی صاحب کو مخمصے سے نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ ان کا نظریہ اپنی اصل شکل میں خود انہی کے الفاظ میں آپکے سامنے ہے، "شرعی اجتہاد" کا لفظ آج تک کی تمام تاویل و توجیہہ میں بھی ایک بار ان کی زبان پر نہیں آیا ہے ——— حالانکہ وہ بھی اس لفظ سے واقف ہیں ———

انھوں نے منصوص اور غیر منصوص احکام کی کوئی تفریق ہی کی، بلکہ صاف بتایا ہے کہ توحید و رسالت جیسے اساسی اصولوں کو چھوڑ کر دین کا ہر اصول اور ہر حکم اُن کی "حکمتِ عملی" کی زد میں آتا ہے، اور اس چھوٹے سے دائرہ کے سوا، دین کا کوئی حصہ نہیں بچ سکتا جس میں عملی مصالح کے لحاظ سے ترک و اختیار کے بارے میں تحریکِ اسلامی کے قائد کا فیصلہ نافذ اور ناطق نہ ہو۔ انھوں نے اپنے بیان کے مطابق، سب سے پہلے اس نظریہ کا استعمال "امیدواری" کے مسئلہ میں کیا جس کا شرعی حکم اُن کے نزدیک منصوص تھا ——— پھر انھوں نے مثالیں دے دے کر بتایا کہ اس اصول کے تحت جھوٹ بھی بولا جا سکتا ہے، غیبت بھی کی جا سکتی ہے، نامحرم عورتوں کے کپڑے بھی اُتارے جا سکتے ہیں ... ... حدود بھی ساقط کئے جا سکتے ہیں! ان میں سے غالباً ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے سب منصوص الاحکام نہ ہوں؟

مگر کس بلا کی معصومیت کے ساتھ کہا جا رہا ہے ـــــــ کہ :-

"اگر حالات کی تبدیلی کیساتھ قیاسی و اجتہادی احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اور اس تبدیلی کی ... (کوئی) عالم دین حکمت عملی سے توجیہ کر دے، تو ... ... (اس میں کیا گناہ ہے ؟)" ـــــــ

اور کس خوبصورتی کیساتھ سمجھایا جا رہا ہے کہ مولانا مودودی نے اگر کسی دینی حکم کو چھوڑ کر اس سے مختلف رویہ اب تک اختیار کیا ہے، یا کسی ایسے رویہ کے نظری طور پر وہ قائل ہیں، تو اس (مختلف رویہ) کی حیثیت ہے تو ایک شرعی اجتہاد کی ہے، اور یہ "حکمت عملی" کی بات تو محض ایک توجیہ ہے اس بدلے ہوئے "اجتہادی موقف" کی !! ـــــــ جیسے یہ خبر ہی نہ ہو کہ مودودی صاحب دین کے منصوص احکام و اصول میں بھی حکمت عملی کے تحت تبدیلِ موقف کے قائل ہیں[1]، جو شرعی دائرۂ اجتہادات یکسر خارج ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ "حکم کی تبدیلی" کی بات نہیں کرتے، کہ مسئلہ میں ہماری رائے بدل گئی ہے، اسلئے ہم عملی موقف بدل رہے ہیں، بلکہ اُن کا انداز یہ ہے کہ مسئلہ کا حکم اپنی جگہ پر وہی ہے، مگر تقاضائے مصلحت یہ ہے کہ اپنے عمل میں ذرا لچک پیدا کی جائے، اور فلاں وقت تک کیلئے اس حکم سے صرف نظر کر لیا جائے ـــــــ علاوہ انکی نظریاتی تصریحات کے "امیدواری" کے مسئلہ میں انکی تقریر (جس کا خلاصہ دیا جا چکا ہے) ہمارے اس بیان کی صریح تصدیق ہے ! ـــــــ اور ملاحظہ ہو ! :-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ دین میں "حکمتِ عملی" کا ایک مقام ہے، اس کے لئے "غیبت و کذب" کی مثالیں لانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس سے طبیعت کو وحشت ہوتی ہے ! "حکمتِ عملی" کی سب سے واضح مثال تو حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ روش ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں صوبوں کے تمام گورنروں اور حاکموں کی معاشرت، رہن سہن اور حالاتِ زندگی پر جس سختی کیساتھ احتساب فرمایا، اس طرح کا احتساب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر نہیں کیا۔" (فاران)

جزاک اللہ ! مودودی صاحب کے نیازمندوں میں سے کسی کو تو "غیبت و کذب" کی مثالوں سے وحشت ہوئی، اور کسی نے تو دین میں حکمتِ عملی کا صحیح مقام مولانا کو سمجھانے کی کوشش کی، خواہ روئے سخن کسی طرف بھی رہا ـــــــ مگر وائے رے شخصیت پرستی، کہ اگلے ہی قدم پر اس "صحیح" میں "غلط" کو بھی جگہ دلانے کی کوشش ہونے لگی، یا "صحیح" میں پہنچا ہوا قدم بے تکلف "غلط" میں جانے لگا !! ـــــــ چنانچہ ارشاد ہوا :-

"حکمتِ عملی" کی بالکل سامنے کی مثال یہ ہے کہ اب سے تقریباً چالیس سال قبل ہندوستان کے علماء کی غالب اکثریت نے

---

[1] اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قیاسی اجتہادی مسائل حکمت عملی کے تحت بدلے جا سکتے ہیں، ہم یہاں علی سبیل التنزل گفتگو کر رہے ہیں[2]

[2] ورنہ اس مسئلہ کی پوری تفصیل آگے آئے گی کہ ہمارے نزدیک کس قسم کے اجتہادی مواقف میں حکمت عملی کے ماتحت تغیر کیا جا سکتا ہے۔

انگریزی حکومت سے موالات کو ناجائز قرار دیا، مگر پندرہ سولہ سال بعد یہ موالاۃ جائز سمجھا گیا، اور کانگریس اور مسلم لیگ نے برطانوی سیادت کے زیر سایہ صوبوں میں زمامِ حکومت سنبھال لی "

کون بتائے کہ یہ موالات اور عدمِ موالات "اُن چیزوں میں سے نہیں ہے جن میں حکمتِ عملی کے ماتحت فیصلے ہوں۔ وہ تو مباحات" ہی کا دائرہ ہے جس میں حکمتِ عملی کے ماتحت ترک و اختیار کے فیصلے کئے جا سکتے ہیں" رہ گیا یہ مثال کہ :-

ـے ترکِ موالات کے فیصلہ کے بعد ایک وقت میں انگریزوں سے موالات کو جائز سمجھ لیا، اور برطانوی سیادت کے حکومتوں کی تشکیل سے متفق ہو گئے " تو یہ ــــ "موالات کو جائز سمجھ لینا" ــــ محض آپ کا اختراع ہے حقیقت یہ واسطہ اس کو نہیں! نہ ترکِ موالات کے فتوے کے مقابلہ میں ان علماء کا کوئی فتویٰ دکھایا جا سکتا ہے کہ "اب موالات ہے، اسلئے انڈیا ایکٹ ٣٥ء کے تحت وزارتیں بنالی جائیں" نہ کوئی شخص بسلامتیٔ ہوش و حواس ان علماء کے ں رویہ کو دیکھتے ہوئے ان پر یہ تہمت دھر سکتا ہے کہ انڈیا ایکٹ ٣٥ء کو ان کا قبول کر لینا انگریزوں سے موالات کو ز سمجھ لینے کی بناء پر تھا ــــ خدا کے بندو! مودودی صاحب کی بات کو نبھانے کیلئے ان بیچارے دوسرے علماء کو تو لوں میں نہ گھسیٹو! اور وہ تہمت تو ان پر نہ دھرو جسکے بارے میں انھیں پورے اطمینان کا حق ہے کہ دنیا کی جو بھی تہمت پہ دھری جائے، یہ تہمت نہیں دھری جا سکتی[1]

خیر یہ واقعہ کی بحث تو الگ رہی، نفسِ مسئلہ کی بات یہ ہے کہ جہاں تک موالات و عدمِ موالات کے اصل احکام کا تعلق ہے کتاب و سنت میں منصوص ہیں، اُنکے متعلق تو فاران کے فاضل مدیر کا بھی خیال ہے کہ انہیں کوئی شخص سرِ مو تغیر کرنے کا جائز نہیں ہے ــــ لیکن ان احکام کے (اور اسی طرح تمام مسائل کے اصل احکام کے) کسی خاص محل میں استعمال کا عاملہ بھی یہ ہے کہ اولاً تو جس جگہ بھی ان کو استعمال کیا جائے گا اس بنیاد پر استعمال کیا جائے گا کہ اس جگہ یہ احکام منطبق ہو رہے ہیں، علیٰ ہذا جب ان احکام کا استعمال ترک کیا جائے گا، اور عملی رویہ بدلا جائے گا تو اسی بنیاد بھی ہوگی کہ اب یہ محل، ان احکام کا محلِ استعمال نہیں رہا اور یہ احکام اب اس جگہ پر منطبق نہیں ہو رہے۔ نہ یہ کہ نقطۂ نظر سے ہمارے آپکے نزدیک اب ان احکام کا استعمال مناسب نہیں ہے ــــ پس موالات و عدمِ موالات کے احکام ہوں یا دوسرے احکامِ اصلیہ، کوئی عالم اگر مذکورہ بالا صحیح اصول پر انکے استعمال و ترکِ استعمال کی بات کرتا ہے تو انطباق و عدمِ انطباق کے مسئلہ میں تو اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر اصولی طور پر اسکی روش کو صحیح مانا جائیگا! ایک نہیں امت کی بدقسمتی سے ایک ہزار عالم بھی جمع ہو کر اگر انطباق و عدمِ انطباق کے نقطۂ نظر کو چھوڑ کر محض

---

[1] ـــ واقعاتی بحث پر تفصیل کی ہم ضرورت اسلئے نہیں سمجھتے کہ اس واقعہ سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود ہیں، وہ خود اپنی ـــ وہ تشریح خود کر سکتے ہیں۔

عملی نقطۂ نظر سے کسی دینی حکم کے استعمال و ترکِ استعمال کا فیصلہ کرنے لگیں، تو چاہے وہ سب کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں ان کا یہ طرزِ عمل اصولی حیثیت سے گمراہی ہی کہلائے گا ـــــــ یہی حال قیاسی احکام کا بھی ہے کہ اگر "قیاس صحیح" سے جو مجتہدینِ امت کے نزدیک معتبر، اور ایک دلیلِ شرعی ہے، کوئی حکم ثابت ہو جائے تو پھر محض عملی نقطۂ نظر سے کام لے کر، جسکی یہاں بحث ہے، اس کو بھی ترک نہیں کیا جا سکتا! ـ

اسکے برعکس جو امور مباحات کے دائرہ کے ہیں، اور اُن میں کسی دینی حکم کی بحث ہی نہیں پیدا ہوتی، انکے بارہ میں ہر شخص آزاد ہے کہ جو چاہے رویّہ اختیار کرے، وہ اگر کسی اسلامی تحریک کا قائد ہے تو اسکو اختیار ہی نہیں، عند اللہ اسکی ذمہ داری ہے کہ جو رویّہ اسلامی تحریک کے مفاد میں سمجھے اسکو عمل میں لائے، تجربہ سے مضر ثابت ہو تو اسمیں تبدیلی کر دے، یا ایک وقت میں مفید ثابت ہو تو اُسے اختیار کئے رہے، دوسرے وقت میں مضر ہونے لگے تو اسکو ترک کر دے، اسی طرح وہ اگر مسلمانوں کے "اولوالامر" میں سے ہے تو اپنے یا حکام کے یا عوام کے جس رویّہ میں مسلمانوں کی مجموعی مصلحت دیکھے اسکو خود اختیار کرے، حکام کو اسکی ہدایت کرے، اور عوام کو اسکے مطابق چلائے، دو جگہ دو مختلف رویّے اختیار کرنا ہی قرینِ مصلحت ہو تو ایسا کرے ـــــــ غرض مباحات کے دائرے میں، حدودِ اباحت کے اندر ہر رویّہ کی آزادی ہے، اسی لئے پوری گنجائش ہے کہ "حکمتِ عملی" سے کام لیا جائے، عملی نقطۂ نظر سے فیصلے کئے جائیں۔ حضرت عمرؓ کے "متضاد" رویّہ کی جو مثال سامنے لائی گئی ہے، بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ اس مثال کا تعلق اسی قبیل کے امور سے ہے، اسی لئے انھیں حق تھا، اور آج دوسروں کو بھی حق ہے کہ اس دائرہ میں جو چاہیں پالیسی بنائیں، جب چاہیں اُسے ترک کر دیں، اور دس جگہ دس رویّے اختیار کرنے کی ضرورت سمجھیں تو کریں، کوئی ان سے یہ تو کہہ سکتا ہے کہ مصلحت کے خلاف کر رہے ہو، یہ کوئی نہیں کہے گا کہ دین کے خلاف کر رہے ہو! ـ

افسوس ہے کہ یا تو حق سے آگاہی کے باوجود، مودودی صاحب کی روش نے، صاحبِ فاران پر حق ملتبس کر دیا کہ وہ معاشرتی معیار اور "موالات و عدمِ موالات" جیسے امور کو یکساں سمجھ بیٹھے، یا انھوں نے جانتے بوجھتے، مودودی صاحب کے بچاؤ کی خاطر کہ یہ بھی انکی نظر میں ایک نیک کام ہے، یہ جرأت کر ڈالی کہ "انڈیا ایکٹ" کے قبول کر لینے کو "موالات" کا رنگ دیدیا ـــ بہرحال شخصیت پرستی کے یہ دونوں ہی اثر قابلِ افسوس اور قابلِ عبرت ہیں! ـ

٭ الشیخ حبیبٌ الینا والحق احبُّ الینا منہ "کا جو مقولہ جماعتِ اسلامی کے حلقوں میں بڑی اونچی صداؤں سے ہوا گلے اور پچھلے "شیخ" کے رخ پر بلند ہوتا رہا، یہ مقامِ عبرت نہیں تو کیا ہے؟ کہ آج وہ ...

کئی باتیں اور قابلِ ذکر تھیں، مگر اب صفحات کی گنجائش جواب دے رہی ہے، اور شاید ان کا تذکرہ کچھ ...

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم کا

سفرنامۂ حجاز

تلخیص و ترجمہ —— از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی —— قسط دوم

یہ مضمون دراصل تین قسطوں کا تھا، اور مولانا نسیم احمد صاحب کا ارادہ بھی یہی تھا۔ مگر اس صورت میں آخری قسط اگلے سال کے فائل میں چلی جاتی اور یہ کچھ مناسب نہ ہوتا۔ اس لیے ہم کچھ زیادہ صفحات اس مضمون کو دے کر اسی قسط میں پورا مضمون ختم کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین کرام بھی اس فیصلہ کو مناسب قرار دیں گے —— (مرتب)

بمبئی سے حدیدہ ۱۵ر شعبان ۱۲۵۵ھ کو جہاز کا لنگر اٹھا۔ ۵ر رمضان کو جہاز عدن کی بندرگاہ پر پہونچا۔ اسی تاریخ کو شہر عدن میں جانا ہوا۔ عدن ایک مشہور شہر ہے مگر آج کل اپنی موجودہ حیثیت کے لحاظ سے ایک گاؤں سے زیادہ نہیں ہے۔ یہاں کے باشندوں کے اکثر مکانات خس پوش ہیں اور "آرائش سقف و جدار" بوریے سے ہوتی ہے۔ چند مکانات پختہ بھی ہیں —— یہاں سے قبلہ سمت شمال ہے —— سید ابوبکر عیدروس کا مزار اسی جگہ ہے۔ سید زین (جو کہ اس بستی کے اکابر و مشائخ میں سے ہیں) کے مکان پر ہم کا قیام ہوا۔ سید ابوبکر عیدروس ان کے رشتہ داروں میں سے تھے —— ان کے فرط اخلاق کا کیا ذکر کروں۔ پہلے سے کوئی تعارف نہ تھا لیکن باوجود اس کے ایک مسافر کے ساتھ انتہائی لطف و مہربانی سے پیش آئے جو اصحاب کے [illegible]

سے مل کر ماقبل کی صحبت ذہن تازہ ہوگئی۔ عمدہ آدمی اور مبارک انسان ہیں۔ "تقویٰ وایثار" اور "ورع شعار" ہیں۔

عدن آج کل انگریزوں کے قبضہ میں ہے، سنہ ... گزرے کہ حاکم سابق سے انھوں نے عدن لے لیا ـــــ اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء ـــــ اور اس قبضے کا سبب سننے میں آیا کہ ارباب حکومت انگلشیہ کو اپنے دخانی جہازوں کے لیے جو سوئیس (سوئز) سے لندن آمد و شد رکھتے ہیں، ایک ایسی بندرگاہ مطلوب تھی جہاں پر سامان آب و آتش بہ آسانی مہیا ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے حاکم عدن سے کہا کہ عدن کی آمدنی سے زیادہ ہم سے لو اور یہاں کی حکومت سے دست بردار ہو جاؤ۔

امیر عدن، سیدھا سادہ ناتجربہ کار شخص تھا۔ اس نے روپیہ دیکھا اور ... پر نظر کی جہت ایک معاہدہ لکھ دیا۔ جب انگریزوں نے وفائے معاہدہ کا مطالبہ کیا تب امیر کی آنکھیں کھلیں اور جان سے ہاتھ دھو لیے۔ عدن کو چھوڑنا نہ چاہا۔ پھر تو انگریزوں نے اس سے جنگ کی اور عدن کو زبردستی اس کے قبضے سے نکالا ـــــ جس عطیے کا وعدہ کیا تھا وہ بھی نہ ملا ـــــ اس زمانے میں کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں، اعراب، انگریزوں سے لڑنے کے لیے فراہم ہوئے ہیں، بلکہ میرے آنے سے ایک روز پیشتر مقابلہ بھی ہو چکا ہے۔

عدن ساحل سمندر سے تین کوس ہے۔ یہ دوری ان مسافروں کے لیے جو شہر دیکھنا چاہتے ہیں "مایۂ آزار خاطر" ہے۔ کیونکہ آنے جانے کا پورا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ دو رات عدن میں قیام کر کے ۸ رمضان کو واپس ہوئے ـــــ ۸ رمضان کو بادبان کھول دیے گئے۔ ۹ کو چاشت کے وقت باب المندب سے جو ایک خطرناک موقع ہے سلامتی کے ساتھ گزرے ـــــ دو دن باقی تھا کہ بندرگاہ مخا پر جہاز ٹھہرا ـــــ اتر کر مخا گئے۔

یہ شہر کوچہ ہائے تنگ رکھتا ہے، اس کی عمارتیں پختہ اور سفید ہیں۔ سبزیاں یہاں بہت پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ موسم گرما کے میوے ـــــ اس زمانے میں کہ آغاز زمستان ہے ـــــ بکثرت ہیں۔ چونکہ یہاں صرف دو دن قیام رہا اس لیے یہاں کے اہل علم کو نہ دیکھ سکا اور نہ ان کے حالات سے آگاہ ہوا ـــــ البتہ ایک عالم سے جو زبید کے رہنے والے ہیں اور محمد جمال نام ہے ـــــ ملاقات

ہوئی۔ یہ مخا کی جامع مسجد میں بخاری شریف کا درس دیتے ہیں۔ محقق، فقیہ اور صلاح و تقویٰ میں بلند مرتبہ ہیں ___ اور کیوں نہ ہوں قضاء و قدر نے اہل یمن کی قامت زیبا کو جامۂ تقویٰ اور لباس علم سے آراستہ کیا ہے ___ صنعاء جو کہ اشرف بلاد یمن اور تخت گاہ امیر ہے "محدث خیز" سرزمین ہے۔ آج کل علم حدیث تنہا اس جگہ ہو۔ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس فراوانی اور وسعت کے ساتھ کسی دوسری جگہ ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب ___ وفوق کل ذی علم علیم ___

قاضی شوکانی جو صنعاء کے قاضی القضاۃ تھے تا ذکر بعد از سلف، فن حدیث میں وفور حافظہ واطلاع کے لحاظ سے آج ان جیسا کون ہو؟ قاضی صاحب فروع میں تقلید ائمہ نہیں کرتے تھے اپنے اجتہاد پر عمل تھا اور یہ بات ان کے ساتھ خاص نہیں ہے اس جگہ کے تمام اہل حدیث اسی روش پر چلتے ہیں۔

ارض یمن اگر اتنے ارباب خیر و صلاح کا مسکن اور اصحاب نجات و فلاح کا مجمع ہے تو تعجب کی کونسی بات ہو؟ خواجۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی یمن کے بارے میں فرمایا ہو۔ الایمان یمان والحکمۃ یمانیۃ ___

۱۲ رمضان کو مخا سے واپسی ہوئی ___ ۱۳ رکو بوقت شام قریب حدیدہ جہاز لنگر انداز ہوا۔ رات کے وقت نزدیک ساحل نہ جا سکے۔ ۱۴ رکو بندرگاہ حدیدہ میں جہاز ٹھہرا ___ ۱۵ ر رمضان حدیدہ میں جانا ہوا۔ ایک مکان کرایہ پر لیا۔ یہ مکان جامع مسجد کے قریب تھا ___ حدیدہ کی آبادی کا طرز مخا جیسا ہے۔ لیکن مخا اس سے زیادہ بڑا ہے۔ آج کل مخا، حدیدہ اور ارض یمن کا کچھ اور حصہ محمد علی پادشاہ مصر کے زیر تصرف ہے ___ محمد علی پادشاہ نے یہاں کی گورنری ابراہیم پاشاہ کے سپرد کر دی ہو ___ اس جگہ کے مشاہیر فقہا میں شیخ محمد سندی حنفی اور حسن خطیب شافعی ہیں۔ حسن خطیب سے ملاقات نہ ہو سکی، فقیہ محمد سے مکرر ملاقات کا موقع ملا ___ یہ روشن دل نیک روح اور پاکیزہ نفس شخص ہیں۔ ان کا مولد و منشاء دیار سندھ ہو، کسب علم اس علاقہ میں کیا ہے۔ ان کے پاس بڑی تعداد میں کتب نفیسہ موجود ہیں ___

حدیدہ سے دس کوس کے فاصلے پر ایک قریہ ہے مراوعہ نام ___ وہ جناب سید محمد عبدالباری کی پیدائش گاہ ہے۔ چونکہ ان کے فضائل کا شہرہ تمام سامعہ افروز ہوا اس لیے

طبیعت ... ملاقات ہوئی ۔۔۔ ۱۹ رمضان کی شب کو مرادہ کے لیے چل کھڑا ہوا ۔۔۔ صبح کے وقت منزلِ مقصود پر دم لیا۔ سید صاحب موصوف حسن اخلاق سے پیش آئے اس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اکرامِ ضیف اُن سے سیکھنا چاہیے ۔۔۔ کہتے ہیں کہ وہ مراتب ولایت میں اہلِ تمکین میں سے ہیں۔ ان کی عمر تخمیناً پینتیس ۳۵ سال ہوگی ۔۔۔ مخلوق کی حاجت برآری کی طرف ان کی بڑی توجہ ہے۔ ان کی مساعی مشکور ہیں، ان کی سفارش مؤثر ہے ان کا رقعہ فرمانِ سلطان سے زیادہ اثر رکھتا ہے ۔۔۔ سید صاحب کے پانچ بھائی اور ہیں وہ سب کے سب بھی متقی پرہیزگار ہیں۔ ان حضرات کی فراوانیٔ خلق کی نظیر ان کے خاندان کے علاوہ اور کہیں نہ ملے گی۔

ع ایں خانہ تمام آفتاب است ایں سلسلہ از طلائے ناب است

سید صاحب مذکور اپنی اس مہمان نوازی کی بنا پر جو اہلِ عرب کا شیوہ ہے نہیں چاہتے تھے کہ میں دو تین دن قیام کیے بغیر چلا جاؤں ۔۔۔ لیکن میں ایک دن رات سے زیادہ مجبوراً نہ ٹھہر سکا ۔۔۔ ۲۰ رمضان کی رات کو بزرگانِ مرادہ سے رخصت ہو کر صبح کے وقت حدیدہ واپس آیا ۔۔۔ دیارِ یمن گرم علاقہ ہے ۔۔ اس زمانے میں آفتاب برج قوس میں ہے اور ابھی گرمی دور نہیں ہوئی ۔۔۔ بلادِ یمن کے باشندے اکثر و بیشتر شوافع ہیں اور ان کی قرأت ابن کثیر والی قرأت ہے ۔۔۔

اس سرزمین کے مشہور اولیا میں سے سید احمد مقبولی ورعی ہیں۔ مراتب کشف و شہود میں ان کی شان عظیم ہے۔ اگرچہ ان کے فضائل بمبئی میں سن چکا تھا اور دل ان سے ملاقات کا مشتاق تھا لیکن سید محمد عبد الباری کی بزم کا شوق اتنا غالب آیا کہ محفل سید احمد میں (ودیم؟) نہ پہنچ سکا۔ عرفت ربی بفسخ العزائم ۔۔

حدیدہ سے روانگی اور جہاز کا ٹوٹنا

۲۰ رمضان کو جہاز حدیدہ سے چلا ۔۔۔ تین دن کے بعد تیسویں کی شب میں ایک گھڑی رات گزری ہوگی کہ جہاز ناگاہ ایک چٹان سے جو سمندر میں چھپی ہوئی تھی ۔۔۔ ٹکرا گیا ۔۔۔ ٹکر کا لگنا تھا اور جہاز کا ٹوٹنا۔ جہاز کیا ٹوٹا، دل ٹوٹ گئے ۔ موت یا بنا اپنے رخ سے گوشۂ نقاب الٹ رہی تھی اور زندگی دمبدم اپنے چہرہ پر پردہ ڈال رہی تھی۔ ایک طرف

موجوں کی طغیانی جہاز کو پہاڑی سے ٹکرا رہی تھی، دوسری طرف پانی جہاز کے اندرونی حصے میں بھرا
تھا اور بحر خون ہو رہا تھا۔ رات دل دشمن کی طرح سیاہ تھی۔ کسی کو خبر نہیں کہ یہ کون سا مقام ہے،
اور کیا جگہ ہے۔ سب اس امید میں صبح کے سخت منتظر تھے کہ اکثر پہاڑیاں قریب ساحل ہوا کرتی
ہیں اگر ایسا ہوا اور صبح تک جہاز ریزہ ریزہ نہ ہوا، تو ممکن ہے کہ جانیں سلامت رہ جائیں،
ورنہ اس جہاز کے تختوں میں سے کوئی تختہ ہی اگر ساحل پر پہونچے گا تو ہمارا قصہ عزیزان
وطن سے بیان کرے گا، ؎

قصۂ ما بعزیزانِ وطن خواہد گفت ہر کہ تختہ ازیں ورطہ بساحل برود

میں اس بھیانک رات کی سیاہی اور درازی کا کیا حال بیان کروں ؎

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل کجا دانند حالِ ما سبک ساران ساحلہا

اسی امید و بیم کی کشمکش میں رات گزری اور روئے سحر نمودار ہوا۔ لوگوں نے دائیں بائیں آنکھیں
پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر ساحل نظر نہ آیا۔ آنکھیں خیرہ ہو گئیں تو یہ بات کھلی کہ ساحل کا نام و نشان
نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ——— جب سورج چمکا تو اتنا ہوا کہ ایک چھوٹا
سا جزیرہ دکھائی دیا۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ فوراً چھوٹی کشتی جہاز میں سے
لے کر سمندر میں ڈال دی اور اس پر بیٹھ گئے۔ ڈوبتے ہوئے جہاز کو وہیں چھوڑا، مگر موجوں
کے تھپیڑوں سے کشتی اخروٹ کی طرح غلطاں تھی اور یہ حال تھا کہ جیسے ایک پتا آندھی
میں اڑتا پھرے۔ کبھی کشتی پر ہوتے آب چلتی تھی اور کبھی پانی پر ہوتی کشتی ——— تمام کشتی
نشین سر سے پاؤں تک اور آستین سے دامن تک پانی سے بھیگ گئے لیکن اس حال سے
کیا خوف ہوتا۔ ع

انا الغریق فما خوفی من البلل (میں تو ڈوب رہا ہوں مجھے تری کا کیا خوف)

بہر حال کشتی کسی طرح اس جزیرہ تک پہنچا ہوا ——— یہ جزیرہ ایسا تھا کہ "چشم حاسد" کی
طرح تنگ، بلکہ زیادہ تر بھوک سے "اصحاب الرقیم" سے زیادہ کشادہ ہوتا ہو۔ اور ہم اس کے کنارے
کچھ دیر بیٹھ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گئیں اور اس جزیرہ میں کیا تھا" اور دل میں
یہ سوچتے رہے کہ کوئی بات کر کے دن گزر جائیں، نہ کوئی ساحل کہ وہاں تک پہنچ جائیں

____ جزیرہ کا یہ حال اور کشتی کا وہ حال جو بیان کیا گیا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ جزیرے میں اُتر جائیں اور "اجلِ مقدر" تک یہیں بسر کریں ____

شکستہ جہاز سے اُترتے وقت جو سامان پانی سے محفوظ اور اوپر تھا اس کو سمندر میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ اس کے لے جانے کی بظاہر یہی ایک تدبیر تھی، جو سامان ہمارے پاس باقی رہنا مقدر تھا وہ بحکم خالقِ بحر و بر ہم کو مل گیا اور جو جانا تھا وہ چلا گیا۔ خدا کا شکر ہو کہ بہت سا سامان ہاتھ لگا اور کم ضائع ہوا۔ مگر اُس وقت نہ مال جانے کا غم تھا اور نہ مل جانے کی خوشی تھی ____ آب شیریں کے بڑے بڑے ڈرام بھی سمندر میں ڈال دیے گئے تھے ____ ان ڈراموں میں جن کو جانا تھا چلے گئے اور جن کو رہنا تھا رہ گئے، اسی طرح اجناس خوردنی میں جتنا حصہ نکالا جا سکا نکال لیا۔ ان اجناس میں اکثر چاول اور باجرہ تھا جس کو اہلِ جہاز نے تجارت کے لیے لاد رکھا تھا۔ طوفان کے فرو ہو جانے کے بعد (جزیرے میں) مشورہ ہوا کہ کیا کرنا چاہیے۔ جو گفتگو درمیان میں آئی یہ تھی کہ آب و دانہ یہاں موجود نہیں، آٹھ ڈرام پانی کے ہیں اور آدمی دو سو سے زائد ہیں، ظاہر ہو کہ اتنا قلیل پانی چند روز کا سرمایہ ہے، جب تک کسی دوسرے مقام کا پتہ نہ چلے کشتی کا چلنا معلوم ____ راہ خیر مسدود ہے پھر کیا کرنا چاہیے؟ سب نے بیک زبان کہا کہ کام ہاتھ سے نکل چکا ہے اور پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں کہ اس چھوٹی کشتی میں ہم میں سے چند آدمی جان پر کھیل کر بیٹھ جائیں پھر دیکھیں پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ اگرچہ خیال نہیں ہے کہ ایسی معمولی کشتی ایسے سمندر سے سلامت گزر جائے گی، مگر مجبوری ہے ____ اگر سمندر میں پانی کا خوف ہے تو جزیرے میں [illegible] کا ڈر ہے۔ بالآخر بحکم الغریق یتشبث بکل حشیش (ڈوبتے کو تنکے کا سہارا) اس معمولی کشتی میں کہ تنکے سے زیادہ نہ تھی، نو دس آدمی جن کے امیر مولانا فضل علی تھے چند کشتی بانوں کی ہمراہی میں روانہ ہوئے۔ ان نو اشخاص میں ایک مولوی برہان الدین صاحب بھی تھے۔ مولوی برہان الدین سے یمن میں ملاقات ہو گئی تھی۔ پنجابی ہیں۔ فطرتِ سلیم اور فکرِ مستقیم رکھتے ہیں۔ وہ حج اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ اس سال اشرف البلاد میں سکونت کے ارادے سے ہجرت کر کے جا رہے تھے۔ الغرض اس مصیبت عظمیٰ کے چار دن بعد ان لوگوں کو ۳ شوال کو توکلاً علی اللہ اس کشتی میں بٹھا دیا اور بقیہ افراد رحمتِ الٰہی کے منتظر ہو کر وہیں بیٹھے رہے ____ ہر صبح کو جب بیدار

ہوتے سمندر کی طرف نگاہ کرتے تھے اور ہر رات کو جب سوتے سفینے کا تذکرہ کر کے سوتے تھے —

دو کشتیوں کا آنا اس کشتی کی روانگی کو پانچ دن اور جہاز کے ٹوٹنے کو سولہ دن گزر گئے تھے کہ شام کے وقت دو چھوٹی کشتیاں نمودار ہوئیں۔ گویا شب سیاہ کی سحر ظاہر ہوئی — سمندر میں کشتی، فلک پر ہلال عید کی طرح دل آویز معلوم ہوتی تھی — ہم نے سمجھا کہ جانے والے ساحل کا پتہ معلوم کر کے واپس آ گئے لیکن جب ملاح اترے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے جانے والے آدمیوں میں سے ایک بھی نہیں ہو بڑا تعجب ہوا۔ پوچھ گچھ کرنے پر ان لوگوں نے یہ داستان سنائی کہ تمھارے فرستادہ آدمی سات دن کے بعد قنفذہ (جو ساحل سمندر پر ایک چھوٹی سی بستی ہے) پہونچ گئے تھے اور وہاں کے حاکم سے اپنا ماجرا بیان کر دیا تھا۔ اس حاکم کے حکم سے سات چھوٹی کشتیاں تمھاری طرف کو روانہ ہوئیں۔ چند شبانہ روز سمندر کے اندر وہ اس جزیرہ کی تلاش میں رہیں۔ جب کوئی سراغ نہ ملا تو پانچ کشتیوں کو ملاحوں نے بسمت قنفذہ واپس پلٹا دیا — مولانا فضل علی اور دیگر ساتھیوں نے ان کو ہر چند واپس ہونے سے منع کیا۔ لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا — ہم دو کشتیوں کو لے کر ہمت کر کے بحر عجم کی طرف سرگرم تلاش ہوئے — اللہ کا شکر ہے کہ ہماری سعی مشکور ہوئی اور گوہر مراد حاصل ہوا —

اب دو چھوٹی کشتیوں میں جم غفیر کا بیٹھنا دشوار تھا۔ مجبوراً ایک کشتی کو تین روز بعد اور دوسری کو چھ روز بعد جس قدر آدمی بیٹھ سکے جا سکے بٹھا کر روانہ کر دیا۔ اور خود اللہ پر بھروسہ کر کے اس شورش کدے میں ہی ٹھہرا رہا — لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

دو اور کشتیوں کا آنا چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر زائد از وصف ہے بنا بریں جہاز ٹوٹنے کے پچیس دن بعد دو اور کشتیاں آتی دکھائی دیں جب ساحل پر پہونچیں تو پھر "نوا ہائے نا آشنا" اور "شناسائے بیگانہ" سے سابقہ پڑا۔ داپا کوئی آدمی نہ تھا جب ان سے تحقیقات کی گئی تو انھوں نے بتایا کہ وہ پانچ کشتیاں جو بھٹک گئی تھیں اور جنھوں نے قنفذہ اختیار کر لی تھی جب وہ قنفذہ پہونچیں تو ان کو پھر واپس ہونا پڑا۔ کیونکہ امیر قنفذہ ان کے آنے سے سخت برہم ہوا اور اس کا غصہ اس وقت تک ٹھنڈا نہ ہوا جب تک وہ کشتیاں واپس نہ دیں اس امیر نے ایک کشتی کا اور اضافہ کیا۔ چند دن تو سب کشتیاں ساتھ ساتھ چلیں پھر

تلاطم امواج اور جوشش باد سے ہم جدا ہو گئے۔ اب ہم تو اتفاق سے ساحل مقصود تک پہونچ گئے۔

ے آوارہ گیست رہبر، در وادیٔ محبت — طوفاں بود معلم، دریائے بیکراں را

دوسری کشتیوں کے معاملے سے ہم لوگ بے خبر ہیں کہ ابھی تک ٹوئیاں مار رہی ہیں یا اپنے وطن کی طرف پھر لوٹ گئیں ــــ

ان دو کشتیوں کے آنے پر ہم نے عزم بالجزم کر لیا کہ اس دفعہ بہر طور جملہ بقیہ افراد کو سوار کر ہی لیں گے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ سامان و اسباب میں سے جو نہ لادا جا سکے گا اس کو چھوڑ دیں گے۔ یہ خیال مصمم ہو کر عزم روانگی ہو گیا۔ ساتھ ہی ساتھ طوفان باد، جوش باراں اور اضطراب موج کا پھر ظہور ہوا ــــ چھوٹی کشتیوں کی کیا مجال کہ اس طوفانی کیفیت میں اپنی حد سے آگے قدم رکھ سکیں۔ اسی وجہ سے دس روز اور توقف کیا جب ابر و باد کا ہنگامہ موقوف ہوا تو ۵ ر ذی قعدہ کو بوقت عصر اس خرابے (جزیرے) کو خیرباد کہہ کر کشتی میں سوار ہو گئے۔ اور لیث کی جانب رُخ کیا ــــ اس ویران جزیرے میں ایک ماہ پانچ روز اقامت ہوئی تھی ــــ چونکہ بحر قلزم اندازے سے زیادہ امواج رکھتا ہے۔ اس لیے ہلاکت کا خوف غالب تھا، لیکن جب حفاظت ایزدی شامل حال ہوتی ہے تو آب و آتش گزند نہیں پہونچا سکتے ــــ ۸ ر ذی قعدہ کو نصف النہار کے وقت ساحل لیث پر پہونچ گئے۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک حمداً کثیرا ــــ

قدرت الٰہی اس سے پہلے کہ آگے کوئی اور بات بیان کروں پینے کے پانی کا حال بیان کرتا ہوں کہ اس قدر کمی کے باوجود اتنے زمانۂ دراز تک اتنے آدمیوں کے لیے کیونکر کافی ہوا۔ اس کو سُن کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نظر آئے گی ــــ سنو ــــ ایک پیالہ صبح کو اور ایک شام کو ساغر مہر و ماہ کی طرح ہر شخص کو ملتا تھا۔ اس کفایت شعاری اور احتیاط کے باوجود یہ امید قطعی نہ تھی کہ پندرہ بیس روز تک بھی پانی موجود رہ سکے گا ــــ ہجوم تشنگان، صاحب تقسیم کے گرد اگرد اس طرح جمع رہتا جیسا کہ "انبوہ بادہ خواران" ساقی کے ارد گرد رہتا ہے ــــ ان دو پیالوں سے جو روزانہ ملتے تھے پیاس کیا بجھتی اور روٹی پکانے کے لیے کیا تدبیر ہوتی؟ ــ لاچار آب شور سے "پخت طعام" کا کام نکالا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھو کہ ایک بادل آیا۔ بارش ہوئی ہم نے جزیرے میں گڑھے کھود لیے اور برتن رکھ دیے تھے اس طرح تھوڑا سا پانی فراہم ہوا اور

دو تین دن سامان خورد و نوش حسبِ دلخواہ ہو گیا۔ اس کے بعد احقر کے دل میں گزرا کہ اگر آبِ سمندر کو کشید کیا جائے تو ممکن ہو پینے کے قابل ہو جائے، چنانچہ ایسا کیا گیا تو واقعی کھاری پانی بہت لذیذ ہو گیا۔

افضالِ الٰہی

طولِ سخن کوتاہ ـــــ اس زمانے میں جبکہ بظاہر سختی کی صورت تھی مگر پنہاں کتنے کچھ عطیہ ہائے گرانمایہ تھے جو عنایت فرمائے گئے، اگر ان سب عطیات کو بیان کروں تو ریا و سُمعہ کی تہمت سے ڈرتا ہوں اور سب کو چھوڑ دوں تو کفرانِ نعمت کی سزا سے ہراساں ہوں میں نے اپنے خداوند کی نعمتیں دیکھی ہیں۔ میں آیۂ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ـــ کو سن کر خاموش کیسے رہ سکتا ہوں۔ لامحالہ بیان کروں گا۔ آئینِ صحابہ کی موافقت میرا شیوہ ہے ـــ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اقتدا میں (تحدیثِ نعمت کے سلسلے میں) زمزمہ سنجی کرتا ہوں ـــ اللہ تعالیٰ مجھے آفتِ ریا سے محفوظ رکھے ـــــ اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلا انعام یہ تھا کہ دل صابر، زبان سپاس گزار اور لب سرگرم ثنا عطا فرمائے، اول سے آخر تک بے صبری، "سراپردۂ ضمیر" کے گرد نہیں پھٹکی۔ بیقراری کو چپ گمنامی میں رہی۔ یہ درحقیقت اُس لطیف جل شانہ کا لطف ہی تھا۔ جب اس کا لطف کارفرما ہوتا ہو تو ذرہ "خورشیدی" اور قطرہ "دریائی" کرتا ہے۔ دوسرا انعام یہ ہے کہ اس وادیٔ بے آب و دانہ (جزیرے) میں حیرت انگیز طریقے پر آب و دانہ عنایت فرمایا، پھر اس مہلک جگہ سے آسان طریقے پر نکال بھی دیا ـــــ تیسرا انعام یہ ہے کہ کسی ایک کو بھی کوئی گزند نہیں پہونچا ـــ جس کسی کو اس قسم کے مصائب سے واسطہ پڑا ہو وہ جانتا ہو کہ ایسے حالات میں یہ بات بہت ہی نادر ہے ـــ اسباب میں سے بھی بہت میں سے تھوڑا اور تھوڑے میں سے ایک گیا (باقی بچ گیا)، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا طاقتِ انسانی سے بالاتر ہے ـــــ

۹ ذی قعدہ ـــــ لیث میں داخل ہوئے، یہ ایک چھوٹا سا قریہ ہے ـــــ شب چہار دہم ذی قعدہ ـــــ لیث سے براہِ صحرا مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و تعظیماً ـــ کا عزم کیا۔ رات کو سوار ہوئے اور صبح کو خفرات میں اُترے خفرات میں ایک کنواں ہے، اس کا پانی عمدہ ہے ـــ دیارِ عرب میں بعد و قربِ مراحل کا اعتبار، وقت سے ہوتا ہے نہ کہ میل و فرسخ سے۔ اور سیر و مسافت کے وقت ہوتا ہے ـــــ

۱۴ ذی قعدہ ــــ قبل از غروب چلے اور ۱۸ کو پیش از شام سحری، سعدیہ پہونچے ــــ اور شرائط احرام ادا کرنے کے بعد نماز مغرب سے پیشتر گرم رفتار ہو گئے۔

۱۷ ذی قعدہ ــــ وادی مقدس بطحیٰ میں نزول ہوا ــــ الحمدللہ ثم الحمدللہ ــــ جمال کعبہ نے تمام غموں کو دل سے دور کر دیا ــــ ہونٹ، تقبیل حجر اسود کے باعث فخر مند ہوئے۔ ہاتھ استلام رکن کے سبب منور ہوئے، پیشانی عتبۂ عالیہ پر گھسنے کی وجہ سے نورانی ہوئی، چادر دش ملتزم کے التزام سے غالیہ فشاں ہو گئی۔ شرب زمزم، بشارت شراب طہور لایا، طواف بیت العتیق نے مژدۂ عتق من النار سنایا ــــ پردہ ہائے کعبہ کو ہاتھوں سے تھام کر گویا دامن امید کو تھام لیا ــــ پاؤں سعی بین الصفا والمروہ کی برکت سے "کوہ آتش" سے اترنے چڑھنے سے محفوظ ہو گئے ــــ

چونکہ میں نے احرام تمتع باندھا تھا اس لیے پہلے دن احرام سے نکل آیا ــــ

اس خیر البلاد (مکۂ معظمہ) میں مجھ مسافر کا قیام مدرسہ شریف محمد میں جو کہ حرم محترم سے ملحق اور باب العمرہ کی جانب ہے ــــ ہوا، شریف محمد اس بلد امین کے اعیان واکابر میں سے ہیں۔

بچھڑے ہوئے ساتھی بھی مل گئے

دعا گو کے مکۂ معظمہ آنے سے چھ دن بعد مولانا فضل علی ان لوگوں کے ساتھ جو جزیرے سے پہلی کشتی میں بیٹھ کر ہم لوگوں سے جدا ہوئے تھے۔ مکۂ معظمہ پہونچے، ان کے سلامتی کے ساتھ آجانے سے ہنگامۂ سرور تازہ ہو گیا، چہرہ نشاط سے جگمگا گیا اور شکر باری تعالیٰ کا ایک اور بڑا موقع از سر نو حاصل ہوا ــــ

ان حضرات کی سرگذشت

اب ان لوگوں کی بقیہ سرگزشت جو ان سے سنی ہے، بیان کی جاتی ہے ــــ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، اوائل شوال میں پہلی کشتی جزیرے سے روانہ ہوئی تھی آب و طعام جو بقدر رسد دوران لوگوں کے حوالے کر دیا گیا تھا وہ تین ہی دن میں ختم ہو گیا ــــ بعدہ طاقتیں طاق اور ناتوانیاں غالب ہو گئیں، ضعف و خستگی نے غلبہ پا لیا ــــ ناگاہ چھٹے دن ایک بڑی کشتی جس کو تغلہ کہتے ہیں ان کے پاس سے ہو کر گزری ــــ اصحاب تغلہ کو ایک چھوٹی سی کشتی پہلی مرتبہ اس محیط بے ساحل میں دیکھ کر حیرت ہوئی اور کشتی نشینوں کی شدید حالی، ان کے تعجب کا سبب بنی۔ اصحاب تغلہ نے معلوم کیا کہ آپ لوگوں کا یہاں کیسے آنا ہوا

جب دیکھا کہ ان بیچاروں میں جواب کی بھی طاقت نہیں، تو ان کی بے طاقتی پر رحم کھا کر اپنی کشتی پر بٹھا لیا اور چھوٹی کشتی کو اس بڑی کشتی کے پیچھے باندھ کر روانہ ہوئے ـــ جو نانِ خشک ان بڑی کشتی والوں کے پاس تھا وہ پیش کر دیا ، شانِ رزاقی دیکھو کہ کہاں اور کس طرح "دمِ آب" اور "لبِ نان" عنایت فرمایا گیا ـــ جو ذات کیڑے کو پتھر کے اندر برگِ سبز دیتی ہو اور "مگسِ پراں" کو "عنکبوتِ بے بال و پر" کے لیے روزی بناتی ہے ۔ اس کی نیرنگیٔ قدرت سے یہ کیا بعید اور محلِ تعجب ہے ـــ

القصہ ـــ ایک دن کے بعد بقایہ ساحلِ قنفذہ پر پہونچا اور ٹھہر گیا ـــ اس سے آگے ان لوگوں کا پیشِ امیر جانا ۔ اور اُس کی مدد سے کشتیوں کے ساتھ لوٹنا ، جزیرے کا سراغ نہ پانا ، دو کشتیوں کا جدا ہونا اور باقی کا قنفذہ واپس جانا ، امیر کا ملاحوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پھر لوٹا دینا اور ایک سفینے کا بڑھا دینا اور دو کشتیوں کا جدا ہونا اور جزیرے میں پہونچنا ، ان باتوں کا بیان تفصیل سے کیا جا چکا ہے ـــ اب رودادِ ناشنودہ کو سنو ـــ

وہ کشتیاں جو قنفذہ سے دوبارہ چل کر بھٹک گئی تھیں ان میں سے دو کشتیوں کو ایک جہاز دور سے آتا دکھائی دیا ۔ اس کے نزدیک پہونچ کر اپنا حال بیان کیا ۔ ناخدا اس "درد آلود" افسانے کو سن کر مہربان ہو گیا اور چند آدمیوں کو اپنے جہاز میں بٹھا کر تین روز ان کی نشاندہی کے مطابق جستجوئے جزیرہ میں چپ و راست دوڑ دھوپ کی ۔ آخر کار مایوس ہو کر اہلِ جہاز نے کشتی نشینوں سے معذرت کی اور اپنا راستہ لیا ـــ اس پریشان حالی میں اس جماعت کے دماغ میں یہ بات آئی کہ جزائرِ بحرِ عرب میں سے چھوٹا بڑا کوئی جزیرہ ایسا نہیں جہاں ہم نہ پہونچے ہوں ، بہت ممکن ہے کہ جزیرۂ مطلوبہ بحرِ عجم میں واقع ہو ۔ اس تمام بیجا خرامی اور بے راہ روی کے بعد یہ ایک [illegible]ی دست ان کے دل میں جاگزیں ہو گیا ـــ

تمامی عمر ضائع کرد فرہاد　　نہیں یک تیشۂ آخر بجا زد

[illegible]کے بعد "قرار دادِ مصلحت" یہ ہوئی کہ سب سے پہلے بخطِ مستقیم ساحلِ بحرِ عجم پر چلیں اور [illegible]ے تجربہ کار ملاحوں کو جو بحرِ عجم سے واقفیت رکھتے ہوں ـــ اپنے ساتھ لے لیں ، پھر جستجو کریں ، [illegible] ہو کر ملکِ حبشہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے اور وہاں کے حاکم سے تمام قصہ بیان [illegible] واقعے نے حاکم کو متاثر کیا ۔ اس نے بہت کچھ دلجوئی کی ، آئینِ میزبانی بجا لایا ، اور

ایک بڑی کشتی کو واقف کار ملاح کی سرکردگی میں ان کے ہمراہ روانہ کردیا۔ ملاح اپنے صحیح اندازے سے ایک دن کے بعد اس جزیرے پر پہونچ گیا، جب اس جزیرے کو ہم لوگوں نے خالی پایا (کیونکہ ہم اس جزیرے سے روانہ ہو چکے تھے) تو اگرچہ وہم نے چند خیالی تراشے بھی لیکن ظن غالب یہی ہوا کہ ایزد جہاں آفریں نے کسی طریقے سے واماندگان کو اس ہلاکت سے نجات دے دی ہو چنانچہ انھوں نے جزم لیث کیا۔ لیث پہونچ کر ہم سب لوگوں کے سلامتی کے ساتھ پہنچنے کی بشارت سنی۔ حمد خدا کرتے ہوئے وہ بھی مکہ معظمہ پہونچ گئے۔ (اور ہم سے ملاقات کی)

ذکر ام القریٰ

کہ معظمہ بڑا شہر ہے۔ رونق شایاں اور آبادی فراواں رکھتا ہے۔ یہاں سب سے اچھا اور سب سے وسیع بازار صفا و مروہ کا بازار ہے۔ ہر شہر و دیار کا کپڑا اور سامان یہاں پایا جاتا ہے۔ سبحان اللہ باوجودیکہ کوئی چیز یہاں پیدا نہیں ہوتی مگر کوئی چیز ایسی نہیں کہ یہاں ناپید ہو۔ اور یہ بات دعائے سیدنا ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں دعائے ابراہیمی کے یہ الفاظ ہیں۔ وارزق اَھلَہٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ —— ہند و سندھ، عجم، بخارا، کابل، کشمیر، روم و حبش، غرض ہر ملک کے باشندے یہاں موجود ہیں۔ خصوصاً اہل جاوہ اور ترک بہت ہیں۔ ارباب مصر بھی کثرت سے ہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا ذکر ہے جو علی السبیل الدوام یہاں سکونت رکھتے ہیں۔ — لیکن موسم حج میں جمع ہونے والوں کی کثرت کا احاطہ سوائے حق تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا اور ان کے اصناف و اقسام بھی شمار میں نہیں آسکتیں، ہر ایک کی رسم جدا، طرز جدا، لباس جدا، زبان جدا —

مسالک

اس اشرف البلاد (مکہ) کے ساکنین زیادہ تر احناف ہیں۔ پھر شوافع، پھر مالکیہ، اور حنبلیوں کی تعداد کلہم تین ہے —

ائمہ و خطبائے مسجد الحرام

اُن خطباء اور ائمہ کی تعداد جو مسجد الحرام میں مقرر ہیں —— پچاس سے متجاوز ہے —— تین حنفیہ میں سے، ایک حنابلہ میں سے اور باقی شافعیہ و مالکیہ میں سے —— قرأت و تجوید ائمہ بڑی خوبی و لطافت والی ہے، فجر کی نماز کے علاوہ باقی تمام اوقات میں، حنفی امام سب سے پہلے جماعت پڑھاتا ہے۔ اس کے بعد شافعی امام، اس کے بعد مالکی —— حنبلی امام، صبح کی نماز کے علاوہ کوئی نماز جداگانہ نہیں پڑھاتا —— صبح کے وقت اول شافعی امام نماز پڑھاتا ہے

لیے کہ شافعیہ کے نزدیک غلس (اندھیرے) میں نماز ادا کرنا مستحب ہے۔ اس کے بعد ا، اس کے بعد حنبلی، اور سب سے آخر میں حنفی ــــ اس لیے کہ حنفیہ کے یہاں اسفار (روشنی) میں استحباب ہے ــــ

واجِ علوم تفسیر حدیث اور فقہ کا جتنا علم ضروری ہے۔ یہاں رائج ہے۔ فلسفہ و ریاضی کا رواج نہیں ہے ــ ولا حاجۃ الیہ ــ فنِ ادب طرف باوجودیکہ التفاتِ طبائع کمتر ہے، لیکن ایسے ایسے ادیب یہاں کے ایوانِ فضل و ال میں جلوہ گر ہیں جو حریری پر اعتراض اور جریر پر نکتہ چینی کر سکیں ــــ

شیخ عبداللہ سراج رح تمام علماء مکہ میں اشہر، اعلم، اسبق اور اقدم شیخ عبداللہ سراج ہیں ــــ بلاتکلف ان کو "سراج انجمن علم و دانش" کہا جا سکتا ہے ــــ فنونِ نقلیہ میں اتنا "سرمایۂ آگہی" رکھتے ہیں کہ آج ان کی "ٹکر" کا کوئی نہیں ــــ فنونِ دانشمندی میں بھی ان کی بڑی اچھی استعداد ہے ــــ ان کی جودت اور ذکاوت مسلّم ہے۔ ان کی صحبت مؤثر اور ان کی تقریر دلکشا ہے ــــ ان فضائل کے ساتھ ساتھ دلکش اخلاق بھی ان کو منجانب اللہ عطا فرمائے گئے ہیں ــــ اُن کی طبیعت میں شگفتگی ہے ــــ مخلوق کے کار فرولیتہ" کی کشائش بھی اُن کا نصب العین ہے ــــ حکام میں ان کی بڑی عزت ہے اور یہ بات آسائشِ مردم کا سبب بن گئی ہے۔ ان کا طریقہ حنفی ہے۔ تعطیلات کے علاوہ ہر صبح و شام درس دیتے ہیں۔ صبح کو دار الندوہ کے پیچھے کہ آج کل مصلائے حنفی اس کا نام ہے۔ درسِ حدیث دیتے ہیں، اور شام کو مصلائے حنبلی کے پہلو میں بیت الحرام کے بالمقابل، بین الرکن والمقام، درسِ تفسیر دیتے ہیں۔ احقر کو اُن سے ملاقات کا بہت موقع ملا ــــ بزمِ درس میں بھی اور اس کے علاوہ بھی ــــ کبھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، کبھی میری قیام گاہ پر تکلیف فرماتے تھے، مختصر یہ کہ جب تک میں مکۂ معظمہ میں ... فراواں ان سے حاصل کیے ــــ تیمناً اوائل صحاح بھی ان ... سنے ــــ

ایک واقعہ

ایک دن شیخ موصوف دیگر بزرگوں کے ساتھ فقیر کی قیام گاہ پر رونق افروز محفل تھے، بڑی اچھی مجلس تھی، ہر باب میں گفتگو ہو رہی تھی کہ درمیان میں ایک ہندوستانی نے یہ سوال کر لیا کہ کوئی شخص نذر کرے اور ثواب نذر کسی بزرگ کی روح کو بخشے اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ پہلی مرتبہ تو شیخ نے فرمایا "ما ادری" (میں نہیں جانتا) پھر فرمایا ــــ ھذا تلبیسٌ والتلبیس من ابلیس ــــ (نذر اس طرح کرنا تلبیس ہے، اور تلبیس ابلیس کا کام ہے) ــــ سبحان اللہ باوجود کمالِ علم سوال کے جواب میں پہلے "ما ادری" فرمایا ــــ ہم اور تم تھوڑا سا علم رکھتے ہیں اور پھر بھی ما ادری کہنے کی جرأت نہیں کرتے ــــ "پاکیزہ گوہرانِ عرب" تصنع اور تکلف سے کس قدر دور اور جام وما انا من المتکلفین سے کتنے سیراب ہیں۔ ایک مرتبہ بزرگوں کی ارواح سے استمداد و استغاثت کے بارے میں کسی نے سوال کیا تو یہ مختصر جواب دیا ــــ ما ورد فی السنۃ (سنت سے ثابت نہیں) ــــ

دیگر علماء مکہ

شافعیہ میں شیخ عثمان دمیاطی امام فن ہیں، لیکن اس زمانے میں ان کا درس موقوف ہے ــــ

شیخ احمد بھی فضلائے نامدار میں ہیں، ان کا اصلی وطن دمیاط ہے جو توابع مصر میں سے ہے۔ شیخ احمد اب مجاور بلد الحرام ہیں۔ صبح و شام درس دیتے ہیں۔ صبح کو فقہ شافعی پڑھاتے ہیں اور مغرب و عشاء کے درمیان تفسیر جلالین کا درس دیتے ہیں۔ صرف و نحو میں شانِ بلند اور تفسیر و فقہ میں دستگاہِ کامل رکھتے ہیں۔ جس قدر فنون ان کے پاس ہیں نہایت سرگرمی سے ان کو دوسروں تک پہونچاتے ہیں۔

فضلائے مالکیہ میں سب سے افضل، شیخ محمد المرزوقی ہیں۔ یہ نابینا ہیں۔ ان کے بھائی شیخ احمد، مفتی مذہب مالکی ہیں اور فقہ کے بڑے ماہر ہیں۔ دونوں بھائی درس حدیث و فقہ صبح و شام دیتے ہیں۔

مفتی حنفیہ، سید عبداللہ میرغنی اہل ورع و تقویٰ میں سے ہیں، اُن کو جزئیات

خوب مستحضر ہیں۔ ان کے بھائی سید عثمان اُن سے زیادہ متقی ہیں، وہ ایک باصفا ہیں، تصوف سے بہرہ مند ہیں، راقم نے ان دونوں بزرگوں سے بھی فیض حاصل کیا۔

مفتیٔ شوافع، شیخ محمد عمر الرئیس ہیں، ان سے ملاقات نہ ہو سکی ——— حنابلہ کے ایک ہی فقیہ و امام ہیں جن کا نام شیخ محمد ہے ——— معمر بزرگ ہیں ——— اشرف البلاد میں کثرت سے اہلِ علم و دانش ہیں ——— بہت سوں سے ملاقات نہ ہو سکا، اور کچھ سے واقف ہوا ——— اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں سے اکثر کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف ان حضرات کے نام لیے ہیں جو مشہور و معروف ہیں ———

صوفیا طائفۂ صوفیا میں سب سے بڑے سید محمد سنوسی مالکی ہیں، انھوں نے خرقۂ خلافت سید احمد بن ادریس سے حاصل کیا ہے، یہ سالک گرم رو اور عارف بدسیر ہیں ——— مقامات جلیلہ اور حالات سنیّہ رکھتے ہیں۔ ان کی صحبت مؤثر ہے۔ اس سال قافلۂ شام کے ساتھ سوئے قدس گئے ہیں ——— ان کے علاوہ شیخ محمد جان جو قطبِ وقت شاہ غلام علی قدس سرہٗ کے خلفاء میں سے ہیں، بڑے مشغول اور صاحبِ صدق و صفا بزرگ ہیں۔ انھوں نے جو مہربانیاں اس حقیر پر فرمائیں کوئی کسی پر کم کرتا ہے ——— ایک بزرگ سید محمد ہیں جو اہلِ بخارا میں سے ہیں، ان کا طریقہ نقشبندیہ ہے۔ قدیم دنیا سے روگرداں ہیں۔ ایک پارۂ نان پر قناعت کرکے "معتکفِ حریم حرمت" ہیں اس بزرگ نے بھی احقر پر وہ کرم فرمایا کہ میں اُن کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا ——— گرمیِ التفات یہ تھی کہ اگر میں اُن کی خدمت میں نہ جاؤں تو وہ خود تشریف لے آتے تھے ؎

جذبۂ عشق بجذبیت میان من و یار
کہ اگر من نروم او بطلب می آید

جناب حبیب اللہ آفندی، خلیفۂ مولانا خالد کردیؒ (جو خلفائے حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ میں سے تھے)، بھی مبارک بزرگ ہیں۔

حکومت امورِ حجاز کا نظم و نسق آج کل احمد پاشا کے ہاتھ میں ہے، یہ محمد علی شاہِ مصر کے بھانجے ہیں ــــ اس سال فرمانروائے روم سلطان محمود خاں کا انتقال ہوگیا، اُن کے صاحبزادے سلطان عبدالمجید خاں تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوگئے ہیں۔

مکہ میں شاہوں کی حاضری علی شاہ فرزند فتح علی شاہ، بادشاہِ ایران نے چند ماہ ایران کی مسندِ شاہی پر بیٹھ کر حکومت کی، بعدہٗ اس کا بھتیجا محمد شاہ ابنِ عباس مرزا ابن فتح علی شاہ (جو آج کل سلطانِ ایران ہے) اپنے چچا سے نبرد آزما ہوا، بالآخر بھتیجا اورنگِ سلطنت پر قابض ہوگیا علی شاہ شکست کھا کر قسطنطنیہ چلا گیا، اور "حلقۂ درِ سلطان"، کو محکم پکڑا ــــ اس سال سلطانِ روم سے اجازت لیکر وہ حج کے لئے آیا ہے، نیز بادشاہِ تکروری[۱] (حبشہ کی ایک قوم ہے) بھی موسمِ حج میں آکر "بہرہ اندوزِ سعادتِ دوجہانی"، ہوا۔

دیگر کوائف حسبِ عادتِ قدیم، شامی، مصری اور مغربی قافلے یہاں پہنچے، سب سے بڑا قافلہ قافلۂ شام ہے کہ دس ہزار اونٹوں اور تین ہزار گھوڑوں اور خچروں پر مشتمل ہے۔

یہاں کنیزوں کی بیع و شریٰ بکثرت ہوتی ہے ــــ چیزوں کا نیلام یہاں ہر روز ہوتا ہے ــــ یہاں سردی کم ہوتی ہے، زمانًا بھی اور کیفًا بھی ــــ لیکن وفورِ ہنگامۂ گرما جیسا سنا تھا ویسا نہ تھا، (بظاہر) گرمیٔ حجاز، ہندوستان کی گرمی سے زیادہ نہیں ہے، لیکن گرمی کی مدت زیادہ ہوتی ہے۔

احرامِ حج ۸ ذی الحجہ کو بروز ترویہ، احرامِ حج باندھا، اور منا میں گیا، اور وہاں رات گذاری ــــ سنت یہ ہے کہ پانچ نمازیں جن میں سے پہلی ظہرِ یومِ ترویہ ہو اور آخری فجرِ یومِ عرفہ ہو منا میں پڑھی جائیں، اور سورج نکلنے پر عزمِ عرفات کریں، لیکن اس زمانے میں یہ سنت، مہجور ہوگئی ہے ــــ آٹھویں تاریخ منا میں نہ گذار کر براہِ راست عرفات چلے جاتے ہیں ــــ عذر ہائے بسیار اس بارے میں کئے جاتے ہیں اور سب نامسموع ہیں ــــ خدا کا شکر ہے کہ احقر نے رات منا میں گذاری، اور ۹ ذی الحجہ کو بعد انتشارِ شعاع، عرفات کا قصد کیا ــــ ہر چند یوم الترویہ میں مجھے نمازِ ظہر منا میں میسر نہیں آئی لیکن بحکم ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ جو کچھ میسر ہوا غنیمت ہے ــــ بالجملہ متصل مسجد نمرہ اترے ــــ بعد جمع بین الصلوتین ایک گھڑی دن باقی رہا تھا کہ وقوفِ عرفات کیا ــــ اس مبارک منزل پر جوشِ سحابِ کرم، دیدنی ہے شنیدنی نہیں ــــ جو یہاں آکر ٹھہرا ہو وہی اس رحمت کو

---

[۱] غالباً "تکروتی"!۔

انتا ہے ــــــ اے اللہ! میں دوسری مرتبہ بھی اس نعمت کا آرزو مند ہوں ــــــ جب سورج غروب ہوا، عرفات سے مزدلفہ کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں رات گذاری، پھر صبح کے وقت مشعر الحرام سے روانگی ہوئی، منا پہنچے ــــــ رمی جمرۃ العقبیٰ، ذبح اور حلق کے بعد مکہ معظمہ گئے، طواف الزیارۃ لیا، اسی دن منا میں لوٹ آئے ــــــ ۱۱ ذی الحجہ کو وہاں رہ کر، ۱۲ کو بعد رمی جمرۃ الدنیا نماز عصر، وادی محصب میں ادا کر کے مکہ مشرفہ میں شرف اندوز سعادت ہوئے۔ الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات وصلی اللہ علی محمد النبی الامی وعلی آلہ وصحبہ افضل الصلوات۔

مخفی نہ رہے کہ اگرچہ بمقتضائے نصّ قرآنی فمن تعجّل فی یومین الآیہ ــــــ جو شخص ۱۲ ذی الحجہ کو منا سے چلا آئے وہ گنہگار نہ ہوگا، اور کوئی جنایت بھی اس پر نہیں، اور آج کل سب کی عادت بھی یہی ہوگئی ہے ــــــ لیکن ــــــ سنّتِ سیّد الانام علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی اتباع میں احسن و اجمل یہ ہے کہ ۱۳ ذی الحجہ کو منا سے نکلے ــــــ چنانچہ ایک گروہ کو اس روش پر عامل بھی پایا ــــــ البتہ راقم کو یہ مجبوری پیش آگئی کہ والدہ ماجدہ ــــــ اللہ ان کو بخشے ــــــ اندازے سے زیادہ خستہ و ضعیف ہوگئیں ــــــ مرحومہ نے اور دیگر ضعفاء نے طواف الافاضہ (طواف الزیارۃ) ابھی نہیں کیا تھا، اس بنا پر ۱۲ کو مکہ معظمہ پہنچنا ضروری ہوا، کیونکہ آئینِ حنفی میں اگر ۱۲ گذر جائے، درآنحالیکہ طواف الزیارۃ نہ کیا ہو، تو گنہگار ہوتا ہے۔

وادیٔ محصب میں، سنّت یہ ہے کہ چار نمازیں، ظہر سے عشاء تک ادا کی جائیں ــــــ مگر جس مجبوری کا ابھی ابھی ذکر ہوا، اس کی بنا پر نماز مغرب سے پہلے مکہ معظمہ پہنچنا ضروری تھا ــــــ اس وجہ سے اس سنت کی ادائیگی پورے طریقے پر نہ ہو سکی، البتہ نمازِ عصر جیسا کہ مذکور ہوا اس وادی میں میسر آگئی، امید کہ اس کی رحمت کا کمال ہمارے عمل کے نقصان کو دور کر دے گا ــــــ اور محض اپنے لطف و کرم سے وہ ہمارے اعمال کو قبول فرمالے گا۔ ربنا تقبّل منّا انک انت السّمیع العلیم۔

اسی بلدۂ طیبہ میں میری والدہ اور میری نانی چار دن کے فاصلے سے انتقال کر گئیں، اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئیں ــــــ اللّٰھمّ اغفر لھما وبرّد مضجعھما ــــــ میری والدہ کی خوش نصیبی دیکھو کہ ان کو مزارِ ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلو میں جگہ ملی ــــــ واللہ

یختص برحمتہٖ من یشاء ۔

مدینۂ منوّرہ کو روانگی اور وہاں کا قیام

مدینۂ منورہ کا راستہ پانچ سال سے، اہلِ بادیہ کی رہزنی کے باعث بے امن تھا، قافلے نہیں چلتے تھے، اور چلتے تھے تو سلامت کم رہتے تھے ـــــ گذشتہ سال ان بدوؤں کے ہاتھوں اہلِ جاوہ پر جو گذری سب کو معلوم ہے ـــــ اسی بناء پر حاجیوں کا دل غمگین تھا، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خواجۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار کی حاضری نہ ہوسکے۔ ناگاہ قدرتِ کاملہ کا ظہور اس انداز سے ہوا کہ یا تو کارواں کے ساتھ نہیں جاسکتے تھے، یا اب بے کارواں جاسکتے ہیں ـــــ اس کی شرح یہ ہے کہ شریف محمد بن عون کو بادشاہِ مصر نے تہدیداً چند سال مصر میں نظر بند رکھا، اب اس شرط پر انتظامِ مدینہ اُن کے سپرد کیا ہے کہ راستے کا انتظام اس طرح کریں کہ ایک بڑھیا بھی رہزن سے خائف نہ ہو ـــــ چنانچہ وہ ان مبارک ایام میں مصر سے آکر منازلِ طریق مدینہ میں آئے، اعراب کو جمع کرکے اُن سے معاہدہ کیا، اور اُن کو قتل و غارت سے باز رکھا۔

۲۲ محرم الحرام ۱۲۵۶ھ کی شام کو مکہ میں دو ماہ پانچ روز قیام کرنے کے بعد مدینۃ الرسول ؐ کی زیارت کے لئے چل پڑے ـــــ طلوعِ سحر سے پہلے وادیِ فاطمہ میں اُترے ـــــ مکہ اور وادیِ فاطمہ کے درمیان مقام سَرِف میں اُمّ المومنین حضرت میمونہ ؓ کی تربت ہے۔ نگارندگانِ سیرتِ محمدی ؐ نے لکھا ہے کہ نکاح و زفاف و وفاتِ اُم المومنین میمونہ ؓ کا سَرِف میں اتفاق ہوا ہے ـــــ وادیِ فاطمہ میں کھجور کے باغات ہیں اور آبِ نہر بھی ـــــ ۲۳ محرم کو قبیل عصر یہاں سے چلے، اور اگلے دن نمازِ صبح سے پہلے ایک منزل میں جس کا نام یاد نہیں، اُترنا ہوا۔

۲۴ محرم کو قبل العصر وہاں سے چلے اور صبح کو خلیص میں سکونت ہوئی ـــــ یہاں بدوؤں کے گھر ہیں ـــــ نہر و باغات بھی ہیں ـــــ ایک مسجد ماٰثر سیّد الانام صلی اللہ علیہ وسلم میں سے یہاں پر ہے، جو اب منہدم ہوگئی ہے لیکن اُس کے آثار باقی ہیں۔

۲۵ محرم کو خلیص سے چل کر دوسرے دن صبح صادق کے وقت بیر قضیمہ پر خیمہ زن ہوئے۔

۲۶ محرم کو بعد زوال چلے، اور چاشت کے وقت رابغ میں اُترے ـــــ رابغ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، اس جگہ کے رہنے والے سارق ہیں ـــــ اس جگہ ایسی بادِ سموم چلی کہ بعض ساتھیوں کا "نخلِ حیات" جلا دیا ـــــ اسی بناء پر ۲۷ محرم کو گور و کفن کا انتظام کرنے کے لئے ٹھہرنا لازم ہوا

حالت تھی کہ ایک کی نمازِ جنازہ پڑھ رہے ہیں، ایک کا کفن سی رہے ہیں، ایک کو غسل دے رہے ہیں، ایک عالم نزع میں ہے، اور ایک پر تاثیرِ بادِ سموم کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں ــــــ مُردوں کو آغوشِ گور میں سلا کر، اور بیماروں کو اُٹھا کر ۲۸ محرم کو ــــــ دن کا کافی حصہ باقی تھا ــــــ کہ کوچ کیا ــــــ اور صبح کی نماز کے وقت بیر مستورہ میں اُترے ــــــ سید محمد بخاریؒ نے ــــــ جن کا ذکر عرفاتِ کرم میں گذر چکا ہے ــــــ ازراہِ شفقت میرے ساتھ مدینۂ منورہ کا قصد کیا تھا ــــــ جس وقت رابغ سے ہم روانہ ہوئے، بادِ سموم نے اُن پر بھی اثر کیا، اور بیر مستورہ تک آتے آتے اُن کی پاک روح، فردوسِ بریں میں چلی گئی، اور بھی چند ساتھی جنت کو سدھار گئے ــــــ انا للہ وانا الیہ راجعون ــــــ

چاہ مستورہ کا پانی تلخ ہے لیکن دو تین کوس کے فاصلے پر پانی میٹھا ہے، اونٹ بان وہاں سے لے آتے ہیں۔

۲۹ محرم کو عصر سے پہلے روانہ ہوئے، بیر شیخ پر اُترنا تھا، لیکن چونکہ وہاں پانی نایاب ہے، اس لئے وہاں سے تجاوز کر کے ایک کنوئیں کے قریب جو راستے سے ایک طرف کو واقع ہے ــــــ سکونت کی ــــــ یہاں بھی ایک دو آدمی، جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

غرّہ صفر المظفر کو ــــــ تھوڑا سا دن باقی تھا ــــــ کہ سوار ہوئے، اور بعد شروقِ شمس" وادیٔ صفرا میں وارد ہوئے ــــــ یہ ایک بڑا قصبہ ہے ــــــ چشمۂ جاری اور باغات رکھتا ہے یہ تمام منازل سے زیادہ شاداب و بارونق ہے۔

۲ صفر ــــــ بعد "صفرا شمس" سوار ہوئے ــــــ خیف سے گذر کر اشراق کے وقت حدیدہ میں ٹھہرے، یہاں دامنِ کوہ سے پانی لاتے ہیں۔

۳ صفر ــــــ بین الظہر والعصر ــــــ کوچ کیا، منزل وادیٔ مجنوں میں کرنی تھی، لیکن یہاں پانی نہیں، بنا بریں اونٹ بانوں نے یہاں سے دو تین کوس پر ٹھہرنے کا مشورہ دیا، جہاں پانی دستیاب ہوا۔

۴ صفر ــــــ عصر سے پہلے چلے، اور بعد اشراق ذوالحلیفہ میں ــــــ کہ اب بیر علی کہلاتا ہے ــــــ گزر ہوا ــــــ یہاں سے مدینہ منورہ تین کوس کا فاصلہ رکھتا ہے، یہ وہ مبارک مقام ہے، جہاں حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احرامِ حج باندھا ہے ــــــ جب ذوالحلیفہ سے قافلہ گذرا ــــــ میں نے دیکھا کہ ایک عاشقِ شوریدہ سر رقصاں جا رہا ہے، اور یہ شعر پڑھ رہا ہے:

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست ؎ آفریں باد بریں ہمت مردانۂ ما

اُس نے یہ شعر کتنے صحیح موقع پر پڑھا۔ اس کے بیان کرنے کی چنداں حاجت نہیں ہے ——— دن کا چھٹا حصّہ گذر گیا تھا کہ مدینۂ طیبہ میں بہرہ اندوز سعادت کونین ہوئے ——— آداب ضروریہ بجا لانے، اور سلطانِ ہر دو سرا کے دربار سے مشرف ہونے کے بعد ہم نے جو کچھ کیا وہ کیا۔

شہیدی مرحوم منشی کرامت علی شہیدی جو مشہور شاعر ہیں اور جن کا ذکر میں نے گلشن بیخار میں بھی کیا ہے راستے میں "وبا زدہ" ہوگئے تھے ——— مدینے میں وفات پائی، اور بقیعِ پاک میں مدفون ہوئے۔ ؎

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

ذکر مدینۂ طیبہ وہ تجلیات جو اس نور کدے میں پرتو فگن ہیں، اُن کا ادراک اہلِ معنیٰ کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اہلِ ظاہر بھی اس فیضِ عام کو محسوس کرتے ہیں ——— انوار، بارانِ بہار کی طرح اس ارضِ مقدس پر ہر لحظہ برستے ہیں ——— جب نظر، خواجۂ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبۂ منورہ پر پڑتی ہے، تو کیا بتاؤں کہ آنکھ کس قدر کیف یاب ہوتی ہے، اور دل کتنا نشاط حاصل کرتا ہے۔ ؎

جانم فدائے دیدہ کہ روئے تو دیدہ است
قربانِ پا شوم کہ بکوئیت رسیدہ است

جو کیفیات اس قدسی حریم میں ظاہر ہوتی ہیں، وہ گفتار و تحریر میں نہیں آسکتیں ——— اس نعیم گاہ میں جب تک نہ پہونچو گے اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ع

ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نہ چشی

جو اس بقعۂ مبارکہ میں آگیا، واللہ کہ موت سے پہلے جنّت میں اُس کا گذر ہوگیا ——— شاید کوئی ناشناس اس موقع پر مجھ سے اُلجھے اور کہے کہ عبارت کو محلِ اغراق و مبالغہ میں، مو کد بقسم کیوں کیا جا رہا ہے، اور

---

[1] شہیدی مرحوم نے اپنے ایک مشہور نعتیہ شعر میں کہا تھا:۔ ؎

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کی جا بیٹھے ٭ قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

بالآخر یہ تمنا پوری ہوئی۔

ے آپ کو خواہ مخواہ حانث کیوں بنایا جا رہا ہے، میں اس سے کہوں گا داسے بر تولے بے خبر حدیث وفقہ —
اغراق ومبالغہ نہیں ہے سچی بات ہے — تھوڑی سی تکلیف برداشت کر کے اہلِ علم سے مابین قبری و
نبری روضۃ من ریاض الجنۃ — کے معنی معلوم کر! اور وہ روایت بھی سن جس میں ایسی قسم
مانے پر حانث ہونے نہ ہونے کی بحث ہے۔

انعامِ خداوندی اس بندۂ کمینہ پر اتنا ہے کہ عمرِ نوح عطا کریں اور ہر سرِ مو کو طاقتِ گفتار بخشیں پھر
تمام عمر سپاسِ نعمت میں بسر ہو جائے تب بھی شاید ہی الطافِ خفیہ میں سے ایک لطفِ خفی کا شکریہ
بمشکل ادا ہو سکے — اور یہ نعمت جو اب عنایت فرمائی گئی (حاضری مدینہ) یہ تمام
انعامات کا راس المال اور سرِ دفتر ہے — الحمد للہ ثم الحمد للہ۔

اخلاق اہلِ مدینہ

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کی تاثیر سے اس خیر البلاد (مدینۂ منورہ) کے اکابر واصاغر، تواضع، اور "اکرامِ ضیف" کی صفات سے متصف ہیں۔

علماء مدینہ

اس بلدۂ طیبہ کے "سرخیلِ اہلِ علم" شیخ محمد عابد سندھی ہیں، ان کا مولد سندھ ہے اور پرورش یمن میں پائی ہے — چند سال سے حرمِ مدینہ کے مجاور ہو گئے ہیں، ان کی عمر ستر اور راسی کے درمیان ہے، یہ پاک دین، مبارک نفس، دیجو، برگزیدہ خو، سنجیدہ گو بزرگ ہیں۔ ان کے وجود کو "مہر ووفا" کے "آب وگل" سے خمیر کیا گیا ہے۔

مسجدِ نبوی میں درس دیتے ہیں — عصر و مغرب کے درمیان تشریحِ مطالب "درِ مختار" میں دُرفشانی فرماتے ہیں، اور مغرب وعشاء کے درمیان تفسیرِ بیضاوی کے معانی بیان کرتے ہیں، اعلیٰ درجہ کے محدث ہیں "وسعتِ روایت" کے لحاظ سے بھی، اور "جرح وتعدیلِ رواۃ" کی حیثیت سے بھی۔

ان کے پاس جو کتب خانہ ہے، آنکھ نے کم دیکھی ہوں گی اور کان نے کم سنی ہوں گی —
ان کی بہت سی مفید تصنیفات ہیں — "درِ مختار" پر حاشیہ لکھا ہے جو دس بڑی جلدوں میں ہے —
تصنیف ومطالعہ نے ان کے دل کا احاطہ کر لیا ہے — ہر وقت تصنیف ومطالعہ
میں رہتے ہیں — بخلاف شیخ عبداللہ سراج کے، مگر ان کو تصنیف کا شوق نہیں ہے
[illegible] ہیں۔

شیخ عبداللہ سراجؒ کا ایک قول

شیخ عبداللہ سراجؒ فرماتے تھے کہ بزرگوں نے ہم کو تکلیف تصنیف سے بے نیاز کر دیا ہو عمر کا تدریس میں گزرنا، تصنیف و تالیف میں بسر ہونے سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں تدریس کا نفع غالب تر ہو ـــــ ہزاروں کتب موجود ہیں، لیکن "درست خواں" کم ہیں لہذا درست خواں طیار کرنے کی کوشش، تصنیف جدید سے بہتر ہے۔

مصرع ـــــ راہیں جدا جدا ہیں طریقے جدا جدا

شیخ محمد عابد سندھیؒ احقر کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے اور اندازے سے زیادہ التفات فرمایا۔ مراتب جہاں نوازی کو "ذروۂ اعلیٰ" پر پہونچا دیا ـــ تبرکاً "اطراف اکثر کتب حدیث" اُن کو سنا کر اجازت روایت حاصل کی۔

ایک مصری نابینا عالم ہیں جن کو اکثر علوم خوب مستحضر ہیں ان سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا، نہ ان کی مجلس کا رنگ دیکھا ـــ ایک دریچہ میں ہیں جو غالباً مصر کے ہیں وہ عصر و مغرب کے درمیان محفل تدریس گرم رکھتے ہیں۔ خوبان روزگار میں سے ایک سید گل محمد رامپوری ہیں اُن جیسے دنیا سے کنارہ کش لوگ کم ہیں فقیر ان سے نہ مل سکا۔ ایک بزرگ مولوی عبداللہ ہیں جو ہندوستانی ہیں اور امیر زادوں میں سے ہیں، ترک جاہ کر کے در رسولؐ کو محکم پکڑ لیا ہو۔ فطوبیٰ لہٗ ثم طوبیٰ لہٗ ـــ لوگوں کے بہت سے کار ہائے بستہ اُن کے ذریعے جاری ہوتے ہیں، تمام مکارم کے ساتھ ساتھ ان کی نغز گوئی اور شیریں سخنی بھی قابل ذکر ہو جتنا ان سے ملو گے سیر نہ ہوگے بلکہ اور زیادہ مشتاق ہو جاؤ گے۔ فقیر کے ساتھ ان کی وہ وہ مہربانیاں ہوئیں کہ حد بیان سے باہر ہیں ـــ

ایک بزرگ شیخ عبداللہ بن عمر ہیں جو سادات حضر موت سے ہیں، میں نے بمبئی میں ان کا ذکر خیر سنا تھا اور ملاقات کا اشتیاق تھا۔ مدینہ منورہ آکر ان کا خیال نہ رہا، ایک دفعہ ان کو دیکھا بھی لیکن اُن کا نام نہ معلوم کر سکا۔ مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت ان سے سرسری تعارف ہوا۔ میں نے اُن جیسا پابند اوقات کم دیکھا ہو۔

مسجد نبوی کے خطباء و ائمہ

مسجد نبوی میں جماعت حنبلی و مالکی منعقد نہیں ہوتی ہو۔ بس دو جماعتیں ہوتی ہیں حنفی مسلک والے سوائے نماز صبح کے باقی سب نمازوں میں سبقت کرتے ہیں۔ یہاں کے خطباء و ائمہ کا شمار اسّی تک پہونچتا ہو ـــ میں نے خطبائے مدینہ جیسی حسن خطابت کہیں اور نہیں دیکھی۔ اکثر ائمہ زمرۂ حنفیہ میں سے ہیں، چند زمرۂ شافعیہ میں سے اور دو تین طائفہ مالکیہ کے ہیں، گروہ حنابلہ میں سے معلوم نہیں کہ کوئی ہو بھی یا نہیں ـــ

مدینے میں ترک بڑی تعداد میں سکونت پذیر ہیں۔ "آئین استنبول" اور "قانون قسطنطنیہ" کم سے زیادہ یہاں رائج ہے۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ

ابھی جگہ گرم نہ ہوئی تھی کہ بدخاستگی کا زمانہ آ گیا، ایک ماہ نو دن کے بعد بادِ فراق چل پڑی۔ بزمِ جمعیتِ دل پریشان ہو گئی۔ آنکھوں کو آنکھوں سے اور آنکھوں کو آستین سے تعلق پیدا ہوا۔ فرمانِ قضا و قدر ٹلتا نہیں ہے۔ مجبوراً اپنے پیکرِ خاکی کو منتقل کر لیا اور دل اسی جگہ چھوڑ دیا۔ ۱۴ ربیع الاول کو مکہ معظمہ کی طرف چلے ؎

زہے سعادتِ آں بندہ کہ کرد نزول　　گہے بہ بیتِ خدا و گہے بہ بیتِ رسول ؐ

مدینہ منورہ سے دو منزلیں طے کر کے زیارتِ شہداء کی غرض سے بدر کا قصد کیا، اس امید میں کہ شایدان "سعداء" کی برکت سے مژدۂ "قد غفرت لکم" سے کچھ حصہ مل جائے اور یہ کچھ بعید بھی نہیں، آمرزش کے لیے تھوڑا سا بہانہ بہت ہے۔ بدر میں رات کے آخری لمحات میں آئے۔ صبح کو خاکِ شہیداں پر پہنچے۔ "دلِ خونیں" اور "جگرِ سوزاں" کو "بطورِ شمع و گل" پیش کیا ؎

شمع آوردہ ام از صدق بخاکِ شہداء　　تا دل و دیدۂ خوں نابہ فشاں نم دادند

یہاں سے دو منزلیں طے کر کے رابغ آئے اور احرامِ عمرہ باندھا۔ بعدہٗ منزل بمنزل چل کر ۲۶ ربیع الاول کی آدھی رات گزری تھی کہ مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ رات ہی میں طواف و سعی کو انجام دیا۔

مکہ سے طائف

اہلِ مکہ، شباب گرما کے زمانے میں سوئے طائف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ گرمی کا زمانہ ہے قافلے ہیں راقم کو بھی "گلگشتِ بساطینِ طائف" کا اشتیاق ہوا۔ معلوم ہوا کہ طائف کے دو راستے ہیں ایک جبل کرہ کے راستے میں ایک دن لگتا ہے لیکن پہاڑ کی چڑھائی اور اس سے اترنا بہت تکلیف دہ ہے اس لئے دوسرے راستے سے جاتا ہے البتہ اس راستے میں دو دن لگتے ہیں اس دوسرے راستے کے بھی تین شعبے ہیں۔ (۱) براہِ زیمہ۔ اس میں سایہ دار اشجار نہیں ہیں۔ (۲) براہِ سیل۔ یہ سرسبزی و شادابی کے لحاظ سے بہترین راستہ ہے۔ (۳) بطریق جعرانہ یا اگرچہ اور راستوں سے دراز تر ہے لیکن صراط مستقیم یہی ہے اس لئے کہ خواجۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جگہ سے احرام باندھا ہے۔ اسی بنا پر جی چاہتا تھا کہ واپسی میں جعرانہ سے آؤں۔ لیکن بتقاضائے فرمانِ قضا و قدر ایسا نہ ہو سکا۔

مکہ سے آ کر پانچ روز حرم محترم میں بسر کر کے ... پہنچے۔ بعدہٗ سیل میں اترے۔ یہاں نہ ... ایک وبالشت زمین کھود کر صاف پانی نکالا جا سکتا ہے۔ ... ربیع الثانی کو طائف آئے

طائف بڑی اچھی ہوا رکھتا ہے۔ اس زمانے میں جبکہ گرمی کی "گرم بازاری" ہے۔ یہاں (لاغری کے باعث) زیادہ آسانی نہیں ہو سکے
میوہ ہائے گوناگوں یہاں پائے جاتے ہیں۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند آثار یہاں مشہور ہیں۔ حبر الامۃ ترجمان القرآن سیدنا
عبداللہ بن عباس رضی اور سیدنا زید بن ثابت رضی کے مزار یہیں ہیں، حضرت عکرمہ مولیٰ ابن عباس رضی کا مرقد نواح طائف میں ہے۔
سوائے قبر عکرمہ رضی کے کہ فاصلہ پر تھی باقی مزارات مقدسہ کی زیارت کی ——
طائف کی اپنی ذاتی آبادی کچھ ایسی نہیں ہے لیکن اہل مکہ کے جمع ہو جانے سے اس میں رونق ہو جاتی ہے۔ یہاں کی
عمارتیں خام ہیں۔ مثنیٰ ایک موضع، طائف سے ایک کوس پر ہے۔ یہ مقام بھی باغات کا مرکز ہے۔ آٹھ دن اس سرزمین میں گذرے
تھے کہ کشتی والے نے کہا کہ "موسم سفر دریا گذرا جاتا ہے، تمام سفینے چلے گئے صرف دو کشتیاں ساحل پر ہیں اور وہ بھی عنقریب
روانہ ہونے والی ہیں"۔ اس خیال سے تو دل غمگین تھا کہ دیار عرب کو جلد خیر باد کہنا پڑے گا لیکن "اقامت سالِ دگر" کا بجز
دعوہ موقع نہ تھا — لہٰذا فوراً طائف سے آہنگ حرم کیا اور اسی [illegible] سمت جعرانہ سے واپسی نہ ہونے دی —
۱۲ ربیع الاول کو مکہ پہنچے۔ بین الصفائین طواف و سعی کی۔

وداع مکہ | پندرہ روز مکہ میں قیام کر کے بادل پرغم اور باچشم گریاں طواف الوداع بہ نیت واپسی کیا۔ ۲۷ کو حدیبیہ
میں نزول ہوا یہاں سے دو کوس کے فاصلے پر بیعت الرضوان ہے۔ اب وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے صبح کی نماز اس مسجد میں
پڑھی والحمد للہ۔ ۲۸ کو جدہ آئے۔ یہ آباد شہر ہے لیکن "مصر کلاں" نہیں ہے۔ سوداگروں کے اجتماع کی وجہ سے یہاں رونق ہے۔
یہاں مکھیوں اور مچھروں کی زیادتی اور پانی کی کمی تکلیف دہ ہے۔ حضرت حوا رضی اللہ عنہا کا مزار بیرون شہر واقع ہے — نو
روز جدہ میں ٹھہرے۔ شب ہفتم ماہ جمادی الاولیٰ میں کشتی پر بیٹھے لیکن چار دن تک بادِ موافق نہ چلی کشتی اپنی جگہ رہی۔ آخر
۱۱ جمادی الاولیٰ کو نسیم صبح گاہی کے ہمراہ کشتی روانہ ہوئی — ۱۷ کو بندرگاہ حدیدہ پہنچے۔ اسی دن یہاں اتر کر جامع مسجد
میں نماز شام پڑھی اور اسی مکان میں اترے جس میں جاتے وقت اترے تھے۔ یہاں اس وقت طرح طرح کا میوہ پایا
جاتا ہے۔ ان میں سب سے لطیف و لذیذ رطب ہے پھر عنب —— انبہ بھی اس جگہ مل جاتا ہے۔
اس دفعہ فقیہ عمر سے حسبِ دلخواہ ملاقات رہی، شیخ مذکور کے مناقب اندازۂ بیان سے بالاتر ہیں۔ ان کا ظاہر معمور اور
باطن آباد ہے۔ ہر چند کہ ان کے کچھ فضائل پہلے گذر چکے ہیں لیکن بمقتضائے

اَعِدْ ذِکْرَ نُعمانٍ لَنا اِنَّ ذِکْرَہٗ ‏ ‏ ‏ ہو المسک ما کررتہ یتضوع

(نعمان کا ذکر بار بار کر کیونکہ اس کا ذکر مشک کی طرح ہے۔ بار بار خوشبو دیتا ہے)
قلم نے تکرار فضائل میں تامل نہیں کیا۔ شیخ نے رسالۂ امام ابوالقاسم قشیریؒ فقیر کو عنایت فرما کر ارشاد فرمایا اُوصیک
بکثرۃ النظر فی ھذہ النسخۃ المبارکۃ یعنی میں اس کتاب کے بار بار مطالعہ کرنے کی تم کو وصیت کرتا ہوں —
شیخ باوجود حنفی ہونے کے قرأتِ فاتحہ خلف امام کے بارے میں "اصرار فراواں" رکھتے ہیں —
میں حضرت سید احمد مقبول [illegible] کے دیدار کا آرزو مند تھا۔ ۲۲ جمادی الاولیٰ کو ملاقات کے وقت قصبہ [illegible]
نکلتے نکلتے وہاں پہنچ گیا۔ حضرت سید سے "دولتِ مصافحہ" نصیب ہوئی، نوازش و لطف کا معاملہ کیا [illegible]

بتادیں دیں۔ ان کا دل "سیب" رسیدہ" اور محبوب حقیقی سے آرمیدہ ہے۔ ان کی عمر ایکسو سات سال ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ان کے ایک لڑکا تولد ہوا ہے۔ یہ امر ان کی کرامات خوارق عادات میں سے ہے۔ ثقہ لوگوں نے ان کے خوارق کثرت سے بیان کیے۔ اگر ان سب کو لکھا جائے دفتر طولانی ہو جائے۔ ۲۳ر جمادی الاولیٰ کو حدیدہ واپس ہوئے۔

یمن | یمن پاکیزہ علاقہ ہے۔ یہاں جس کو سنو "قدسی نفس" جس کو دیکھو "پاک روح"۔ میں نے نادیدہ حضرات کا ذکر نہیں کیا ورنہ اس سرزمین میں اتنے اولیا ہیں کہ ان کے تذکرے سے مستقل ایک "تذکرۃ الاولیاء" مرتب ہو سکتا ہے۔ میں نے اس مبارک سرزمین میں دیکھا کہ یہاں ہنوز "بہارستان ولایت" شاداب ہے۔ اور "چمن زار کرامت" کے پھول تازگی کے ساتھ موجود ہیں۔

ہنوز آں ابر رحمت دُر فشان است   مے و میخانہ با مہر و نشان است

ایک خاص واقعہ ملک یمن کا اقتدار ترک سے نکلنا اور امام صنعاء کے حیطۂ اختیار میں آنا ہے۔ امام صنعاء کوہستان میں بسر کرتا تھا، ناگاہ اس کی قسمت جاگ اٹھی اور "عروس مملکت" اس کے سرہانے آکر کھڑی ہو گئی۔ سبحان اللہ! ہمارے جاتے وقت یہ مملکت ترکوں کے پاس تھی اور آتے وقت امام، صاحب تاج و نگیں ہے۔ عشرت گیتی کو ثبات اور دولت دنیا کو بقا نہیں۔

۲۷ر جمادی الاولیٰ کو حدیدہ سے چل کر مخا پہنچے اور وہاں سے ۲ر جمادی الثانیہ کو روانگی ہوئی۔ رات کے وقت باب المندب سے بے زحمت نکل گئے۔ تین دن ہوا موافق چلی۔ چوتھے دن امواج سمندر نے کشتی کو بحر عجم میں ڈال دیا اور ایک ایسے پہاڑ کے پاس پہنچا دیا جو ساحل پر واقع ہے۔ اس جگہ پانی کس بلا کا زور اور کشش رکھتا تھا (معلوم ہوتا تھا) کوسوں سے کشتی کو کھینچتا تھا۔ چھ دن تک اس ورطہ سے نکلنا نہ ہوا۔ جب ہوا تیز چلتی تھی کشتی جنبش میں آجاتی تھی اور پہاڑ سے دور ہو جاتی تھی اور جب ہوا کم ہو جاتی تھی پانی زور کرتا تھا اور کشتی کو پھر پہاڑ کی سمت کھینچ لاتا تھا۔ ہر شام کو خوش ہوتے تھے کہ آج پہاڑ سے دور چلے گئے اور صبح کو دیکھتے تھے کہ پہلے سے بھی زیادہ پہاڑ سے نزدیک ہیں۔ بارے دعا سحری کارگر ہوئی، ہوائے موافق مسلسل چلی اور دو دن میں "جذب آب" کی حد سے نکل آئے۔ ۲۰ر جمادی الثانیہ کو بمبئی پہنچے۔ ۱۹ دن میں مخا سے بمبئی پہنچنا ہوا۔

بمبئی سے دہلی | ہجوم ابر و باراں اور خرابی راہ کے باعث ایک ماہ پانچ روز بمبئی میں قیام رہا۔ راہ ناحق اس لیے اختیار نہیں کی گئی کہ "یاران سورت اور بڑودہ" سے ملاقات نہ کرنا مروت سے دور تھا۔ حضرت ہادی علی شاہ کے خط

مآثر ازرہ | بھیجے ہیں مولانا صدر الدین خاں صاحب صدر شاہجہاں آباد (دہلی) کا مکتوب آیا ہے۔ مولانا دعا گو کے حال میں سے بھی بڑی عنایت فرماتے ہیں۔ مراتب دانشمندی میں ان کے ہمپایہ کم نظر آئیں گے۔ منقول و معقول میں [illegible] کامل استعداد ہیں۔ ان کی محفل زیادہ گرم ہے۔ سیوف باتوں میں فکر سخن کرتے ہیں۔ آزردہ تخلص ہے۔ ان کے مکارم

فراواں ہیں کہ نگارندہ کا قلم لکھتے لکھتے فرسودہ ہو جائے پھر بھی تھوڑے سے نہیں لکھے جا سکیں گے مشتاقانِ تفصیل کو تذکرہ "گلشن بیخار" دیکھنے کا مشورہ دیتا ہوں میں نے اس میں مولانا کا ذکر وضاحت سے کیا ہے۔

بمبئی سے ۱۹ر شعبان کو رخصت ہوکر منزل بمنزل چل کر ۲۷ر شعبان کو سورت پہنچے۔ وہاں ہمارے پہنچنے سے دو روز پیشتر سید محمد عیدروسیؒ کا انتقال ہو چکا تھا اور سید میاںؒ چند ماہ پیشتر عالم بالا کو سدھار چکے تھے۔ آج سورت میں ان دونوں بزرگوں کی جگہ خالی پڑی ہے نہ کوئی فقیہ سید میاں جیسا بزم علم و دانش میں نمودار ہے اور نہ کوئی مرشد سید محمد جیسا مسند ارشاد پر فائز ہے۔ سورت چھ روز ٹھہر کر بریاؤ۔ ہرسورن۔ بروچ۔ ایکڑ۔ انیثولہ ٹھہرتے ہوئے ۶ر رمضان کو بڑودہ پہنچے۔

قابلِ یادداشت نصیحت | بڑودہ اور گودرہ کے درمیان ایک جگہ ایک کہن سال بزرگ عبدالعزیز نام سے ملاقات ہوئی انھوں نے ایک نصیحت فرمائی دل چاہتا ہے کہ اس کو بھی لکھ دوں۔ فرمایا ـــ "کہ اسباب حجاب میں یہ دو سبب بڑے ہیں (۱) نگاہ بر اسباب ظاہر (۲) وہم انانیت ـــــ کوتاہ بیں لوگ کتنی ہی بلند پروازی کریں پردہ اسباب سے نہیں گزر سکتے، اور ساغر انا کو توڑنا بھی مشکل ہے اس مادۂ فاسد کا قلع قمع کرنے کے لیے سفر دریا بہترین علاج ہے خصوصاً جب کہ موج من فوقہ موج من فوقہ سحاب' کا منظر سامنے ہو۔ اس وقت جبکہ ہاتھ تمام تدبیروں سے کوتاہ ہو جاتا ہے اور تمام اسباب پوشیدہ ہو جاتے ہیں، غلبۂ قہر کثرت نہاں ہو کر سلطان وحدت کا ظہور ہوتا ہے تو طلسم ما و تو درہم برہم ہو کر 'لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار' کا مفہوم ظاہر ہو جاتا ہے اور پردہ اٹھ جاتا ہے۔ پھر فرمایا تم نے (اے شیفتہ) یہ ذوق (سفر دریا کی صعوبتیں جھیل کر) حاصل کر لیا ہے۔ کاش کہ اس واقعہ کو دھراتے رہنا اور اپنی بیچارگی ہی نہیں بلکہ نابودگی کو نظر میں رکھنا، تم کوئی چیز ہوتے تو تم سے (ان مصائب کے وقت) کچھ ظاہر ہوتا، شاید کہ کثرت تعلق باللہ سے تکلف بے تکلفی سے بدل جائے اور ہستی موہوم سے قطع نظر کرنا زندگی جاوید کا سبب بن جائے۔ فنا چاہو گے تو بقا ملے گی "۔ سبحان اللہ! اس قوم (صوفیاء) کی نگاہ بھی کتنی بلند اور عقل کتنی ارجمند ہوتی ہے۔ مگر فقط باتوں سے کام نہیں چلتا عمل کی توفیق ہو جائے تو بات ہے۔

۱۰ر شوال کو بڑودہ سے چلے اس دفعہ یہ ارادہ ہوا کہ آنے والے راستے کو بدل دیا جائے تغیرِ راہ کا بڑا سبب مشاہدۂ احمد آباد کا خیال تھا لہٰذا احمد آباد کا رخ کیا، ساؤلی میں جو بڑودہ سے بارہ کوس ہے اور نواب حسام الدین کی جاگیر ہے نواب صاحب کے ساتھ وارد ہوئے۔ ۱۱ر کو نواب صاحب نے جانے نہ دیا۔ ۱۲ر کو بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ دوستوں کو رخصت کیا ع گر سنگ از خیزد وقت وداع یاراں"۔ وہاں سے چل کر تیسری منزل پر ۱۵ر شوال کو بتوہ پہنچے، یہ مقام حضرت سید برہان الدین عبداللہ مشہور بہ قطب العالم کی آرامگاہ ہے یہ مشاہیر اولیائے گجرات سے ہوئے ہیں، ان کا طریقہ سہروردی تھا۔ انھوں نے مخدوم جہانیاںؒ سے استفادہ کیا ہے۔ ۱۶ر شوال

کو احمد آباد آئے۔ اثنائے راہ میں حضرت شاہ عالم کی تربت پُرنور کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ یہ بزرگ حضرت شاہ قطب عالم قدس سرہٗ کے صاحبزادے ہیں۔ احمد آباد میں بہت سے اولیا آسودہ ہیں مگر چونکہ اکثر بزرگوں کے مزارات شہر سے فاصلے پر واقع ہیں اس لیے اُن کی زیارت نہ ہو سکی۔ ہاں شیخ احمد کی تربت پر جو سرخیز میں کہ آج کل سرکھیج مشہور ہے، جانا ہوا۔ کہتے ہیں کہ سلطان احمد گجراتی نے احمد آباد گجرات کو کہ "کلمۂ خیر" (۸۱۳ھ) اس کی سال بنا کی خبر دیتا ہے، شیخ احمد کی رائے سے آباد کیا۔ ان کے روضے کے قریب علی شیر چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار واقع ہے، دیگر بزرگوں کے مزارات پر بھی جو شہر میں واقع ہیں جانا ہوا لیکن چونکہ ان کا حال تفصیل سے معلوم نہ ہو سکا اور اجمالی حالات بھی یاد نہ رہے لہٰذا ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں اولیائے گجرات کے ذکر میں مستقل تواریخ موجود ہیں اس وجہ سے بھی ان سب کے تذکرے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

آج کل شہر احمد آباد ویران سا ہے جس طرح بڑا شہر ہونے میں احمد آباد کی نظیر کمتر پائی جاتی ہے ویرانی میں بھی اسی طرح بے نظیر ہے، سوائے مساجد کے کہ خدا اُن کو آباد رکھے، کوئی چیز کم دیکھی جاتی ہے اور مساجد بھی ضائع ہو رہی ہیں۔ یہاں کی ایک قابل دید چیز "افزونی گرد و ریگ" ہے عالمگیر بادشاہ رحمۃ اللہ علیہ بطور لطیفہ فرمایا کرتے تھے:

"ہیچ شہر بگرد احمد آباد نرسد (کوئی شہر احمد آباد کی گرد کو نہیں پہنچتا)"۔

البتہ احمد آباد کے کپڑے وفور شہرت کے باعث ذکر سے مستغنی ہیں۔ مشائخ میں اس جگہ خوب میاں چشتی رحمۃ اللہ علیہ "خوبانِ روزگار" سے ہیں۔ شکستہ طبع، نرم دل، خوش خو اور پسندیدہ گفتار ہیں، اوقات عزیز کو عبادت سے معمور رکھتے ہیں۔ انھوں نے راقم پر بہت مہربانیاں فرمائیں۔ معززین میں سے قاضی محمد صالح کبیر السن بزرگ ہیں۔ احمد آباد سے ۲۵ شوال کو منزل بمنزل چل کر ۲۵ ذی قعدہ کو اجمیر شریف آئے۔ اجمیر سے دہلی تک روزنامچۂ سفر لکھا نہ جا سکا۔ مختصر یہ ہے کہ پانچ چھ روز اجمیر میں قیام کر کے وہاں سے روانگی ہوئی۔ ایک ہفتہ جے پور میں گزار کر وہاں سے روانہ ہوئے۔ کچھ حضرات دہلی سے ریواڑی تک "برسم استقبال" پہنچے اور بعض گوڑ گاؤں آئے۔ جب درگاہ حضرت خواجہ قطب الاقطاب قدس اللہ سرہ میں پہنچے تو تمام اعزا و اکابر اور احباب و اصحاب آ کر ملے۔ دل خوش ہوا۔ ۳ ذی الحجہ ۱۲۵۸ھ کو بعد زیارت حضرت سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ و والد مغفور، چاشت کے وقت شاہجہاں آباد (دہلی) میں وارد ہوئے۔ والحمد للہ تعالیٰ علی المعاودۃ مع العافیۃ والسلامۃ ـــــ

یہاں سب سے پہلے مرجع آفاق مولانا محمد اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے، اس کے بعد گھر پہنچنا ہوا۔

تمام مدت سفر حج دو سال اور چھ روز ہے۔

غیر اسلامی حکومت کی شرکت اور ملازمت

ایک سوال اور اس کا جواب

(از محمد منظور نعمانی)

سوال :- آپ نے اپنی کتاب "دین و شریعت" میں سیاست و حکومت کے باب میں غیر اسلامی (غیر شرعی) حکومت کے تحت رہنے والے مسلمانوں کے لیے جو اصولی راہ عمل تحریر فرمائی ہو جس کے ماتحت وہ حکومت کے بہت سے شعبوں میں ملازمتیں بھی جائز طور پر کر سکتے ہیں اور ملت کی دینی و دنیاوی مصالح کا تقاضا ہو تو حکومت اور قانون ساز اداروں میں شرکت بھی کر سکتے ہیں۔ اس کو میرے دل و دماغ نے پوری طرح قبول کیا ہے۔ بات بالکل دل لگتی اور شرعی نقطۂ نظر سے حق نظر آتی ہے۔ اور آپ نے جو استدلالی بحث اس سلسلہ میں کی ہو اگرچہ وہ بہت مختصر ہے مگر میرے نزدیک کافی حد تک اطمینان بخش ہو۔ لیکن ایک خلش یہ باقی رہ گئی کہ آپ نے ان دلائل اور اس نقطۂ نظر سے بالکل تعرض نہیں فرمایا جس کی بنیاد پر ہند و پاک کا ایک مشہور و معروف دینی مکتب فکر کسی غیر اسلامی حکومت یا اس کے قانون ساز اداروں میں شرکت کو ہر حال میں ایک طاغوتی عمل اور ایسی حکومتوں کی ملازمت کو مطلقاً تعاون علی الاثم والعدوان اور طاغوت کی چاکری قرار دیتا ہے۔

ان حضرات کی مشہور دلیل سورۂ توبہ کی آیۃ اتخذوا احبارهم ورهبانهم الخ اور اس کی شرح کرنے والی حدیث بروایت عدی بن حاتم ہے۔ اس کی تفصیل یقیناً آپ کے علم میں ہوگی۔ اچھا ہو کہ آپ اس پر بھی روشنی ڈال کر مجھ جیسے لوگوں کی یہ خلش دور فرما دیں۔

جواب

"دین و شریعت" کی جس بحث کا آپ نے اپنے سوال میں حوالہ دیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے ابتداءً اس کو لکھا تھا تو اپنے مدعا اور مسلک کی وضاحت سے فارغ ہونے کے بعد اس مخالفانہ نقطۂ نظر اور اس کے اُن مشہور دلائل سے بھی تعرض کیا تھا جن کا آپ نے تذکرہ کیا ہے۔ لیکن بعد میں مجھے یہ خیال ہوا کہ پوری کتاب میں میرا یہ رویہ رہا ہے کہ دین کے جس باب میں جو میرے نزدیک حق تھا بس اسی کو میں نے وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ناظرین کے اطمینان قلب اور تاثر کے لیے جہاں جتنی استدلالی بحث ضروری سمجھی بس اسی قدر بحث کر دی ہے۔ مخالفانہ دلائل سے کہیں بھی تعرض نہیں کیا ہے، اس لیے مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس بحث میں بھی اسی طریقہ کی پابندی کی جائے۔ چنانچہ وہ لکھا لکھایا حصہ میں نے کتاب سے نکال لیا ——— لیکن نکالا ہوا وہ حصہ اصل مسودہ میں محفوظ تھا اس لیے الفاظ کے معمولی تصرف کے ساتھ میں اسی کو نقل کیے دیتا ہوں ——— پہلے میں نے چند سطروں میں اس مخالفانہ نقطۂ نظر کا تذکرہ کیا تھا جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس کے بعد میں نے لکھا تھا کہ "کتاب و سنت" اور امت کے مسلسل تعامل سے اس بارہ میں جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کے لیے یہ تو ضروری اور گویا شرط ایمان ہے کہ وہ اسلام، اسلامی تعلیم یعنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات اور نظام زندگی کو حق و ہدایت سمجھے اور اُس کے خلاف جو کچھ ہے اس کو غلط باطل یقین کرے اور اس لیے اس کی دلی آرزو اور چاہت یہی ہو کہ تمام انسان اللہ و رسول پر ایمان لے آئیں اور ان کے مقدس دین اسلام کو اپنا لیں۔ اور ساری دنیا اس کی حلقہ بگوش اور اسی کے زیر اقتدار ہو جائے۔ (وَ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ) نیز اُمّتِ مسلمہ کا یہ بھی فرض ہے کہ اس مقصد کے لیے جس وقت براہ راست یا بالواسطہ جو سعی و تدبیر مناسب ہو اس سے دریغ نہ کیا جائے ——— (یہ بات "دین و شریعت" میں "دین کی خدمت و نصرت" کے زیر عنوان تفصیل سے لکھی بھی جا چکی ہے)۔ ——— لیکن ان حضرات کا یہ کہنا کہ کسی ملک کی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ کسی معاملہ میں تعاون اور اس کی کوئی ملازمت کرنا بھی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں، اور اس کو مستقل شرعی فتوے کی حیثیت دینا ہمارے نزدیک ایسی بات ہے جس کی شریعت میں کوئی دلیل و بنیاد نہیں ہے۔ علاوہ ازیں بعض حالات میں

اس غالیانہ "فتوے" سے مسلمانوں کے دینی مقاصد و مصالح کو بھی سخت ضرر پہونچ سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک عام شرعی مسئلہ اس باب میں یہ ہے کہ ایک مسلمان جس طرح کسی غیر صالح یا غیر مسلم فرد کے ان معاملات کی انجام دہی کے لیے اس کی ملازمت اور اس کے ساتھ تعاون و اشتراک کر سکتا ہے جو اثم و عدوان نہ ہوں، اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں اور اس طرح کے دوسرے اجتماعی اداروں کے بھی ان کاموں میں ہم تعاون کر سکتے اور عملی حصہ لے سکتے ہیں جو خلاف شریعت اور از قبیل اثم و عدوان نہ ہوں اور جن میں اسلام اور مسلمانوں کا کوئی ضرر نہ ہو، مثلاً حکومتوں کا محکمۂ صفائی، محکمۂ غذا، محکمۂ صحت، مواصلات، زراعت، صنعت، انسداد جرائم اور قیام امن، اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد شعبے حکومتوں کے ایسے ہیں جو اثم و عدوان نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض میں تو خدمت خلق اور رفاہ عام کا پہلو بھی غالب ہے۔ پس ایسے کاموں میں تعاون اور ان صیغوں میں ملازمت کے شرعی عدم جواز کی کوئی بھی وجہ نہیں ہو سکتی۔

یہاں ایک بڑا اصولی نکتہ جس پر عدم جواز کے اس فتوے کی بنیاد رکھی جاتی ہے یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ہر غیر اسلامی حکومت اللہ کے مقدس دین کے مقابلے میں ایک متوازی دین اور اللہ کے نازل کیے ہوئے نظام حق کے مقابلہ میں ایک باغیانہ نظام ہے اس لیے اس کے کسی بھی کام میں تعاون و اشتراک اور کسی بھی شعبہ میں اس کی ملازمت و خدمت دین حق کے مقابلہ میں ایک دین باطل کی خدمت اور مقدس الٰہی نظام کے مقابلہ میں ایک باغیانہ طاغوتی نظام کے ساتھ تعاون اور اس کی خدمت ہے۔

لیکن اگر اللہ نے دین کا کچھ بھی علم و فہم دیا ہے تو تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ بات شرعی دلیل سے زیادہ خطابت اور شاعری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس قسم کی دنیوی حکومتوں کے بارے میں یہاں گفتگو ہے (ان کے حدود اختیار اور حدود کار کی موجودہ وسعت کے باوجود) ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے کہ وہ ملکی نظم و نسق کو چلانے والے ایسے ادارے ہیں جن کے افراد بھی بدلتے رہتے ہیں، پارٹیاں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اصول اور دستور تک میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں، ان غلطیوں پر نکتہ چینی بھی کی جاتی ہے، خاصکر جمہوری حکومت

والے ملکوں میں یہ نکتہ چینیاں بعض اوقات نہایت سخت اور حد درجہ رسوا کرنے والی ہوتی ہیں، پھر ان حکومتوں کے بڑے بڑے ذمہ داروں پر بھی بعض اوقات مقدمے چلتے ہیں اور ان کو سزائیں بھی دی جاتی ہیں، پھر عوام کے لیے ان حکومتوں کے بدلنے کا حق بھی تسلیم کیا جاتا ہو، اور اسی بنیاد پر ملکوں میں یہ حکومتیں آئے دن بدلتی بھی رہتی ہیں ـــــ اور اسی بنا پر کہ ان حکومتوں کی اصل حیثیت بس یہی ہو کہ یہ ملکی نظم و نسق کے چلانے کے ادارے ہیں ان میں بسا اوقات مختلف عقائد و خیالات رکھنے والے اور مختلف ادیان و مذاہب کے ماننے والے، اور کبھی کبھی تو مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے بھی شریک ہو جاتے ہیں جن کے درمیان صرف حکومت کے اصولی پروگرام پر اتفاق ہوتا ہے ـــــ پس جن حکومتوں کی واقعی حیثیت اور پوزیشن یہ ہو ان کے غیر اسلامی اور غیر شرعی ہونے کی وجہ سے شریعت کی زبان میں ان کو ناحق اور غیر صحیح حکومتیں تو بیشک کہا جا سکتا ہو لیکن یہ کہنا کہ ایسی ہر حکومت خدا کے مقدس دین کے مقابلہ میں ایک متوازی دین ہے اور ان کے چلانے والے خدا کے مقابلہ میں خدائی کے دعویدار ہیں جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جبکہ خدا اور اس کے مقدس دین کو بہت نیچے اتار لیا جائے۔ یعنی خدا کو دنیوی حکمرانوں اور فرمانرواؤں کی قسم کا بس ایک حاکم و فرمانروا اور اس کے دین کو بس ایک "اسٹیٹ" اور "نظام حکومت" سمجھ لیا جائے۔

تعالی اللہ عن ذالک علواً کبیرا ○

اسی طرح کا ایک دوسرا مغالطہ اس سلسلہ میں یہ بھی ہو کہ ان حکومتوں کی صرف دنیوی قانون سازی کو اللہ تعالیٰ کی دینی تشریع کے مقابل قرار دے کر "شرک" بلکہ اس سے بھی بڑھ کر "خدائی کا دعویٰ" کہا جاتا ہو اور اسی بنا پر ان حکومتوں کی مجالس قانون ساز کی شرکت کو 'دعوئے خدائی کو متضمن اور قطعی حرام قرار دیا جاتا ہو، حالانکہ جس تشریع کا حق غیر اللہ کے لیے ماننا واقعۃً شرک ہو وہ دینی تشریع ہو، یعنی یہ کہ کسی مخلوق (فرد یا طبقہ یا ادارہ) کو مقدس مطاع اور منزہ عن الخطا مانتے ہوئے اس کو تحریم و تحلیل اور امر و نہی کا حقدار مانا جائے اور اس کے احکام کی تعمیل کو مُوجبِ سعادت اور اس کی نافرمانی کو گناہ و شقاوت سمجھا جائے ـــــ قرآن مجید میں نصاریٰ کے جس گروہ کے بارہ میں فرمایا گیا ہے ـــــ کہ

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ   انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے مذہبی عالموں

اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۔ (توبہ ع ۴) اور مردولیتوں کو اپنا خدا بنا لیا۔

ان کی گمراہی یہی تھی اور اپنے اَحْبَارُ وَ رُھْبَان کو انھوں نے تقدس و تشریع کا یہی مقام دے رکھا تھا۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت عدی بن حاتم سے جو حدیث مروی ہو خود اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے[ف] ۔ اور مسیحیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ چیز اور زیادہ وضاحت و تفصیل سے معلوم ہو جاتی ہو۔

اور بالکل ظاہر ہو کہ عہد حاضر کی جن غیر اسلامی حکومتوں کے بارہ میں یہ گفتگو ہو رہی ہو' ان کی اور ان کے قانون کی حیثیت کسی کے نزدیک بھی یہ نہیں ہو، اس لیے ان کی قانون سازی کو وہ تشریع قرار دینا جو درحقیقت صرف اللہ کا حق ہو اور اس بنا پر اس کو خدائی کا دعویٰ یا شرک یا حرام کہنا سراسر شاعرانہ غلو ہو اور پھر اس کے ثبوت میں سورۂ توبہ کی مندرجۂ بالا آیت پیش کرنا اور بھی بے جا جسارت ہے۔

امید ہو کہ اس مسئلہ سے متعلق یہی سطریں آپ کی اور آپ جیسے دیگر حضرات کی "خلش" دور کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔

اصل بات یہ ہو کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح اور جائز حکومتیں تو صرف وہی ہو سکتی ہیں جو حکومت و سیاست کے اسلامی ضابطہ کی بنیاد پر قائم ہوں اور جن کے دستور و قانون کی اساس کتاب و سنت اور اسلامی شریعت کو قرار دیا گیا ہو۔ لیکن جو حکومتیں ایسی نہیں ہیں (خواہ ان کے چلانے والے غیر مسلم ہوں یا مسلمان یا مخلوط) ان کے غیر صحیح اور ناجائز ہونے کے باوجود اسلام ان کے وجود کو

[ف] جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت عدی بن حاتم سے روایت ہو کہ عدی بن حاتم جو عیسائی تھے انھوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ توبہ کی یہ آیت سنی تو عرض کیا کہ عیسائیوں نے اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا تو نہیں بنایا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ اُن کے یہ عالم اور درویش جس چیز کو حرام یا حلال قرار دے دیتے ہیں عیسائی ان کی تحریم و تحلیل کو مان کر ان کا اتباع کرتے ہیں ——— یہی ان کو خدا بنانا ہے۔ ظاہر ہو کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد دینی تحریم و تحلیل ہے۔ اور مسیحیت کی تاریخ کے مطالعہ سے اس کی پوری تفصیل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح وہ غیر صالح اور غیر مسلم افراد کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ پھر ان کے حالات کے اختلاف کے لحاظ سے وہ ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کرتا ہے اور ان کے بارہ میں الگ الگ احکام دیتا ہے ــــ پھر جس طرح وہ عام حالات میں غیر صالح اور غیر مسلم افراد کے ساتھ ایسے امور میں تعاون و اشتراک سے منع نہیں کرتا جو اثم و عدوان نہیں ہیں اسی طرح وہ ایسے امور میں غیر اسلامی حکومتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون سے بھی منع نہیں کرتا، بلکہ اگر غیر مسلم افراد اور اسی طرح غیر اسلامی حکومتیں کوئی کام ایسا کریں جس میں اللہ کی مخلوق کی بھلائی ہو تو اسلام اس میں تعاون کی اپنے پیروؤں کو ترغیب دیتا ہے ــــ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون و تناصر کا حکم صرف مسلمانوں ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اسکے عموم میں غیر مسلم بھی شامل ہیں[1]۔

علاوہ ازیں کسی غیر اسلامی حکومت کے مسلمان شہریوں کے لیے ایسے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ (بلکہ اکثر و بیشتر ایسا ہوگا) کہ حکومت کے کاروبار اور اسکی مجالس قانون ساز میں شرکت خود مسلمانوں کو دینی و دنیوی نقصانات سے بچانے کے لیے اور اُن کے دوسرے اہم ملی مصالح کے لیے ضروری سمجھی جائے پس ایسے حالات اور ایسی صورت میں تو ان مخلص مسلمانوں کا جو اس کے لیے اہل اور موزوں ہوں، حکومت کے کاروبار میں شریک ہونا ضروری ہوگا ــــ اور بالکل اسی طرح ان ملکوں کے مسلمانوں کے لیے ایسے حالات بھی آسکتے ہیں کہ حکومت کے کاروبار سے بالکل بے تعلقی اور عدم تعاون مسلمانوں کے دینی و ملی مصالح کا تقاضہ ہو اور ان کے اہل علم اور ارباب دانش اسی پالیسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کریں، اس وقت ان ملکوں کے مسلمانوں کو اسی کے مطابق چلنا اور اسی پالیسی پر عمل پیرا ہونا ضروری ہوگا۔ لیکن اُس وقت بھی اس فیصلہ کی بنیاد یہ نہ ہوگی کہ "غیر اسلامی حکومت سے اشتراک و تعاون ایمان باللہ اور کفر بالطاغوت کے بنیادی حکم کے منافی ہے اور اس لیے قطعاً حرام ہے" ــــ بلکہ وہ اس وقت کے خاص حالات کا تقاضا اور مخصوص صورت حال کا حکم ہوگا۔

واللہ تعالیٰ اعلم۔

---

[1] جس کتابچہ کے نقطۂ نظر پر یہ بحث کی گئی ہے اس کے مرکزی رہنما مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۂ المائدہ کی آیت "تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کے ذیل میں تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلقین اس موقع پر اس کو ضرور دیکھ لیں۔

ایک عبرت انگیز خط

[ذیل میں ایک نجی خط درج کیا جارہا ہے جو سراپا عبرت و موعظت ہے۔ خط میں کچھ اور بھی تھا جو اشاعت کے مقصد سے تعلق نہیں رکھتا تھا وہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ جواب بھی نجی طور پر دیا جا چکا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ بہت سے بندگانِ خدا کی ہدایت اور اُن میں دینی استقامت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔] (ادارہ)

جناب مولانا صاحب قبلہ! السلام علیکم۔ مزاج شریف۔ بعد آداب کے گزارش ہے کہ چند باتیں جناب سے دریافت کرنی ہیں اگر موقع ملے تو جواب دے کر اس ناچیز پر احسان کیجیے . . . . میں یہاں میونسپل بورڈ میں عرصہ چار سال سے ملازم ہوں، اور میرے ذمہ سلاٹر ہاؤس کا کام، روشنی کی چیکنگ اور اس کا کل کام، اور بازار میں جو جانور بکنے آتے ہیں اُن کی رجسٹری کرنا ہے۔ آج سے قریب دو سال قبل میں دو چھینے تک رجسٹری کرنے میں فی رسید چار آنے رشوت لے لیا کرتا تھا۔ بازار میں چار آنے فی رسید ناجائز طور سے ہم سے پہلے بھی لوگ لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سلاٹر ہاؤس کی محرری کا کام ہونے کی وجہ سے گوشت بھی سستا مل جایا کرتا تھا، اور کبھی کبھی مفت بھی لے لیا کرتا تھا۔ جناب قبلہ . . . . . صاحب کے . . .[1] آنے کے بعد اُن کے ذریعہ آپ کی کتاب "اسلام کیا ہے؟" پڑھی جس سے کہ مجھے رشوت سے گھن اور نفرت پیدا ہوئی۔ مگر کبھی کبھی ناجائز رقم لے بھی لیا کرتا تھا۔ اس کے بعد . . . . . صاحب نے داڑھی رکھنے کے لیے زور دیا۔ چنانچہ میں نے اپنے نفس کو بہت دبا کر داڑھی رکھ لی۔ ۲۲ سال کی عمر میں داڑھی رکھ لینا میرے لیے اسلام کا سب سے مشکل کام تھا۔ جب میں نے یہ کام کر لیا تو ایک ایک گناہ سے توبہ کی، اور اب شریعت کا کوئی بھی کام میرے لیے مشکل نہیں رہا۔ چنانچہ میں نے

---

[1] مقام کا نام۔ (الفرقان)

رشوت سے بالکل توبہ کی۔ ... صاحب سے یہ معلوم کیا کہ یہ جو رعایت سے گوشت ہمیں ملتا ہے اور قصاب ان کہتے ہیں کہ میں خوشی سے دے رہا ہوں، کیا یہ بھی رشوت ہے؟ جناب ... صاحب قبلہ دام برکاتہم نے میرے اوپر بڑا احسان کیا (اللہ پاک انھیں دین و دنیا میں خوش رکھے) صاف صاف بتلا دیا کہ ہاں یہ بالکل رشوت ہے۔ چنانچہ اس سے بھی توبہ کی اور اب اللہ کا فضل ہے کہ ایک چھیچھڑا میں زیادہ نہیں لیتا ہوں اور بازار کے پورے دام دے کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد ... صاحب سے میں نے پوچھا کہ پچھلی ناجائز رقم جو میں لے چکا ہوں اُس کے بارے میں کیا ہو؟ تو اُنھوں نے گوشت کے بارے میں یہ بتلایا کہ قصابان سے معاف کرانا تو ٹھیک نہیں ہے کیونکہ وہ محض تمھارے دباؤ کی وجہ سے کہہ دیں گے کہ ہم نے معاف کر دیا۔ لہٰذا اپنے اندازے سے کچھ رقم ان لوگوں کو دے دو اور یہ کہہ دینا کہ "ہمارے اندازے میں اتنی رقم کا گوشت میں نے تم سے رشوت کے طور پر لیا تھا، اب میں توبہ کرتا ہوں، پچھلے دام یہ لے لو اور اگر کچھ بڑھے ہوں تو معاف کر دو۔"

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بازار کے بارے میں اُنھوں نے یہ بتلایا کہ "جن جن سے پیسے لیے ہوں یاد کر کے دھیلے دھیلے ادا کر دو۔" چنانچہ میں نے اس کی بہت کوشش کی مگر افسوس یہ ہے کہ ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر بھینسوں اور گائیوں کی بازار لگتی ہے اور بڑی دور دور سے مثلاً ضلع کانپور۔ جھانسی۔ جالون۔ ہمیرپور وغیرہ سے لوگ بھینس خریدنے آتے ہیں اور میں فی کس دو آنے پیسے لیا کرتا تھا یعنی ۲ر خریدار اور ۲ر بیچنے والا، اور صرف دو ۲ چار مہینے تک یہ ذلیل کام کیا ہوگا، اور ۲۰۔ ۲۵ کے درمیان ناجائز روپیہ کمایا ہوگا، لہٰذا اتنی دور دور کے رہنے والوں کو اُن کے پیسے واپس کرنا غیر ممکن تھا۔ اس کے بعد یہ سوچا کہ منی آرڈر کے ذریعہ بھیج دوں، حالانکہ جتنے پیسے ہوں گے اتنا ہی منی آرڈر فیس بھی ہوگی۔ خریدار اور بیچنے والے کا پتہ رجسٹر میں لکھا رہتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے رجسٹر بھی Record روم میں داخل کر چکا تھا۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ ریکارڈ روم سے نکلوا کر دیکھ لیا جائے۔ اور ریکارڈ کیپر سے آپسی طور سے کہا اور اس کے اصرار پر اصلیت بھی اس کو بتلا دی مگر اس نے بغیر آفیسر کی اجازت کے رکارڈ سے رجسٹر نکالنے سے انکار کر دیا۔ ایسی حالت میں میں مجبور ہو گیا، اور ... صاحب سے کہا۔ اُنھوں نے کہا "یہ تو حق العباد ہے جس کا حق ہے اُسی کو دینا چاہیے

اتنا روپیہ کسی غریب محتاج کو دینے سے حق ادا تھوڑے ہی ہو جائے گا " ہاں اگر بالکل ہی غیر ممکن ہو تو اتنا روپیہ کسی محتاج کو دے دو " تب سے میں اب تک پس وپیش میں پڑا ہوں کہ کیا کرنا چاہیئے۔ اب للہ آپ بتلائیے کیا کیا کروں۔ کوئی صورت نجات کی ہو تو تحریر فرمائیے۔ بہت زیادہ احسان ہوگا۔ اگر ۲۵ روپیہ غریبوں اور محتاجوں کو اس نیت سے بانٹ دوں کہ اس کا ثواب ان لوگوں کو ملے جن سے میں نے ناجائز رقم لی تھی، یا کوئی اور صورت بتلائیے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت ہی نہ ہو۔ اور ان لوگوں کو واپس کرنا تو بالکل غیر ممکن کام ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی صورت ہو تو بتلائیے۔ اور اگر نہیں ہے تو مجبوری ہے۔ ہم نے جب کام ہی ایسا ذلیل کیا ہے تو سزا ملے گی۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ۲۵ روپیہ تو بڑی چیز ہے ایک آدمی کے ۲ ر ادا کرنے میں کہیں اللہ میاں ساری زندگی کا نماز روزہ نہ لے لیں۔ ایک تو کیا ہی کیا ہے سوائے گناہوں کے۔ . . . . . والسلام

تعارف و تبصرہ

۱۔ لغات القرآن جلد ششم — از مولانا عبدالدائم الجلالی — صفحات ۳۲۴
مجلد قیمت ۵/۸

۲۔ تاریخ گجرات — از مولانا پروفیسر سید ابو ظفر ندوی مرحوم صفحات ۴۴۸
قیمت مجلد ۸/-

ناشر :- ندوۃ المصنفین ۔ دہلی ۔

۱۔ ندوۃ المصنفین ہمارے ملک کا مشہور علمی و دینی ادارہ ہے ۔ جو بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ پے در پے معیاری علمی اور دینی کتابیں سامنے لا رہا ہے ۔ لغات قرآن کے موضوع پر جس شاندار کتاب کی تکمیل کا بیڑا اس ادارہ نے اٹھا رکھا تھا ، زیر تبصرہ جلد اس کی آخری جلد ہے جس میں حرف ن سے حرف یا تک کے لغات آ گئے ہیں ۔

جیسا کہ پہلی بعض جلدوں پر تبصرہ سے ظاہر ہو چکا ہے ، اس کتاب میں قرآنی الفاظ کے اردو معنیٰ بتائے گئے ہیں ۔ الفاظ کا صرف ترجمہ نہیں ، بلکہ ان سے متعلق ضروری تشریحات و مباحث کا بھی التزام ہے ۔ غرض شرح لغات کے ذریعہ قرآن فہمی جس حد تک ممکن ہے وہ اس کتاب سے پوری طرح حاصل ہو سکتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کتاب کے مرتبین اور ناشر کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے قرآن سے متعلق ایک بڑی خدمت اس کتاب کے ذریعہ اردو زبان میں انجام دی ہے ۔ کتابت و طباعت بھی ہر لحاظ سے بہتر ہے ، کاغذ سفید اور دبیز ہے ۔ تقطیع متوسط (الفرقان سائز) ہے ۔

دو ایک تسامحات کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے سامنے آئے ۔ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کے لیے ان کی نشاندہی کی جاتی ہے ۔

صفحہ ۳۱۳ پر

"یُوْذِیْ۔ واحد مذکر غائب مضارع مجہول منفی ..... ایذا دیتا ہے ۲۲/۴"

یہاں مجہول منفی کے بجائے معروف مثبت ہونا چاہیے۔

صفحہ ۳۱۶ پر

"یُوْفِضُوْنَ ...... (اِفَاضَۃ مصدر از افعال) وہ دوڑتے ہیں۔ دوڑیں گے۔ ۲۹/۸ دیکھو اَفَاضَ"

یُوْفِضُوْنَ کا مصدر اِفَاضَۃ نہیں اِیْفَاض ہے۔ اس بنا پر "اَفَاضَ" کا حوالہ بھی شاید بے محل ہوگا۔

۲۔ (تاریخ گجرات)۔ یہ ونیسر مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم تاریخ کا بڑا گہرا ذوق اور وسیع مطالعہ رکھنے والے بزرگوں میں تھے، اللہ عزوجل رحمت کرے۔ ابھی سال گزشتہ ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ایک مدت سے گجرات (احمد آباد) میں قیام تھا۔ تاریخ گجرات اب ان کے اسی قیام گجرات کی یادگار بن گئی ہے ــــ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کا ارادہ اس کتاب کو تین جلدوں میں مکمل کرنے کا تھا۔ پہلی جلد سری کرشن مہاراج کے عہد سے محمود تغلق شاہ (۱۴۱۲ء) کے عہد کے سیاسی حالات تک، دوسری شاہانِ گجرات کے عہد میں اور تیسری مغلوں مرہٹوں اور ان کے بعد برطانوی دورِ حکومت کے حالات میں۔ یہ پہلی جلد ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ دوسری بھی وہ تیار کر چکے تھے۔ تیسری کے متعلق پتہ نہیں کہ کس مرحلہ میں رہی ــــ یہ سب مصنف کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ ناشر نے کچھ نہیں بتایا کہ ان کے پاس آگے کی کوئی جلد ہے یا نہیں۔ اغلباً نہیں ہے ورنہ وہ اسے جلد اول ہی کی حیثیت سے شائع کرتے اور بقیہ جلدوں کے بارے میں کچھ ذکر کرتے۔ افسوس کہ یہ پہلی جلد بھی جس کی اشاعت دیباچہ کی تحریر کے مطابق ۱۹۳۱ء میں ہو جانی تھی اور یہ تصور مصنف کو مسرور کر رہا تھا، ۱۹۵۵ء میں اس وقت شائع ہوئی جبکہ مصنف اس دنیا سے گزر چکے تھے۔ خدا معلوم اس طویل مدت کی داستان کیا ہے؟

بہرحال یہ کتاب جو اس وقت سامنے ہے۔ سری کرشن مہاراج کے خاندان (جادوبنسی) کے عہد سے شروع ہو کر محمود تغلق شاہ اور ظفر خاں (آخری ناظم گجرات) کے دور تک کے سیاسی حالات کی تفصیل اپنے اندر لیے ہوئے ہے ــــ شروع میں ایک ۵، صفحے کا مقدمہ ہے جس میں

گجرات کے جغرافی حالات، وہاں کی آبادی اور مختلف اقوام کی تفصیلات درج ہیں، نیز گجراتی زبان کے ارتقاء اور اس کے ادبی سرمایہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، مقدمہ کے بعد کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔

باب اول۔ ہندوؤں کا راج ــــ باب دوم۔ عرب و ہند کا قدیم تعلق اور ہند میں مسلمانوں کی آمد ــــ باب سوم۔ اسلامی حملے۔ باب چہارم۔ گجرات دہلی کے ماتحت۔

ہندو اقتدار پر مصنف کا بیان مختصر ہے تاہم سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اسلامی حملوں میں سلطان محمود غزنوی کی لشکر کشی، اس کے محرکات، معرکوں کی تفصیلات اور سومنات کے واقعہ کو بہت تفصیل سے قلمبند کیا گیا ہے، باب چہارم میں گجرات کے ان دنوں کی سیاسی سرگزشت ہے، جن میں وہ دہلی کے خلجی اور تغلق بادشاہوں کے زیر نگیں رہا (۱۲۹۷ء تا ۱۴۱۲ء)

کتاب تاریخ کا ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ ہے جو پروفیسر سید ابو ظفر صاحب ندوی مرحوم نے اردو میں گجرات کی مکمل تاریخ کا خلا پُر کرنے کے لیے لکھی ہے۔ کم از کم دوسری جلد بھی اگر شائع ہو جاتی تو یہ خلا ایک حد تک ضرور پُر ہو جاتا۔

کتابت طباعت متوسط درجہ کی ہے۔ کاغذ عمدہ

جدید بین اقوامی سیاسی معلومات	از جناب اسرار احمد آزاد، صفحات ۷۰۴، کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ، مجلد قیمت ۸/۵ ناشر مکتبۂ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

موضوع کے اعتبار سے اردو زبان میں اسرار احمد صاحب آزاد کی اچھوتی کتاب کی دوسری جلد کا یہ دوسرا حصہ ہے جس پر کتاب تکمیل کو پہونچ گئی ہے۔

بین الاقوامی سطح پر تجاویز اور منصوبوں، تحریکات اور نظریوں، مسائل و تنازعات، معاہدات و ادارات، اجتماعات و محاربات اور دیگر نوع کے واقعات کی عرصہ سے جو ریل پیل ہے، وہ اس دنیا میں رہنے والے ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے باقاعدہ ایک ایسی ڈکشنری کی متقاضی ہو گئی ہے جو ان سب امور کی جامع اور ان کی شارح ہو، اردو خوانوں کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آزاد صاحب نے یہ ضخیم کتاب مرتب کی ہے جو بین الاقوامی مسائل و حالات

سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے بین الاقوامی امور میں خاصی بصیرت حاصل کیجاسکتی ہو۔ بشرطیکہ قاری اس بات کو بھی پیش نظر رکھے کہ مصنف بہت گہرے روس دوست ہیں ——

کتابت طباعت بہتر اور کاغذ عمدہ ہے۔

متاعِ کلیم | از کلیم احمد آبادی صفحات ۱۷۶ مجلد قیمت -/۴
ناشر:۔ کلیم بکڈپو ، خاص بازار ، احمد آباد ، (گجرات)

یہ گجرات کے اسی سالہ بزرگ شاعر جناب کلیم احمد آبادی کے آخری دور کا مجموعۂ کلام ہے جو خوش قسمتی سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا ہو۔ شروع میں جناب حبیب الرحمٰن غزنوی، پروفیسر جناب نجیب اشرف صاحب ندوی اور "شاعر" بمبئی کے ایڈیٹر جناب اعجاز صدیقی کا پیش لفظ، تقریب اور دیباچہ ہو جس سے کلیم صاحب کی زندگی اور ان کی شاعرانہ سرگزشت اور ان کے ادبی مقام پر روشنی پڑتی ہے، ان کی شاعری کے مرتبہ کے بارے میں تقریباً ان تینوں حضرات کی متفقہ رائے ہو کہ آج گجرات میں وہ اگر سب سے بڑے اردو شاعر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں۔"

یہ مجموعہ تمامتر غزلیات پر مشتمل ہو۔ کلام کا رنگ یہ ہے۔

گلوں کی شعلہ فشانی کو اور کیا کہیئے   چمن میں آگ لگی ہو چمن دہکتا ہے
عجیب منزلِ سوز و گداز ہے راہی   ذرا سکون ملا ہے تو دل دھڑکتا ہے
سکھا دیے ہیں کچھ آدابِ جذبِ الفت نے   میں رو رہا ہوں مگر آنکھ تر نہیں رکھتا
وہ آرہے ہیں غمِ دل انھیں بھی جا دینا   نہ ہو کچھ اور تو فرشِ نظر بچھا دینا
ہمارا کام یہی ہے کہ برق کی زد پر   نہ ہو جہاں وہیں اک آشیاں بنا دینا
کھلا ہو بابِ اجابت بڑھی ہو موجِ کرم   روا ہو ایسے میں دستِ دعا اٹھا دینا
لالہ و گل تو حسیں سے بھی حسیں تر ہیں مگر   دیکھنا یہ ہو کوئی خار حسیں ہو کہ نہیں

تقدیرِ الٰہی ہے دراصل جنوں میرا   گھٹ جائے تو درویشی بڑھ جائے تو شاہی ہو
کہیں گری تو ہو بجلی ذرا نظر کیجئے   کسی غریب کی لپٹی ہوئی دعا تو نہیں
آسمان و زمیں کو دیکھ لیا   ہم تو قائل ہیں دل کی وسعت کے
گل و بہار رہیں نہ آئی کبھی گلِ نسیم   کھلنا ہی تھا چمن میں کہ دست بہوں چلے

کتنی عجیب ہیں یہ دل کی راہیں　　　آسانیاں کم مشکل زیادہ
منزل سے آگے ہے ذوقِ منزل　　　اُڑنے لگے ہیں اربابِ جادہ

شفق کی شوخیاں ہوں یا گلوں کی شعلہ کاری ہو　　　ترے دیوانے ان کو اپنے ہی دل کا لہو سمجھے

آج کعبہ کی طرف رُخ ہو صنم خانے کا　　　ہو نہ ہو، ہے یہ تصرف ترے دیوانے کا
ہو کہیں موجِ تبسم تو کہیں موجِ بہار　　　ایک قطرہ ہے چھلکے ہوئے پیمانے کا

یہ رنگِ تغزل اربابِ ذوق کو دعوتِ التفات دینے کے لیے بجائے خود کافی ہے اور ضرورت نہیں کہ کلیم صاحب کسی کی سفارش کے رہینِ منت ہوں، گجرات کے اربابِ ذوق و ادب نے کلیم صاحب کا جشن جوبلی منا کر اپنی اردو نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے بعد امید ہے کہ کلیم صاحب بیرونِ گجرات سے بھی خراجِ تحسین پائیں گے۔

کتاب گٹ اَپ کے اعتبار سے بھی بہت خوب ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب اور سائز نہایت موزوں۔ بس اگر کچھ ناموزونیت ہے تو شاعر کی تصویر کے ساتھ گرد پوش کے ڈیزائن میں، یا یہ تصویر نہ ہوتی یا وہ ڈیزائن نہ ہوتا۔

ہفت روزہ "المنبر" لائلپور۔ زیر ادارت مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف۔ سالانہ چندہ نو روپیہ۔ پتہ: ماڈل ٹاؤن، لائلپور۔ پاکستان۔

الفرقان کا حلقۂ ناظرین جناب حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب سے ناواقف نہیں ہے۔ المنبر سے پہلے کئی سال تک وہ المنیر نکالتے رہے۔ اور یہ اُن کی خصوصیت ہے کہ وہ صحافت کے میدان میں یکایک آئے۔ اور آتے ہی کچھ دیر نہ لگی کہ ایک مقام کے مالک ہو گئے۔ "المنبر" المنیر کا نقش ثانی ہے۔ غالباً سات آٹھ مہینے کا عرصہ اس کو نکلتے ہوئے ہو گیا ہے۔ اس عرصے میں جتنے نمبر بھی اس کے آئے سب قابل مطالعہ اور لائق استفادہ نظر آئے۔ بین الاسلامی اتحاد اس کا خاص نصب العین ہے۔ جس کا راستہ مدیر المنبر کے نزدیک یہ ہے کہ عالم اسلامی میں پھیلے ہوئے احیاء اسلام کی جدوجہد کرنے والے کارکن ایک دوسرے سے اور ایک دوسرے کے کاموں سے تعارف حاصل کریں اور ممکن حد تک اپنے مشترک مقصد میں تعاون کی راہیں نکالیں۔ المنبر کے بیشتر شمارے اس راہ کو ہموار کرنے کی کوشش لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ذیل میں ایک مستقل چیز مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب کے وہ انٹرویو ہیں جو انھوں نے سال گزشتہ اپنے سفر حجاز میں عالم اسلامی کی پچاسوں شخصیتوں سے لیے۔ یہ انٹرویو المنبر میں برابر شایع ہو رہے ہیں۔ عربی سے بامقصد اور مفید مضامین کے تراجم کا بھی المنبر نے التزام سا کر رکھا ہے۔ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا سفرنامۂ حج بھی ابتک المنبر کا ایک مستقل عنوان سا رہا ہے۔ اس کے علاوہ حالات حاضرہ پر دینی نقطۂ نظر سے تبصرے اور دوسرے مفید علمی و دینی مضامین۔

اس وقت ہمارے سامنے المنبر کا خصوصی شمارہ "عیدالاضحیٰ نمبر" ہے۔ جو حج اور قربانی پر بڑے بیش بہا اور متنوع مضامین اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ ترتیب مضامین کی سیٹنگ اور گٹ اَپ کے اعتبار سے بھی اس کا درجہ معیاری ہے۔ اور اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پورا نمبر اپنے تمام تنوعات کے ساتھ حج اور قربانی کی حقیقی روح میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہم اس نمبر پر ادارۂ المنبر کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ مسجد نبوی اور خانۂ کعبہ کے مختلف فوٹوؤں سے اس نمبر کی تزئین کا اہتمام کر کے ادارہ المنبر نے بڑا جرأتمندانہ اقدام کیا ہے۔ خدا کرے بامقصد دینی جرائد کی کساد بازاری کے اس دور میں المنبر ترقی کی اس روش پر گامزن رہ سکے۔

ماہنامۂ راہنمائے صحت | زیر ادارت حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب و ڈاکٹر عبد الحمید خاں صاحب
صفحات ۴۸۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$۔ سالانہ چندہ ۲/۱۲۔ پتہ: ۱۷۴ جناح کالونی، لائلپور

خدا معلوم کہ اُس نے حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب کو کتنی مختلف صلاحیتیں اور کتنی قوت عمل سے رکھی ہے۔ ایک طرف مطب بھی کرتے ہیں، نہایت اعلیٰ پیمانے پر ایک دواخانہ بھی چلاتے ہیں جو (یونانی، ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک) تین تین شعبوں پر مشتمل ہے۔ پھر المنبر جیسا معیاری ہفت روزہ بھی نکالتے ہیں، اور اس ماہنامہ کی ادارت اُس پر مستزاد ہے۔ یہ ماہنامہ بھی ہماری نظر میں طبّی ماہناموں میں ایک منفرد اور معیاری حیثیت رکھتا ہے اور یہ سب نتیجہ ہے حکیم صاحب اور اُنکے رفقاء کے انہماک اور سلیقہ مندی کا۔

رہنمائے صحت کی تیسری جلد کا دوسرا شمارہ ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے ہے نہایت مفید مضامین پر مشتمل ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اطبا اور غیر اطبا سب ہی ان مضامین کو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے، اور اپنے اپنے مذاق اور ضرورت کے مطابق فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ طبّیات سے نکل کر عام سائنسی معلومات کے دائرے کی بھی بعض چیزیں اس شمارہ میں ملتی ہیں۔

یہ پرچہ کی ضخامت اور افادیت کو دیکھتے ہوئے قیمت بہت کم ہے اور یہ چیز اس کی مقبولیت کی ضامن ہے۔

اگست ۵۹ء

ماہنامہ

الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

اس کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور یہی ایمان کا جوہر ہے، دراصل یہ

ایک شہادت، ایک اقرار اور ایک اہم فیصلہ ہے

اس بات کا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت و بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کی بھیجی ہوئی

ہدایت پر چلیں گے اور مریں گے

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی عہد کے مطابق گزاریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق [illegible] ہم اس کا

کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں

زندگی کو دنیا میں ... اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

عہد کرتے ہیں اسی کی دعوت دیتے ہیں

فاطر السموات والارض انت ولی فی الدنیا والآخرة

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارۂ الفرقان

مسئول

محمد منظور نعمانی

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

الفرقان لکھنؤ

ماہنامہ

فی کاپی ... آٹھ آنے

ہندوستان پاکستان سے
سالانہ چندہ (بسکۂ ہندوستان) ۶/
سالانہ چندہ (بسکۂ پاکستان) ۷/
ششماہی ... ۳/

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ۱۰ شلنگ
۱۹۶۰ء از زی خریداروں سے
سالانہ ... ۱۵/

جلد ۲۷ | بابت محرم الحرام ۱۳۷۹ھ مطابق جولائی ۱۹۵۹ء | شمارہ ۱

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ وی پی میں آپ کے کچھ آنے نا حق صرف ہوں گے
چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ اگست تک پہنچ جانی چاہیے

پاکستان کے خریدار — اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ، اسٹریلین بلڈنگ، لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

تاریخ اشاعت — رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۷ کو روانہ کر دیا جاتا ہے اگر ۱۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ ان کی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

افتتاحِ جلد بست و ہفتم

باسم اللہِ الذی لم یزل ولایزال حیّاً قیوما
لہٗ الملک ولہُ الحمد وھو علیٰ کلِّ شیٍٔ قدیر
ونُصلّی علیٰ رسولہ خاتم النبیین محمدٍ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ
اجمعین

جس حیّ وقیوم نے زمین وآسمان کو تھام رکھا ہے، زمین وآسمان کی وسعتوں میں اور سب کچھ بھی اُسی کے تھامے تھما ہوا ہے۔ آفتاب کا یہ عظیم کرہ ہو یا خاک کا کوئی حقیر ذرّہ، دونوں کا وجود بھی اُسی کے امر "کُن" کا نتیجہ اور دونوں کی بقا بھی ہر لحظہ اُسی کی مشیئت سے وابستہ! ـــــ انسانی مصنوعات و اختراعات کا معاملہ بھی چنداں جُدا نہیں ہے۔ جب تک "اس" کا ارادہ ہم آہنگ نہ ہو نہ انسانی فکر وعمل سے کوئی شیٔ وجود میں آسکتی ہے اور نہ اسکی بقا کا انتظام ہی اسکے بس کی بات ہے۔ انسانی فکر وعمل کا تراشا ہوا یہ کاغذی وجود جو ہر ماہ "الفرقان" کے نام سے منصّۂ شہود پر آتا ہے، اسی کارسازِ مطلق کا ارادہ تھا جو اُسے وجود میں لایا اور اُسی کی نظرِ کرم ہے جو چوتھائی صدی سے بھی اوپر سے اُسے تھامے ہوئے ہے۔

اسی کے نام سے آج ستائیسویں سال کی ابتدا ہو رہی ہے۔

ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں
مری انتہائے نگارش یہی ہے

سب سے بڑا سانحہ

آنریبل گورنر یو' پی شری وی وی گری نے روٹری کلب (میرٹھ) کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ

" آخری جنگ عظیم کے بعد ایک سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ سچائی اور دیانت داری کا جذبہ ختم ہوگیا ہے ـــــ لوگوں میں ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان کا حشر کیا ہوگا " (قومی آواز ، ۲۲ر جولائی ۱۹۵۹ء)

اے عشق مرحبا' وہ یہاں تک تو آ گئے !

بات یہی ہے کہ سب کچھ کیجے جائیے ۔ پنج سالہ منصوبوں پر منصوبے بنائے جائیے' اربوں روپیہ ان منصوبوں پر خرچ کیجے جائیے ۔ نئے نئے اور بڑے بڑے کارخانے کھولیے ۔ کوآپریٹو کھیتی کی اسکیمیں لائیے ۔ "پل بنا ' چاہ بنا " کے وظائف پڑھیئے ۔ جمہوریت کا راگ الاپئے ۔ عوامی معیار زندگی کو بلند تر بنانے کے لیے زمین سے آسمان تک اڑ دیے ! لیکن اگر ہندوستان کے عوام خواص میں سچائی اور دیانت داری کے اوصاف نہیں پیدا ہوتے تو ہر دُور اندیش اور حقیقت شناس ان " فیض کے اسباب " کے باوجود یہی کہنے پر مجبور ہوگا کہ

نہیں معلوم ہندوستان کا حشر کیا ہوگا !

کس قدر تشویش انگیز صورت حال ہے کہ ہندوستان کا معیار اخلاق روز بروز گرتا جا رہا ہے ۔ مگر باتیں ہیں تو ہر دم بس " معیار زندگی " کو بلند کرنے کی ! اخلاقی معیار کو بلند کرنے کی ! ملک کے دروبست پر قابض ہونے والوں میں سے' خال ہی خال کوئی آواز اٹھتی ہے' اور وہ بھی ایسی جیسے " نقار خانے میں طوطی کی صدا "!

دوسری طرف یہ بھی بڑا سانحہ ہے کہ جن مشرقی ملکوں میں سچائی اور دیانت داری کا قابل رشک سرمایہ پایا جاتا ہے' وہاں اس سرمائے سے کوئی بڑا کام نہیں لیا جارہا ہے' اور صرف روزمرہ کی محدود سی زندگی میں یہ سرمایہ کام آرہا ہے ۔ سرزمین پاک (حجاز) سے ہر سال حجاج کے ذریعہ کچھ خوش کن خبریں مل جاتی ہیں ۔ امسال بھی نہایت معتبر حجاج سے یہ ایک واقعہ سننے میں آیا ہے' کہ ایک عرب تاجر کی دوکان سے دس لاکھ مال کی چوری ہوئی ۔ ملزم عین حجاز کی سرحد پر گرفتار کیا گیا ۔ گرفتار کرنے والا صرف ایک

کانسٹبل تھا۔ تیسرا ان دونوں کے درمیان کوئی نہ تھا، ملزم نے رشوت کی پیش کش کرنی شروع کی، اور آخر میں بات پورے کے پورے دس لاکھ پر پہنچ گئی۔ مگر اُس عرب سپاہی کی دیانت کو یہ دس لاکھ کی مار سوت بھر بھی ادھر سے اُدھر نہ کر سکی۔ اور اُس نے ملزم کو لے جا کر قاضی کے سامنے پیش کر دیا ــــــ یہ واقعہ اتنا مصدقہ ہے کہ ملزم چونکہ (ہماری بدقسمتی سے) ہندوستانی تھا اس لیے اس کی رپورٹ حکومت ہند کو بھی مل چکی ہے۔

اہل حجاز کی دیانت داری صرف پولس ہی تک محدود نہیں ہے کہ ڈسپلن کا نتیجہ سمجھ لیا جائے۔ وہاں باہمی، بلکہ آفاقیوں کے ساتھ بھی، اعتماد کی جو فضا ہر دیکھنے والے کو نظر آتی ہے اور ہم ہندوستان و پاکستان والوں کو تو خصوصاً محوِ حیرت کر دیتی ہے۔ وہ صرف اسی سچائی اور دیانت داری کا نتیجہ ہے جس کی بنا پر کسی کو ایک دوسرے کے متعلق دغدغہ نہیں ہوتا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ عظیم و نایاب سرمایہ بھی ہے اور قومی دولت کے وسائل و ذخائر کی بھی کوئی انتہا سر زمین پاک میں نہیں۔ لیکن ان دو سرمایوں کے ملنے سے جو ترقیاتی کام مملکت میں ہو سکتے تھے اُن کے خانے میں اب تک صفر ہی صفر نظر آتا ہے۔

پہلی سالگرہ کا تحفہ

بغداد کی خبر ہے کہ

"اس ہفتہ یہاں مسلمان لڑکیوں نے پردہ ترک کر کے مردوں کی برابری کا اعلان کر دیا ہے ــــــ عراق پانچ روز سے ۱۴ رجولائی کے انقلاب کی سالگرہ پر خوشیاں منا رہا ہے اس دوران لڑکیوں نے انقلاب کی خوشی میں بغیر کسی جھجک کے رقص کیا۔"

(قومی آواز ۲۰ رجولائی)

اسکے مقابلے میں ایک خبر یہ ہے کہ

"نیو یارک (امریکہ) میں ــــــ طلبا کی طرف سے دیے گئے ایک خیر مقدمی جلسہ میں ڈاکٹر رادھا کرشنن (نائب صدر جمہوریہ ہند) نے تین ہندوستانی رقاصوں کو ناچنے اور گانے کی دعوت دی۔ ہندوستان کے مستقل مندوب مسٹر

سی' ایس' جھا اور قونصل جنرل مسٹر گوپالامینن نے لڑکیوں کو بڑھاوا دیا لیکن کسی لڑکی نے جرأت نہیں دکھلائی۔

اس کے بعد نائب صدر نے لڑکیوں کی ہمت بندھائی اور کہا کہ ناچنا گانا ہندوستان کی روایات کا جزو ہے۔ آپ لوگوں کو اپنی میراث نہ چھوڑنا چاہیے۔ بڑی مشکل سے کچھ لڑکیاں گانے پر آمادہ ہوئیں۔ لیکن ناچنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوئی"۔

(ایضاً ۱۹ جولائی)

کہیے اس پر کیا تبصرہ کیا جائے ــــــ ایک قوم کے یہاں ناچنے گانے کی کوئی جگہ نہیں' اور پردہ اس کی روایات کا عظیم جزو ہے۔ مگر وہاں انقلاب کی سالگرہ کی خوشی کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک رقص نہ فرمایا جائے اور پردے کی روایات کو تار تار نہ کر دیا جائے۔ دوسری طرف ناچنا گانا ایک قوم کی عظیم میراث ہے' مگر اس کی لڑکیاں بلادِ رقص و سرود میں رہتے ہوئے اس روایت سے شرما رہی ہیں۔ اُن کے ملک کا نائب صدر فرمائش کرتا ہے' قونصل جنرل بڑھاوا دیتا ہے مگر وہ بصد شرم گانے سے آگے جانے کو تیار نہیں ہوتیں ــــــ یا مظہر العجائب !!

سچ ہے کہ اسلام کو اب ایک نئی قوم کی ضرورت ہے! ــــــ دیکھیے یہ سعادت کس کی طرف جاتی ہے؟ لیکن یہ ہونا بہرحال ہے۔ قرآن کا واشگاف اعلان ہے:

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ	اگر تم پھر گئے تو خدا (اپنے دین کے لیے) تم سے کسی اور قوم کو بدل دے گا اور پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے

(محمد - ع ۴)

اور کہیں کہیں کچھ ظاہری آثار بھی نظر آ رہے ہیں ــــــ مگر یہ ہوگا بڑا حسرتناک واقعہ کہ اسلام کی گود میں پلے ہوئے الحاد کو گلے لگائیں' اور کوئی پروردۂ کفر اُٹھ کر اسلام کی آنکھ کا تارا بنے۔

وسیع نقطۂ نظر

یو، پی کے وزیر اعلیٰ شری سمپورنا نند نے ریاست کی "سماجی فلاح تخمینہ کمیٹی" کی افتتاحی تقریر میں ناجائز بچوں کے مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

> "ناجائز اولاد کا ایسا کوئی مسئلہ پرانے ہند و سماج میں نہیں تھا۔ اس لئے قدیم سماج میں آٹھ قسم کی شادیاں تسلیم کی جاتی تھیں ——— قدیم ہند و سماج کے اس وسیع نقطۂ نظر کے نتیجے میں ہر بچہ جائز اولاد قرار دیا جاتا تھا، کیونکہ وہ اپنے والدین کی خطاؤں کے لئے مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔"

موصوف نے یہ بھی خیال ظاہر فرمایا کہ

> "سماجی نقطۂ نظر میں انقلاب لانا، سماجی فلاح کا اتنا ہی اہم جزو ہے جتنا کہ معذور اور بدنصیب اشخاص کی امداد کرنا۔"

(قومی آواز۔ ۲۳ جولائی)

جہاں تک بچے کے بے گناہ اور معصوم ہونے کا تعلق ہے، صحیح بات ہے۔ اور اس سماجی نقطۂ نظر میں بے شک تبدیلی ہونا چاہیے جس کے تحت ناجائز بچوں کے ساتھ بھی خطاوار کا سا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مگر نقطۂ نظر کی یہ وسعت اگر مطلوب ہے کہ اس طرح کی ولادتوں کو سند جواز بھی دے دی جائے تو یہ نقطۂ نظر سماج کی بہبودی کا نہیں "خرابیٔ بسیار" کا حامل ہوگا۔ ناجائز طور پر جو بچے وجود میں آجاتے ہیں اُن کی زندگی کا حل ضرور نکالنا چاہیے۔ اور سماجی نقطۂ نظر میں ایسی اصلاح کرنی چاہیے کہ ان بے گناہوں کی زندگی اجیرن نہ ہو۔ لیکن ایسا حل کہ جس سے ان بچوں کے "ماں باپ" کی خطاکاری بھی جائز ہو جائے کسی سماج کی طرف سے اس بات کا اعلان ہے کہ وہ ان خطاکاریوں کو روکنے سے قاصر ہے! ——— اسلام نے بھی اس طرح کے بچوں کو پوری انسانی عزت کے ساتھ سماج میں جگہ دینے کی تلقین کی ہے۔ مگر اُس میں یہ قوت تھی کہ وہ ناجائز تعلقات کو روک سکے، اس لئے اُس نے بلا تامل ان چاروں قسم کی "شادیوں" کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھیں، اور جن کے خوبصورت نام کے ذریعے قبل اسلام کا عرب سماج ناجائز تعلقات کے بارے میں اپنی بے بسی کو چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔

اور صرف ایک طریقہ مقرر کیا۔ اسلام نے مؤثر عقائد و اعمال اور معاشرتی ضابطوں کا ایسا حصار انسان کے گرد کھینچا کہ اگر کسی سے بھولے بھٹکے یہ جرم سرزد ہو بھی گیا تو اس نے خود کو باصرار سزا دلوانے کا وہ رویہ اختیار کیا جو بجائے خود معاشرے میں زنا سے نفرت کا ایک عظیم نفسیاتی محرک اور ایسا خاموش مبلغ کہلانے کا مستحق ہے، جس کے سامنے سیکڑوں تدبیریں اور تقریریں ہیچ ہوں۔

افسوس! تاریخ کا ایسا کھلا تجربہ سامنے ہوتے ہوئے بھی لوگ یہ سوچنا نہیں چاہتے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے، وہ جو کچھ سوچ سکتے ہیں بس یہ کہ آج جو جنسی انارکی اور آوارگی ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے کس فلسفے کی رو سے اُسے جائز کر کے اپنے ذہن کو اس جنجال سے نکال لیں ــــ مگر اس میں ذمہ داری حال کے مسلمان معاشرہ کی بھی کم نہیں ہے۔ کاش اس چیز کو ایک گزشتہ تجربہ کہہ کر ماضی کی طرف اشارہ نہ کرنا پڑتا، بلکہ حال میں بچشم خود مشاہدے کی دعوت دی جا سکتی تو شاید آج کے انسان کو اپنے مسائل کی تلاش میں اس طرح بھٹکنا نہ پڑتا۔

تنگیٔ نظر!! ایک طرف ہمارے وزیر اعلیٰ کی وسعتِ نظر کا یہ عالم ہے کہ وہ ناجائز بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک ہی پر راضی نہیں بلکہ ناجائز ولادتوں کو بھی جائز تسلیم کرانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہ تنگی نظر کہ اُردو جو مادرِ ہند کی مصدقہ طور پر جائز اولاد ہے اُس کے دو چار حرف بھی ان کے اقتدار میں اس طرح دھکے کھاتے ہیں کہ سماج میں ناجائز بچے کیا وہ دھکے کھاتے ہوں گے۔

اس سے اشارہ اُس کشاکش کی طرف ہے جو یو، پی کے ایوان بالا کے اپوزیشن لیڈر اور ایوان کے سرکاری افسران کے درمیان، حال ہی میں بڑی شدّت کے ساتھ اس مسئلے پر برپا رہی ہے کہ آیا مخالف لیڈر (اپنے نام کا) اُردو سائن بورڈ بھی اُس کمرے پر لگا سکتا ہے جو اُسے کونسل ہاؤس میں سرکار کی طرف سے ملا ہوا ہے! اخبارات نے انکشاف کیا ہے کہ مخالف لیڈر نے یو، پی لیجیلیٹو کونسل کے افسران سے اس کی خواہش کی کہ اُن کے سائن بورڈ پر ہندی اور انگریزی کے ساتھ ایک طرف اُردو بھی لکھوا دی جائے۔ جس کی تعمیل نہ ہونے پر لیڈر مذکور نے اپنی طرف سے اُردو سائن بورڈ تیار کرا کر آویزاں کر لیا۔ لیکن افسران مذکور نے اُسے دیکھتے ہی ہٹا دیا اس پر ذمہ داروں سے رجوع کرنے پر مخالف لیڈر کو یہ جواب ملا کہ

" حکومت یو، پی کا حکم ہے کہ سرکاری دفتروں اور سرکاری عمارتوں پر سوائے ہندی کے کسی اور زبان میں سائن بورڈ نہ لگایا جائے ! "

اس کے بعد کشاکش بایں جا رسید کہ مخالف لیڈر نے ایک تاریخ مقرر کرکے نوٹس دیا کہ اگر اس تاریخ تک اُن کی خواہش کی تعمیل نہ ہوئی تو وہ خود اپنی مرضی کا سائن بورڈ لگائیں گے، اور اُس کو قائم رکھنے کی ذمہ داری لیں گے۔ تب کہیں جاکر ہمارے وسیع النظر وزیر اعلیٰ کی حکومت میں یہ " وسعتِ نظر " پیدا ہوئی ہے کہ اُردو کا سائن بورڈ جو ہٹا لیا گیا تھا وہ لاکر مخالف لیڈر کے کمرے پر آویزاں کر دیا گیا۔

ہائے اُردو ! جو ناجائز اولاد سے بھی گئی گزری ہو گئی۔ اور اُس کے چار لفظ بھی اُس وقت تک ناقابل برداشت ہیں جب تک کوئی سخت قسم کا والی وارث دھمکی سے نہ بات کرے۔

آپس ہی میں !

خبر ہے کہ

" جون پور میں ایک تعزیے کے راستے کے مسئلے پر شیعہ سُنیوں میں جھگڑا ہوا، اور پولیس کو مداخلت کرنا پڑی "

(قومی آواز ۲۳ / جولائی)

بریں عقل و دانش بباید گریست

آج بھی شیعہ سُنیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو آپس ہی میں سر پھٹول کریں ؟ کیا باہر سے اُنھیں بالکل اطمینان حاصل ہے کہ خانہ جنگی سوجھنے لگی ؟

جوڑے کی رسم

حیدرآباد دکن سے ہمیں ایک لمبا چوڑا مضمون " جوڑے کی رسم " سے متعلق اس بنیاد پر موصول ہوا ہے کہ اس میں بعض دوسروں کے ساتھ، تبلیغی جماعت کو بھی ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔ مضمون بھیجنے والی ایک خاتون ہیں اُنھوں نے ہمیں لکھا ہے کہ ہم اگر ایماندار ہیں تو اس مضمون کو بے کم و کاست ' الفرقان ' میں

شائع کریں۔

مضمون اگر سنجیدگی اور شائستگی کے تقاضوں سے گرا ہوا نہ ہوتا اور اس طول وعرض کا نہ ہوتا کہ الفرقان کے قریب قریب دو نمبر اس میں سما جائیں تو ہم ضرور اس کی اشاعت پر غور کرتے۔ موجودہ صورت میں افسوس ہے کہ وہ بالکل قابل غور بھی نہیں ہے ــــ البتہ اس میں جوڑے کی رسم کی جو حقیقت بتائی گئی ہے (جو بہار کی تلک کی رسم سے ملتی جلتی ہے[1]) اس کی بنا پر ہمارے لیے یہ کہنا ضروری ہے کہ اگر اس رسم کی حقیقت یہی ہے تو کوئی شبہہ نہیں کہ شریعت کے، شریعت کے مزاج کے اور اسلام کے ظاہری اور باطنی تقاضوں کے بالکل خلاف ہو۔ اور وہ لوگ جو قولاً یا عملاً اس کی تائید کرتے ہیں، خواہ تبلیغی جماعت کے ہوں یا جماعت اسلامی کے یا کسی اور حلقے کے، وہ یقیناً سخت مجرم اور خاطی ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تبلیغی جماعت یا جماعتِ اسلامی سے گہری اور ذمہ دارانہ وابستگی رکھنے والے کس طرح ایک ایسی قبیح رسم کی تائید کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ میں ایسا ہے اور اس رسم کی حقیقت بھی کم وبیش وہی ہے جو اس مضمون میں بیان کی گئی ہے، تو یہ ان لوگوں کی زندگی کا بڑا افسوسناک تضاد ہے۔ اور اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

---

[1] اس رسم کی تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ شادی میں لڑکے والے لڑکی والوں پر مطالبات کا غیر معمولی بار ڈالتے ہیں اور بالفاظ دیگر نہایت ذلیل قسم کی سودے بازی کرتے ہیں۔

ماہنامہ پیام مشرق لاہور کے متعلق

زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حضرت علامہ قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی رائے

ماہنامہ پیام مشرق پاکستان کا علمی مذہبی اور دینی رسالہ ہے جو ایک عرصہ سے مسلمانوں کی اصلاحی اور دینی خدمات انجام دے رہا ہے، وقت کے تقاضوں کے مطابق موزوں اور برمحل عنوانات پر سیر بحث کرنا پیام مشرق کا خاص موضوع اور کامیاب موضوع ہے، مضامین معیاری اور محققانہ ہوتے ہیں جس سے دلوں کے خلجانات رفع ہوتے ہیں، آج کے دور میں مسلمانوں کی فکری اص کے لیے ایسے ہی رسائل کی ضرورت ہے۔

دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس رسالہ کو قبول فرما کر مسلمانوں کے لیے نافع فرمائے۔ والسلام

محمد طیب غفرلہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند ۔ ۲۱ شوال ۱۳۷۸ھ

اشتہار کی تمام تر ذمہ داری مشتہر حضرات پر ہے۔ ——— (ادارۂ الفرقان)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

اندازِ فکر میں انقلاب کی ضرورت

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ ———— مترجمہ مولوی احسان الحق صاحب سنبھلی ندوی

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

اس وقت ہم مسلمانانِ عالم "امتِ مسلمہ" کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں اور اس کو جس ...رسے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں وہ فکر و نظر کا ایک افسوس ناک انقلاب ہے، ایک طویل عرصہ ...ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ امتِ مسلمہ اس سے زیادہ کچھ حیثیت و حقیقت نہیں رکھتی کہ وہ دنیا کے ...بہت سے انسانی مجموعوں میں سے ایک مجموعہ ہو جو اس ربعِ مسکون کے مختلف حصوں میں تقسیم ہو، مختلف ...وں اور مختلف گوشوں میں پھیلا ہوا ہو، اس میں مختلف قوموں، نسلوں اور ملکوں کے لوگ شامل ہیں ...لف زبانیں بولنے والے اور مختلف مقامی معاشرت و معیشت رکھنے والے اس کے حلقۂ منتسبین ...ں ہیں، جگہ جگہ اس کے گرد و پیش مخصوص مقامی حالات و مخصوص ماحول ہے، اس کی طاقتیں اور ...لاحیتیں اور اس کے مادی وسائل و ذرائع ہر جگہ محدود ہیں ———— اس کی ان مختلف در مختلف ...ہوں اور حصوں میں قدرِ مشترک دو ———— اور صرف دو ———— مسلم بنیادیں اور حقیقتیں ...ایک "عقیدہ کی وحدت" دوسری "مغرب کی دریوزہ گری اور مرعوبیت" اور ...ت و معیشت میں اس پر کلی انحصار و اعتماد"!

دنیا کے نقشہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اپنی ذات اور اپنی قیمت و حیثیت کا اندازہ

...مون دمشق کے بین الاقوامی اسلامی رسالہ "المسلمون" کے افتتاحیہ کے طور پر حال ہی میں لکھا گیا۔

ہم انھیں طاقتوں اور انھیں مادی وسائل و امکانات ——— مواد خام، ملکی آمدنی و تحصیل، تعدادِ نفوس اور فوجی طاقت و قوت ——— کی بنیادوں پر کرتے ہیں، اسی میزان و معیار پر ہم اپنے کو تولتے ناپتے ہیں، اور فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں ملک و مقام پر ہم کچھ قوی ہیں، ہمارا پلہ بھاری ہے اور فلاں ملک و مقام میں ہلکا، بعض وقت ہم کو اپنا وجود بالکل بے وزن نظر آنے لگتا ہے اور بعض حالات میں ہم اپنے کو موثر اور وزنی محسوس کرنے لگتے ہیں، بحیثیت مجموعی ہم اپنی کوئی خاص طاقت و قیمت نہیں پاتے۔

ہم نے آج مغرب کی امامت و پیشوائی کو ایک ناگزیر اور لابدی شے سمجھ لیا ہے، اس پر اس طرح ایمان لے آئے ہیں جیسے اس میں کسی تغیر و تبدیلی کا امکان ہی نہیں، تاریخ اسلام میں ایک وقت آیا تھا جب مسلمانوں کی زبانوں پر یہ فقرہ چڑھا ہوا تھا "اذا قیل لك ان التتر انھزموا فلا تصدق" (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو یقین مت کرنا)[له] مسلمانوں کی بدقسمتی سے یہی جملہ ایک دوسرے عنوان سے پھر مسلمانوں میں رائج ہوگیا ہے، اور اس کا عقیدہ و ایمان بنتا جا رہا ہے کہ مغرب ناقابلِ شکست ہے اور موجودہ حالات میں تبدیلی خارج از بحث ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم مغرب سے آنکھیں ملانے کا تصور تک نہیں کرسکتے اور اگر کبھی ہم اپنی "دانشمندی و دور اندیشی" اور علم و مطالعہ و تجربہ سے نظر بچا کر اس کی مخالفت کا تصور دل میں لاتے بھی ہیں تو ہم اپنے امکانات و وسائل اپنی مادی قوت و طاقت، عسکری صلاحیت اور جنگی انتظامات کا جائزہ لینے لگتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جدید ایجادات اور ایٹمی آلات حرب میں ہمارا کیا حصہ ہے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم پر یاس و حرماں نصیبی اور اپنی شومئ قسمت کا احساس طاری ہو جاتا ہے، ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم دنیا میں محض پستی اور ذلت و خواری ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، ہماری اپنی کوئی زندگی نہیں،

له ساتویں صدی ہجری میں جبکہ تاتاری عالم اسلام پر چھا گئے تھے اور اس سرے سے اس سرے تک ان سے مرعوبیت اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جملہ اسلامی معاشرے میں زبان زد خاص و عام تھا، اور تاریخ میں بالفاظہ منقول و ماثور ہے۔

ہم مغربی قوموں کے حاشیہ بردار اور دست نگر ہی بن کر زندگی گزار سکتے ہیں، زندگی کی اس دوڑ میں خود ہمارا کوئی حصہ نہیں، ہم دنیا کے اس اسٹیج پر کوئی اہم پارٹ ادا نہیں کر سکتے، ہماری قسمت میں یہی مقدر ہے کہ ہم مغرب کے دو "حریف خاندانوں" میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دیں اور اسکے رحم وکرم پر زندگی گزاریں۔

یہی انداز فکر ہے جو آج تمام عالم اسلام پر چھایا ہوا ہے، تمام مسلم اقوام وسلم ممالک اسکے شکار ہیں، کیا عرب، کیا عجم، ہر جگہ یہی ذہن کام کر رہا ہے، ممالک عربیہ سے لیکر پاکستان انڈونیشیا وترکی تک کے مسلمان اسی طرز پر سوچنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ہندوستان، چین، سیام، وبرما (جہاں مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں لیکن کثیر تعداد میں ہیں) اس سے آگے ایک حرف نہیں سوچتے، اسی انداز فکر کو اس وقت تمام اسلامی دنیا میں صحیح، دانشمندانہ اور عملی انداز فکر سمجھا جاتا ہے، اور یہی بلند سے بلند پرواز فکر ہے،

لیکن تاریخ عالم بتلاتی ہے کہ اسی عالم اسباب وعالم مادی میں ایک جماعت انسانی ایسی بھی پائی گئی ہے جو اس انداز فکر اور اس منطق واستدلال کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہی ہو۔ اس جماعت کا اپنا ایک مخصوص طریق فکر وطریق عمل ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اس جماعت کے افراد نے اپنے مقاصد میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کی ہے، دنیا کے تمام انقلابات میں اصلح وافضل، اعلیٰ ومفید تر انقلابات کا وجود انھیں کے دم سے ہوا، ان کے اس انداز فکر پر تاریخ کے ان قوی ترین وعظیم ترین انقلابات کی بنیاد ہے جنھوں نے دنیا کے مسلمات ومزعومات اور رسوم وقیود کو اس طرح بدل ڈالا ہے کہ عالم انگشت بدنداں رہ گیا ہے، یہ وہ انقلابات ہیں جنھوں نے ایک طویل مدت کی سیاہ بختی کے بعد دنیا کو آفتاب سعادت کا نور بخشا ہے، اور ایک وسیع ابتری۔ ایک عالمگیر فساد کے بعد معاشرہ انسانی کو طمانینت وراحت کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

تنہا یہی وہ طریق فکر ہے جس میں ان پسماندہ وشکست خوردہ، کمزور وبے سامان قوموں کے لیے نوید جانفزا ہے، جن کے پاس دنیا کے لئے کوئی صالح وصحیح دعوت وپیغام ہو۔

کوئی امت جن کا سرمایۂ امید اور منتہائے علم و نظر محض علم اسباب و خواص اشیاء ہی ہو، جو مادیات و محسوسات اور ساز و سامان اور اس کی کثرت و فراوانی ہی پر سارا دار و مدار و انحصار سمجھتی ہو، جس کا یقین ان اشیاء عالم و مادیات عالم سے آگے کسی چیز پر نہ ہو — اور پھر جس چیز پر اس کا یقین و ایمان ہے اس میں وہ دیوالیہ بھی ہو — تو اس کے لیے سوائے مایوسی و افسردگی اور نوحہ و ماتم کے اور کیا ہے؟ اس کی نا امیدی و یاس کا کیا ٹھکانا جب کے درد کی دوا موت کے سوا کچھ نہ ہو۔

منتظر رہنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

آپ سوال کریں گے کہ ایسی بھی کوئی جماعت ہو سکتی ہے جو اپنے گرد و پیش سے آنکھیں بند کر کے سوچ سکتی ہو؟ اور اگر ہو بھی سکتی ہے تو پھر وہ کامیاب و بامراد بھی ہو سکتی ہے؟ آپ اس کے لیے تاریخ کی کوئی مثال اور کوئی عملی نمونہ چاہیں گے، ذرا ماضی کے اوراق الٹیے، اور "صحف صادقہ" اور وحی آسمانی کی طرف کان لگائیے۔

سرزمین مصر پر ایک ظالم و جابر بادشاہ "فرمانروا" ہے، جس نے قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے، ان کے ساتھ جانوروں اور چوپایوں کا سا معاملہ کرتا ہے، ان کے اندر نہ کوئی حوصلہ اور امنگ ہے نہ کوئی ولولہ اور جوش، ان کا "حال" پریشاں مستقبل تاریک تعداد کے اعتبار سے ایک حقیر اقلیت، سامان کے لحاظ سے فقیر و بے بضاعت، اہمیت کے اعتبار سے حقیر و بے حیثیت، دشمن قاہر و زبردست، ظالم و بے درد، خود بیکس و بے بس، بے یار و مددگار، نہ دوست نہ غمخوار، نہ حامی نہ مددگار، ایک حتمی و یقینی انجام ہلاکت — آنکھوں کے سامنے، اور انجام سے پہلے جب تک زندہ ہیں بدبختی و بدنصیبی، مصیبت و کلفت زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور یہ ظالم نسل کشی پر آمادہ، اور قومی زندگی کے بقا و تسلسل کا دشمن ہے۔

اس خونی، بھیانک اور ہلاکت خیز ماحول میں موسیٰ پیدا ہوتے ہیں، فرعون جو بادشاہ وقت ہے، چاہتا ہے کہ موسیٰ پیدا نہ ہوں مگر وہ پیدا ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ زندہ نہ رہیں مگر وہ زندہ رہتے ہیں، لکڑی کے ایک سربمہر صندوق میں رہنا پڑتا ہے

مگر وہ وہاں بھی زندہ رہتے ہیں۔ نیل کی بے شعور دبے دردموجوں کے حوالے کردیئے جاتے ہیں مگر پھر بھی زندہ رہتے ہیں، حتیٰ کہ اللہ کی قدرت اپنا تماشہ دکھاتی ہے کہ وہ اپنے سب سے بڑے دشمن، خونی و وحشی جلاد کی گود اور اسکی حفاظت و نگرانی میں پلتے بڑھتے ہیں، دوربین، بیدار مغز پولیس کی عقابی نگاہوں سے وہ مستور و مخفی رہتے ہیں، پھر انکو مصر سے جلاوطن ہونا پڑتا ہے، مسافرت وکس مپرسی کی حالت میں ایک درخت کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں، لیکن اللہ ان کے لیے ایک باعزت وکریمانہ ضیافت کا انتظام کرتا ہے حتیٰ کہ اس اجنبیت وغربت میں ان کے لیے اسباب سکینت وطمانیت (لتسکنوا الیھا) بھی مہیا فرماتا ہے ـــــ پھر وقت آتا ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کو لے کر واپس ہوتے ہیں اثنائے راہ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے، راستہ بھیانک ویسنان ہے کہ اہلیہ محترمہ دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہیں، موسیٰؑ کو آگ کی تلاش ہوتی ہے، تاکہ بیوی رات کی اس ناقابل برداشت سردی میں کچھ تاپ کر آرام حاصل کرسکیں، لیکن یہاں قدرت الٰہی کچھ اور کرشمے دکھاتی ہے آگ کی تلاش کے نتیجہ میں انھیں وہ نور اور وہ روشنی حاصل ہوتی ہے جس سے سارے عالم کو منور وفیض یاب ہونا ہے، موسیٰؑ صرف ایک عورت کے لیے مدد و چارہ سازی چاہتے ہیں لیکن اللہ انھیں اس وقت کی تمام انسانیت کی چارہ سازی اور راماں راحت وسکینت عطا فرماتا ہے اور انھیں پیغمبری و رسالت کی دولت وعزت سے سرفراز فرماتا ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰؑ سے پوچھیے احوال	کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

موسیٰؑ فرعون کے پاس آتے ہیں، فرعون اپنی شان وشوکت اور اپنے نشۂ حکومت وسطوت میں سرشار ہے، اپنے روساء وانصار اور مصاحبین واہل دربار کے ساتھ سریر آرا ہے، یاد رہے کہ یہ وہ موسیٰ ہیں جن کی کل تک تلاش تھی، اور جن کے قتل و گرفتاری کے لیے فوج اور پولیس سرگرداں تھی، جرم ان پر ثابت ہوچکا ہے۔ اس جرم کے یہ جواب دہ اور مدعا علیہ ہیں، مزید یہ کہ زبان میں لکنت بھی ہے ـــــ ان کا پہلو اور موقف ہر اعتبار سے کمزور، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرعون، اسکے مصاحبین واہل دربار، ان کے پیغام و دعوت، انکے عقیدہ و ایمان اور اسکی صداقت وحقانیت پر ان کے بحث واستدلال اور

ان کے اظہار و اعلان پر غضبناک ہو جاتے ہیں، فرعون ساحران مصر کو موسیٰؑ کے مقابلہ کے لئے بلاتا ہے تاکہ ان کے زور و فن سے معجزات موسیٰ کا جواب دے اور ان کو بیکار و غیر مؤثر ثابت کرے کہ اس نے ان کو بھی ... ری کا کرتب اور جادو کا کھیل سمجھا تھا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی بالکل خلاف امید اور ظاہر اسباب کے برعکس موسیٰؑ ہی کا پلہ بھاری رکھتا ہے سارے کے سارے جادوگر دیکھتے ہی دیکھتے سپرانداز ہو جاتے ہیں، موسیٰؑ کی برتری تسلیم کر لیتے ہیں، اور زبان سے کہتے ہیں "امنا برب العالمین رب موسیٰ وھرون" (ہم ایمان لائے مالک دو جہاں پر، ہم ایمان لائے موسیٰؑ و ہارون کے رب پر) -

ابھی اور سنیئے، موسیٰ کو حکم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات سرزمین ظلم وجور سے نکال کر مقام امن و نجات کی طرف لے جاؤ، فرعون کو پتہ لگ جاتا ہے، وہ اور اسکی افواج پیچھے پیچھے ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی مصلحت و مشیت یوں نمودار ہوتی ہے کہ موسیٰؑ راستہ بھول جاتے ہیں اور بجائے شمال و مشرق کے عین شرق کی سمت روانہ ہوتے ہیں ــــ پیدہ ٔ سحر کے ساتھ ساتھ سمندر کی لہریں جھلملاتی نظر آئیں، سامنے لہریں لیتا ہوا سمندر تھا پیچھے مڑ کر دیکھا تو ظالم دشمن کی فوجوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا، بنو اسرائیل کی حالت چکی کے دو پاٹ کے درمیان حقیر و بےبس دانہ ہائے گندم کی تھی، کہ اللہ کی مدد ــــ وہی خلاف قیاس وخلاف اسباب وخلاف عقل وفہم مدد ــــ نمودار ہوتی ہے، سمندر پایاب ہو جاتا ہے، کئی جگہ سے پانی پھٹ جاتا ہے، سمندر پر خشکی کے راستے بن جاتے ہیں اور رہ رکا ہوا پانی بلند ٹیلوں اور عظیم دیواروں کی شکل میں کھڑا ہو جاتا ہے، موسیٰؑ اور ان کی قوم سمندر عبور کر لیتی ہے، فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ انھیں راستوں پر چل پڑتا ہے، لیکن سمندر کی پُرغضب موجیں فرعون اور اسکے پورے لشکر کو لقمۂ نہنگ بنا لیتی ہیں، اور ہمیشہ کے لیے وہ سب وہیں غرق ہو جاتے ہیں۔

آپنے دیکھا کہ کس طرح فرعون اور اسکی ساری کی ساری طاقتور، دولتمند اور اسباب و وسائل سے ہر طرح لیس و مسلح قوم ایک بے سروسامان، وبے ہتھیار قوم کے مقابلہ میں ہلاک ہو کر رہ گئی، اور بالآخر وہی مفلس وبے ساز وسامان قوم بنی اسرائیل زمین کی

مالک و مختار بنے۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا	اور وارث کیا ہم نے ان لوگوں کو جو
يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ	کمزور ہو رہے تھے اس زمین کے مشرق و
وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا	مغرب کا کہ جس میں ہم نے برکت رکھی ہے،
وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ	اور پورا ہوا تیرے رب کا اچھا وعدہ
عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا	بنی اسرائیل پر، اس بنا پر کہ وہ ٹھہرے
وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ	رہے، اور برباد کر دیا ہم نے وہ جو بنایا تھا
فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا	فرعون اور اس کی قوم نے اور وہ جو انگور
يَعْرِشُونَ۔	چڑھایا کرتے تھے چھتریوں پر۔

آپ ذرا غور کریں وہ کون سی طاقت ہے اور اس میں کیا راز ہے جس کی بنا پر موسیٰ نے اپنے ملک اور اپنے زمانے کی سب سے بڑی طاقت پر غلبہ حاصل کیا، اور بنی اسرائیل جیسی نہتی قوم نے اپنے کثیر التعداد اور کثیر الوسائل حریف پر فتح پائی۔ وہ کون سا ہتھیار ہے جس کو لے کر انھوں نے عظیم الشان اور زبردست دشمن کا مقابلہ کیا اور اسے زیر کیا، اور اپنے باغی دنیا پرست ماحول کو اپنے ہم مرضی اور تابع بنالیا۔

موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید میں آپ نے بارہا پڑھا ہوگا، ایک مرتبہ پھر اس نقطۂ نظر سے اور اس سوال کو سامنے رکھ کر پڑھ جائیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہتھیار جن کے ذریعہ موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کا مقابلہ کر سکے اور بنی اسرائیل غالب آگئے اور جن کی بدولت مصر اور "مشارق الارض ومغاربہا" کے وہ وارث و مالک بنے وہ صرف "ایمان" "اطاعت" اور "دعوت الی اللہ" کی طاقتیں ہیں، یہ ایمان اور یہ اطاعت گزاری اور جذبۂ دعوت اس پورے قصہ کی جان اور اس کا اصل عنوان ہے، یہ پیغمبرانہ ایمان اس وقت صاف عیاں ہوتا ہے جب حضرت موسیٰ فرعون اور اس کی قوم کو پیغام الٰہی پہونچاتے ہیں، یہ ایمان ہی کی طاقت تھی جس کی بنا پر موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سیاست اور شاطرانہ چالوں اور موشگافیوں سے پست نہیں ہوئے، اور بالآخر غالب آئے، وہ چاہتا ہے کہ موسیٰؑ کو ان کے اصل موضوع و مقصد سے ہٹا دے، اور ان کو دوسری

باتوں میں پھنسا لے، کبھی چاہتا ہے کہ اپنے مصاحبین و درباریوں کو ان کے خلاف بھڑکا دے، لیکن موسیٰ اپنی دعوت اور اپنے اصل پیغام پر جمے رہتے ہیں، اپنے راسخ یقین و ایمان و عقیدہ کو ایک لمحہ کے لئے نہیں بھولتے ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش اور تزلزل نہیں پیدا ہوتا، فرعون کہتا ہے "ما رب العالمین" تمام عالموں کا رب (جس کا بار بار تمھارے منھ سے تذکرہ سنتا ہوں) کون ہے؟ جواب دیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ کُنْتُمْ مُوْقِنِیْنَ! (وہ جو تمام آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں پیدا کرنے والا ہے، اگر تم یقین کرو) فرعون غصہ میں بھر جاتا ہے' چاہتا ہے کہ اہل مجلس بھی غصہ ہو جائیں، اپنے گرد والوں سے کہتا ہے "اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ" کیا سنتے نہیں ہو، لیکن موسیٰ اپنی بات چھوڑتے نہیں' فرماتے ہیں رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَائِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ (رب العالمین وہ ہے) جو تمھارا اور تمھارے اگلے باپ دادوں کا رب ہے، فرعون غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے اور جھنجھلا کر کہتا ہے اِنَّ رَسُوْلَکُمُ الَّذِیْ اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ یہ تمھارے لیے پیغام لے کر آنے والا مجنوں ہے، موسیٰ اب بھی اسکی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے، اور اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہیں' قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ کُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ـ فرمایا وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ انکے درمیان ہے اس کا پیدا کرنے والا ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو' (تو جانو)

اسکے بعد فرعون انتہائی سیاست سے کام لے کر ایک بہت خطرناک موضوع چھیڑتا ہے اور ایک بہت اشتعال انگیز سوال کرتا ہے، پوچھتا ہے مَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلیٰ ان گزشتہ لوگوں کی کیا کیفیت ہے؟ (ان کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے) لیکن موسیٰ اپنے پختہ اور قوی ایمان اور پیغمبرانہ حکمت عملی کی وجہ سے موقع کی نزاکت پر غالب آجاتے ہیں، جواب دیتے ہیں "عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتَابٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسیٰ۔ ان کی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہے' نہ بہکتا ہے میرا رب' نہ بھولتا ہے ــــ اور اتنا کہہ کر اپنی پہلی بات' اپنے معبود حقیقی اور خدائے بے ہمتا و لاثانی کی ثنا و تعریف میں پھر لگ جاتے ہیں، کہنے لگتے ہیں اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی۔ (میرا رب) وہ ہے جس نے بنایا تمھارے لیے زمین کو بچھونا، اور چلائیں تمھارے لیے اس میں راہیں'

اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی، پھر نکالے ہم نے اس میں سے مختلف قسم کے بہت سے سبزے۔

اس ایمان ویقین کا سب سے زیادہ کامل اور واضح ظہور اس وقت ہوتا ہے جبکہ موسیٰؑ اپنے سامنے موجیں مارتا ہوا سمندر دیکھتے ہیں، پیچھے دیکھتے ہیں تو دشمن کی فوج جوش غضب میں موجیں مار رہی ہے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، نہ ایک قدم آگے بڑھنے کی گنجائش، نہ ایک قدم پیچھے ہٹنے کی، وہ اور انکی ساری قوم گویا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان تھی جہاں پس کر ہلاک ہو جانے کے سوا کوئی صورت فرار نہیں، بنو اسرائیل کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے وحشت اور خوف و اضطراب میں واویلا کرتے ہیں" إِنَّا لَمُدْرَكُونَ " ہم تو فرعون کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہوئے"۔ لیکن موسیٰؑ ہیں کہ اپنی جگہ کوہ استقامت، ایک لمحہ کے لیے دل میں کوئی شبہ و اندیشہ نہیں ہوا، ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی حوصلہ مند اور پرامید ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ انکا اللہ اپنے بندے کا مددگار ہے، وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، پورے جزم و وثوق کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں۔" كَلَّا إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ " ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھ کو راستہ دے گا۔

آپ دیکھئے کہ ان حالات میں کہ جب بنی اسرائیل مصر میں ذلت و مشقت اور عسرت و فقر اور بدبختی و درماندگی کی زندگی گزار رہے ہیں ظلم و استبداد کی شقی ترین قسموں اور صورتوں کو جھیل رہے ہیں انکو کس بات کی ہدایت کی جاتی ہے؟ ان مصائب و آلام سے چھٹکارا پانے کے لیے ان کو کس چیز کا حکم دیا جاتا ہے؟ ان سے یہ نہیں کہا جاتا ـــــ اگرچہ عقل کی میزان میں اور آج کی دنیا میں یہی اس کا واحد حل ہے ـــــ کہ مادی اسباب اور ذرائع و وسائل پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دو، حتیٰ کہ فرعون اور اسکی قوم کے انتظامات اور ساز وسامان اور آلات و وسائل تمھارے سامنے ماند پڑ جائیں، تاکہ پھر اس پر غلبہ حاصل کر سکو، بلکہ ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کو پکارو، اسکی طرف متوجہ ہو اسکی قدرت، طاقت اور حاکمیت کا یقین پیدا کرو، اطاعت و فرمانبرداری کی شرط پر اسکی مدد و نصرت کے وعدے پر راسخ و کامل ایمان رکھو، اس پر بھروسہ و اعتماد کرو، اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو قوی کرو، یہاں تک کہ اللہ کی مدد کے مستحق ہو جاؤ، اور تمھارے اندر

نیابت الٰہی اور خلافت ارضی کی صلاحیت اور شان پیدا ہو جائے، اس قوت ہم اسکا خارجی ظہور بھی کر دیتے

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی مُوْسٰی وَاَخِیْهِ — اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی
اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ — کو کہ ٹھہراؤ اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر
بُیُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً — اور بناؤ اپنے گھر قبلہ کی طرف، اور قائم
وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ. (یونس ع ۹) — کرو نماز اور خوشخبری دے دو ایمان والوں کو۔

اطاعت و فرماں برداری کی مثال دیکھئے، آپ دیکھیں گے کہ حکم الٰہی کے سامنے سر جھکا دینے اور بے چون و چرا اور بسر و چشم بات مان لینے میں پیغمبر کس حد تک بڑھے ہوتے ہیں، حال یہ ہے کہ اچانک حکم ہوتا ہے "اذهب الی فرعون انه طغیٰ" (جاؤ فرعون کے پاس اس نے بہت سر اٹھایا ہے) اور یہ فرعون ہے کون، کس کے پاس جانے کا حکم ہو رہا ہے؟ بادشاہ وقت کے پاس، وہ بھی ایسا کہ جو غضب ناک اور جوش انتقام سے بھرا ہوا ہے، جس کی گرفت شیر کے چنگل سے کم نہیں، جس کے دبدبہ و سطوت کے سامنے کوئی چیز ٹھہرتی نہیں۔ اس فرعون کے سامنے اور ان ناموافق حالات میں موسیٰؑ کو اس کے پاس دعوت و پیغام لے جانے کا حکم دیا جا رہا ہے، لیکن موسیٰ جاتے ہیں، بلا توقف و تردد قصر شاہی کا رخ کرتے ہیں، اس بادشاہ کے دیوان خاص میں جاتے ہیں جو خدائی و ربوبیت کا دعویدار ہے، اور اس کو دعوت دیتے ہیں کہ اللہ واحد و قہار کی عبادت کرے، اسکو خدا مانے اور اسکے سامنے سر جھکائے، اور یہی نہیں کہ ایک دفعہ کہکر اور اعلان حق کر کے فرصت پا جائیں، موسیٰ علیہ السلام اپنی اس دعوت اور جد و جہد اور اپنے وعظ و ارشاد میں لگے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اللہ جو کہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ان کے اور ان کی قوم کے درمیان انصاف و حق کو فیصل فرما دیتا ہے،

آپنے دیکھ لیا کہ "ایمان و اعتماد" "اطاعت و فرمانبرداری" اور "دعوت الی اللہ" ہی وہ طاقت تھی کہ جس سے موسیٰؑ نے مشکلات زمانہ کا مقابلہ کیا اور جس کے ذریعہ اور جس کی بدولت سطح زمین کی سب سے بڑی شہنشاہی — اسی شہنشاہی پر کہ جو باعتبار تمدن سب سے زیادہ ترقی یافتہ باعتبار وسعت سب سے زیادہ وسیع، باعتبار اسباب و وسائل سب سے زیادہ غنی اور سرمایہ دار اور باعتبار شوکت و دبدبہ سب سے زیادہ عظیم و باہیبت تھی — فتح و غلبہ حاصل کیا۔

اگر موسیٰؑ آج کے مفکرین و قائدین کی طرح بنی اسرائیل کے صرف ایک مفکر و لیڈر ہوتے، اور اسی طرح سوچتے جس طرح آج کے "سیاست داں" زعماء سوچتے ہیں، اگر وہ ان اسباب و وسائل اور امکانات و مواقع کا جائزہ لیتے جو اس وقت انکی قوم کو حاصل تھے، اور ہر چیز کو واقعیت اور حکمت عملی کی ترازو سے تولتے ـــ اور دوسری طرف وہ لوازمات شاہی دیکھتے، تعداد و مقدار اور ساز و سامان دیکھتے، فرعون کی افواج اور آلات حرب دیکھتے، اسکی ثروت و دولت اور اموال دیکھتے ـــ اور کیا انھوں نے دیکھا نہ تھا؟ کیا ان چیزوں سے وہ واقف نہ تھے؟ جبکہ انکے مرکز، عین قصر شاہی میں انھوں نے پرورش پائی اور جوانی تک وہیں رہے، لیکن اسکے باوجود انکی نظر میں اسکی کوئی اہمیت نہ تھی، اور اس سب کو کسی شمار و قطار میں نہ لائے ـــ لیکن اگر وہ ایسا کرتے، اور ان چیزوں کو اہمیت دیتے اور نظروں میں لاتے، اور پھر ان چیزوں میں فرعون کی قوم سے اپنی قوم کا مقابلہ کرتے، تو کیا میزان "عقل" میں اور آج کے قانون سیاست میں انکے لیے یہ جائز ہوتا؟ اور ان کے لیے اس بات کا امکان اور گنجائش ہوتی کہ وہ فرعون کا مقابلہ کریں، اور اس سے وہ بات کہیں جو اسکے لئے سخت ناراضگی اور غیظ و غضب کا باعث بنے؟ آج کی "عقل سلیم" اور حکمت و سیاست اور فہم و فراست کی رو سے تو ضروری تھا کہ وہ اس جرأت بیجا کا تصور تک نہ کریں، بالکل طے شدہ اور یقینی راستہ انکے سامنے یہ تھا کہ اپنی اور اپنی قوم کی سابقہ قسمت و نصیب پر قانع و مطمئن ہو جائیں، اپنی قوم کی نشأۃ و ترقی و حریت و اقبال مندی اور سربلندی و شادمانی سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں، زمانے کے حالات سے متفق ہو جائیں، وقت کے دھارے پر بہتے رہیں اور اپنی قوم کو بھی تلقین کریں۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

نتیجہ یہ ہوتا کہ نہ ایمان کی ہوا چلتی، نہ صلاح و تقویٰ کے باغ لگتے، نہ اخلاق ہوتے نہ اعمال ہوتے، نہ شرافت ہوتی نہ انسانیت۔

لیکن یہ ہوتا کیسے، موسیٰؑ "قومی رہنما" نہیں تھے، خود انکی رہنمائی کی جاتی تھی، وہ نبی تھے، انکے سامنے اللہ کی ہدایتیں اور ان ہدایتوں پر عمل کرنے پر اسکی طرف سے نتائج و انعامات کے وعدے تھے، وہ ایک داعی اور اللہ کے دین کے مبلغ تھے، [illegible] دعوت

کا تھا، اور فکر و عمل کا یہی وہ طریقہ ہے جس نے بارہا تاریخ کے دھارے بدل دیے ہیں، یہ وہ طاقت ہے جس کی کرشمہ سازی سے عجائب و خوارق کا ظہور ہوا ہے، جس نے بارہا عقل و دانش کو دم بخود کر دیا ہے۔

رسولوں کے سردار، سید الانبیا، اور خاتم الرسل محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سب سے زیادہ مفصل اور واضح آپ کے سامنے ہے، اگر آپ نے بھی عام رہنماؤں کی طرح سوچا ہوتا، اور وہ اسباب و وسائل اور لوازمات و انتظامات کہ جو قریش کے پاس تھے آپ نظروں میں لاتے ــــــ اگر آپ نے وقت کی ان دو عظیم الشان شہنشاہیوں کی طرف نظر کی ہوتی، جنھوں نے اس وقت کے تمام آباد اور متمدن خطۂ زمین کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا، یعنی شہنشاہیت روم اور شہنشاہیت ایران، اور وہ تمام طاقتیں اور اختیارات و اقتدارات کہ جن سے وہ بہرہ مند تھے، آپ نظر میں لاتے، اور آپ ایسا کر سکتے تھے، بالخصوص جبکہ آپ انکی طاقت و قوت اور انکی وسعت مملکت سے واقف تھے، اور انکا پورا اندازہ رکھتے تھے، اور کیوں نہ رکھتے کہ آپ پیغمبرانہ فہم، ہوش و بیدار مغزی رکھتے تھے، لیکن پھر بھی آپ کی سیرت مبارکہ بتلاتی ہے کہ آپ نے بالکل ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دی، اگر آپ نے ایسا کیا ہوتا تو کیا میزان عقل اور قانون خرد میں یہ جرأت مناسب و معقول ہوتی کہ آپ تمام انسانیت کو اپنے پیغام کا مخاطب بنائیں، اور یہ کہ اس عہد کی دنیا کے دو مالک و خود مختار اور مغربی و مشرقی شہنشاہیوں کے دونوں سربراہوں کو یہ خط لکھیں کہ وہ اسلام کی دعوت قبول کریں، اگر آپ نے اس طرح سوچا ہوتا تو وہی صورت حال اور عالم کا وہی نقشہ جو اس وقت عالم پر چھایا ہوا تھا اور صدیوں سے چھایا ہوا تھا اب بھی قائم رہتا، اور شاید ہمیشہ کے لیے دنیا کی قسمت میں یہی صورت حال لکھ جاتی، اگر فتح و ظفر کا انحصار و دارومدار انھیں مادیات و وسائل پر آپ سمجھتے تو کب وہ دن آتا جب آپ پر ایمان لانے والی ایک مٹھی بھر جماعت اس قوت و طاقت اور سامان و وسائل کی مالک ہوتی جو ان دو عظیم شہنشاہیوں کی قوت و طاقت کا مقابلہ کر سکے؟ بلکہ نہیں آپ تو اس قوت و طاقت کو سوچتے جو ان سے بھی بڑھی ہوئی ہو، اور جو ان کو شکست دے سکے اور ان پر غلبہ حاصل کر سکے، اور اگر انھیں چیزوں پر دارومدار ہوتا تو کب تک آپ کے لئے واجب اور ضروری ہوتا کہ آپ انتظار فرماتے رہیں؟ پھر اس وقت

اس دنیا اور اس انسانیت کا کیا انجام ہوتا؟ یقیناً انسانیت کی قسمت پر مہر لگ گئی ہوتی، اور یاد رہے کہ یہ مہر پھر قیامت تک کبھی نہ ٹوٹتی، افق انسانیت پر صبح سعادت کا طلوع کبھی نہ ہو پاتا، اور انسانیت کی تاریخ موجودہ تاریخ کے بجائے کچھ اور ہوتی،

لیکن اللہ کو ابھی انسانیت کے ساتھ خیر مقصود تھی، اللہ نے آپ کو "رہنما" نہیں بلکہ رہنمائے راہ یافتہ اور ہادی مہدی بنایا تھا، آپ وہی کرتے تھے جو آپ کو حکم ملتا تھا آپ کو احکام و ہدایات اوپر سے ملتی تھیں، انھیں کا آپ اس عالم میں نفاذ فرماتے تھے، آپ کو ان احکام و ہدایات پر اعتماد کلی تھا، آپ ان کے نتائج اور ان پر اللہ کے وعدہ و انعامات پر اس طرح یقین رکھتے تھے، گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، آپ کا ایمان تھا کہ کمزور اللہ کی مدد و حمایت کے ساتھ بہت قوی ہوتا ہے، وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا، اور وہ قوی جس کے ساتھ اللہ کی مدد و حمایت نہ ہو انتہائی ضعیف ہے، وہ کسی کا بال بیکا نہیں کر سکتا، آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا کہ "ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ وعلی اللہ فلیتوکل المومنون" (اگر اللہ تمہارا مددگار ہو جائے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں اپنی مدد سے محروم کر دے تو کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اس کے بعد؟ اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے، آپ کو بتلایا جا چکا تھا کہ "کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ" (کتنی ہی قلیل التعداد جماعتیں غالب آئی ہیں اللہ کے حکم سے کثیر التعداد جماعتوں پر) آپ سے بڑھ کر ان وعدوں پر کہ جو اعتقاد و عمل صالح توحید، جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جد و جہد پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے ہیں، کون ایمان و یقین رکھنے والا اور ان پر کامل و راسخ اعتماد و ایمان کرنے والا ہو سکتا ہے، نتیجہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

"اَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم" کے تحت حتی الامکان تیاری و انتظام کے بعد آپ نے اور آپ کے سچے و صحیح جانشینوں نے ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لی، اور زمین و آسمان کا نقشہ بدل ڈالا، سیلابوں اور طوفانوں کے رخ پھیر دیئے، جس کی بدولت آج تک دنیا میں ایمان، توحید، حقانیت، صداقت، نیکی، اخلاق، محبت، شرافت اور انسانیت کی روشنی

وجود ہے۔

ہمارا یہ جو دنیا میں آئی ہوئی ہے یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

آپ کو غلط فہمی نہ ہو، جو شخص آپ سے یہ باتیں کر رہا ہے وہ ان لوگوں میں نہیں ہے جو اسباب و وسائل کے ترک و ابطال کی دعوت دیتے ہیں، اور ترکِ سعی اور تعطل کو "اعتماد و توکل" کہتے ہیں، میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو عالم خواب و خیال میں رہتے ہیں، جن کی باتوں کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، میں نے عالم اسلام کو اور ان قوموں اور حکومتوں کو کہ جنکے ہاتھ میں اس عالم کی زمام قیادت رہی ہے، انکی اس کوتاہی اور تقصیر پر ہمیشہ سخت ملامت کی ہے جو انھوں نے حربی و صنعتی تیاری کے سلسلہ میں برتی ہے، میں نے انکے اس تغافل اور عدم توجہی کو انسانیت کی شقاوت اور بدبختی اور اسکے ہدایت و تعمیر اور ترقی و اقبال مندی کے راستہ سے ہٹکر زوال و انہدام اور شقاوت و بدبختی کے راستہ پر پڑنے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب شمار کیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود مجھے اس طرز فکر سے شدید اختلاف ہے جو اس وقت تمام عالم اسلام کی عقلیت پر مسلط ہے، میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا کہ مختلف گوشہ ہائے عالم میں پھیلی ہوئی اسلامی جمعیتوں کو ایک جامد اور غیر متحرک بلکہ غیر ذی حیات انسانی بھیڑ سمجھا جائے، بالکل ویسے ہی جیسے کہ اس وقت عالم کے بقیہ تمام انسانی گلّے ہیں، جو بھیڑوں اور چوپایوں کے ریوڑ سے زیادہ کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں رکھتے، جن کے پاس دنیا کو دینے کے لیے کوئی پیغام اور کام کی بات نہیں، جن کے مقام اور جن کے اقتدار کا فیصلہ ہمیشہ صرف مادی ترقیوں اور وسائل و آلات کی فوقیت پر ہوتا ہے، یہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ "ازالۂ حیثیت عرفی" کے مرادف ہے کہ انکو اس عام انسانی ترازو پر تولا جائے' اور انکے اصل سرمایہ اور ان کی عظیم طاقت "ایمان باللہ" "اطاعت" اور "پیغام و دعوت کی روح" کو نظر انداز کر دیا جائے، اگر غیر مسلم اقوام انکو اس معیار سے تولتی ہیں تو وہ معذور ہیں کہ انکو اس روحانی و ایمانی طاقت کے سرچشمہ کا احساس و اندازہ نہیں، لیکن مسلمان خود انھیں اسی ترازو پر تولیں' یہ ان کے لیے بڑے شرم و عار کی بات ہے اور بڑے حسرت و ماتم کا مقام ہے۔

؎ مومناں با خوئے و بوئے کافراں   لا الٰہ گویاں و از خود منکراں

یہ بیشک صحیح ہے کہ ہم مادی ساز و سامان کے اعتبار سے فقیر ہیں، ہم کمزور و نہتے ہیں، علم و صناعت کی دوڑ میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں، سیاست اور اقتصادی حالت میں اور قوموں کو نہیں پہونچتے، ان چیزوں میں ہم میں اور اقوام مغرب میں صدیوں اور قرنوں کا فرق ہو گیا ہے ــــ اور بڑی حد تک یہ ضروری بھی ہے کہ یہ چیزیں ہمارے قائدین و زعمائے فکر و اہتمام کا موضوع بنیں، اور یہ باتیں خاصی توجہ و التفات کی مستحق ہیں ــــ لیکن اسکے ساتھ ساتھ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم اسکے بغیر بھی دنیا میں عظیم طاقت ہیں، ہمارا صرف وجود بڑی قیمت رکھتا ہے، ہمارے پاس وہ پیغام، وہ دعوت اور وہ دین ہے جو انسانیت کی غذا اور اسکی روح ہے، یہ وہ چیز ہے جس کے بغیر دنیا اس وقت ایک دردناک و المناک انجام کی طرف تیزی سے بڑھتی جارہی ہے اور روز بروز اس قعر ہلاکت سے قریب تر ہوتی جارہی ہے، اور قریب ہے کہ کسی دن یہ انجام ہلاکت انسانیت مجسم کو نگل جائے ــــ ہمارے پاس وہ ایمان و یقین ہے جو امانت و احساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے، جواب دہی اور باز پرس کا خوف پیدا کرتا ہے، نفس لوامہ پیدا کرتا ہے اچھے برے کی تمیز پیدا کرتا ہے اور صرف ذاتی و وقتی لذت و نفع کو اچھے برے کا معیار نہیں بننے دیتا، یہی وہ طاقت ہے جو کار خیر اور خدمت خلق کے جذبات دلوں میں پیدا کرتی ہے، اور اندر سے اسکے تقاضے اور داعیے پیدا ہوتے ہیں۔

آج کی متمدن دنیا کی وہ قومیں جن کو دنیا کی امامت و پیشوائی کا دعویٰ ہے اس طلسمی طاقت اور اس "کلید حیات" سے محروم ہیں، جنھیں ہم آج "سرمایہ دار" قومیں کہتے ہیں وہ اس سرمایۂ عظیم کے اعتبار سے دیوالیہ ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ یہ اسباب و وسائل اور آلات و اسلحہ، اور ساز و سامان و لوازمات آسائش ضائع ہیں ــــ صرف ضائع اور غیر مفید نہیں ــــ بلکہ وبال جان اور ہلاکت و بربادی کا ذریعہ بن رہے ہیں، اور ان کو موت کے شکنجے کی طرف لے جارہے ہیں، یورپ کو سخت ضرورت ہے کہ جلد از جلد اس آب حیات اور اس زندگی کو قبول کرلے، یہی وہ واحد نسخۂ شفا ہے جس سے اسکے مزمن و مہلک مرض سے شفا ہو سکتا ہے، ہم مسلمانان عالم مغرب کے ان علوم و فنون اور ان ایجادات و صناعات،

کے اتنے محتاج و ضرورت مند نہیں جتنا کہ پیغمبر ہمارے ایمان و یقین کا محتاج ہے، یہ ایمان ہی صالح معاشرہ کی اساس و بنیاد ہے۔ پھر اس ایمان و یقین کے بعد وہ قانون اور شریعت ہے جو آج بیسویں صدی کی تمام مشکلات اور پیچیدگیوں کا صحیح حل پیش کرتی ہے، یوں سمجھئے، صاف، واضح اور بلیغ الفاظ میں، کہ ہمارے پاس ایک پیغمبر کے وجود کی نعمت موجود ہے جو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، یہ ایمان و شریعت اسی کی امانتیں ہیں کہ جس کے ہم مسلمان حامل ہیں، اللہ کا فیصلہ ہے کہ اب قیامت تک تمام وہ لوگ جو اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی و خوشنودی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، انکو راستہ یہیں سے ملے گا، یہیں وہ نور ہے جو صراط مستقیم دکھاتا ہے، اور تاریکیوں اور گمراہیوں سے نکالکر منزل مقصود تک پہونچاتا ہے۔ سہ

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

مسلمان اپنا مقام پہچانیں، ہماری ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ ہم اس وقت حیران، سراسیمہ، اور سرگردان و آوارہ یورپ کو صحیح راستہ کی طرف بلائیں، اپنے دنیاوی فوائد، منافع، اور راحتوں اور لذتوں کو بالکل نظر انداز کر کے، انتہائی اخلاص و دلسوزی کے ساتھ، اور اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ یہی ہمارا منصب و مقام ہے، ہم ہی اس وقت عالم کی اصلاح و رہنمائی کی قوت و صلاحیت رکھتے ہیں، ہم ہی اسکے صحیح مبلغ و مصلح ہیں، اسکے نجات دہندہ ہیں، ہم ہیں جو اسکو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضامندی اور جنت حیات دوام کا راستہ دکھا سکتے ہیں، اور اسکو ان انعامات کی بشارت سنا سکتے ہیں، ہم ہی ہیں جو اسکو اللہ کی ناپسندیدگی اور اسکے عذاب، دوزخ و جہنم سے ڈرا سکتے ہیں، اور اس کو بچا سکتے ہیں سہ

افرنگ زخود بے خبرت کرد وگرنہ
اے بندۂ مومن! تو بشیری، تو نذیری

ہمیں اپنے ایمان و یقین کی اس عظیم طاقت سے کام لینا چاہیئے، ہمیں چاہیئے کہ ہم

قافلۂ انسانی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں، یہ کیا شومئ قسمت ہے کہ ایک عرصہ سے ہم گردِ کارواں بنے ہوئے ہیں، اس کہنہ دماغی کو ہم کب تک "عقل دور اندیشی" کہتے رہیں گے، اس معمورۂ عالم میں بہت سے گوشے ایسے ہیں جہاں فطرت سلیم کے خزانے مدفون ہیں، ایشیا، افریقہ، کے وسیع خطہ ہائے ارض ایسے ہیں جہاں زرخیز و شاداب ذہنوں پُر محبت و پُر خلوص دلوں اور طاقتور و صناع ہاتھوں کی کمی نہیں، ہمیں انکو دین و ایمان، زندگی کے حقیقی و نیک مقاصد اور کائنات کے افضل و برتر اصول و حقائق پہونچانا چاہیئے، آپ یقین کریں کہ یہ قومیں اس چیز کی پیاسی ہو رہی ہیں، اور آپکے انتظار میں ہیں ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

امید بہانتک کیجاتی ہے کہ ان کے ایمان قبول کر لینے کے بعد اور اسکو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اور اسکے دلوں میں اتر جانے کے بعد اور اس پیغام و دعوت اور مشن کو خود اپنا لینے کے بعد تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا، اور جس طرح عہد اول میں ایرانیوں ترکوں اور دیلمیوں کے ایمان لانے سے اور قرون وسطیٰ میں تاتاریوں اور مغلوں کے اسلام لانے سے تاریخ کے دھارے بدل گئے ہیں، آج بھی بدلیں گے۔

اس انقلاب کی بنیاد کیا ہے؟ اسکی بنیاد اپنے اندر کا فکری انقلاب ہے؟

دنیا توقف و تاخیر اپنا موجودہ انداز فکر بدل لیتا ہے، اور اس طرح پر سوچتا ہے جس طرح پیغمبر سوچتے ہیں، یہی انقلاب فکر باذن اللہ —— عالم میں انقلاب کا باعث ہوگا۔ اسکے بغیر دنیا کی کوئی طاقت عالم کو وحشت و درندگی، آدم کشی اور غارت گری کے گڑھے سے نہیں نکال سکتی، عرصہ سے بڑے بڑے عقلاء عالم تدبیریں کر کرکے عاجز آچکے ہیں، اسکے لئے تو "شان کلیمی" ہی درکار ہے ؎

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

ہمارا مرض اور علاج

(از ڈاکٹر محمد آصف صاحب قدوائی)

ہر قوم کی کچھ خصوصیتیں ہوتی ہیں، ان خصوصیتوں کا اس کی تاریخ کی تشکیل میں بڑا ہاتھ ہوتا ہے خاص کر جب کوئی آزمائش کی گھڑی اس پر آتی ہے ـــــ خواہ اس کا تعلق فتح و کامرانی کے لمحوں سے ہو یا شکست و نامرادی کے، یا اس کی کوئی اور شکل ہو ـــــ تو یہ اس کے حق میں بڑی حد تک فیصلہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس کا رُخ بلندی یا پستی کی طرف موڑ دیتی ہیں۔

مسلمانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حالات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں، ان کا معیاری اور مثالی دور تو بیشک انسانیت کا معیاری اور مثالی دور تھا جس میں انھوں نے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے اعلیٰ ترین انسانی جوہر دکھائے، لیکن اس کے بعد سے ان کی تاریخ اسی حقیقت کا مظہر ہے کہ ان کی قوت فکر ان کے احساس کی شدت کا ساتھ نہیں دے پاتی ہے۔ مثلاً عروج و اقتدار کے زمانے میں وہ اپنے پچھلے دنوں کو آناً فاناً فراموش کر بیٹھتے ہیں اور آرام طلبی اور عیش کوشی میں ایسا منہمک ہو جاتے ہیں گویا کہ وہ سدا سے اسی کے عادی چلے آ رہے ہیں، اور آئندہ کے بارہ میں کسی نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ اب نہ کبھی دھوپ ڈھلے گی، نہ شام ہو گی۔ ان کا نیر اقبال چمکتا ہی رہے گا حتیٰ کہ حال میں تیل کی دریافت نے جن عرب ممالک میں دولت کی خوب فراوانی کر دی ہے وہاں کے حالات دیکھ کر کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا ہے کہ یہی وہ علاقے ہیں جو محض پچیس تیس برس قبل اتنے افلاس زدہ تھے۔ اور نہ وہاں کے ذمہ دار طبقوں کو غالباً کبھی یہ خیال گزرتا ہے کہ تیل کے ذخیروں کی بہرحال ایک حد ہے، ایک دن آئے گا کہ تیل کے چشمے خشک ہو جائیں گے اور سونے کی چڑیا اُڑ جائے گی۔ اس لیے جو دولت اس وقت ان سے حاصل ہو رہی ہے اسے اسراف کی راہوں میں

کرنے کے بجائے ملک کی معیشت کو مضبوط بنانے اور مستقبل میں کام آنے والی زرعی و صنعتی ترقی کی مہموں کو روبکار لانے میں لگایا جائے تاکہ موجودہ کثرت زر بس چار دن کی چاندنی نہ ثابت ہو جس کے بعد پھر وہی اندھیری رات ہو۔ اسی طرح جب وہ ابتلا کے دور میں گرفتار ہوتے ہیں اور ان کی کشتی ڈگمگانے لگتی ہو تو وہ اپنے کو سنبھالنے اور بدلے ہوئے حالات کا سنجیدگی اور استقلال سے مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کے حوصلے یکبارگی پست پڑ جاتے ہیں، ہمت جواب دے جاتی ہو، خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہو یقین کی دولت جاتی رہتی ہو۔ نفع و نقصان کی تمیز مٹ جاتی ہو اور وہ یا تو گوشوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی میت پر خود ہی ماتم کرنے کو وقت سے انتقام لینے کی بہترین تدبیر سمجھ کر اسی میں اپنے کو مشغول کر لیتے ہیں یا سستی سرفروشی کے جنون میں مبتلا ہو کر ہنگامی چیزوں میں اپنی بچی کچی قوتیں برباد کرنے لگتے ہیں، چنانچہ یہ دیکھا گیا ہو کہ مسلمانوں پر بحیثیت ایک قوم کے جب بھی زوال آیا ہو تو اس کی رفتار بہت تیز ہوئی ہو اور اس کے بعد وہ ایسا نڈھال ہو گئے ہیں گویا کہ تاریخ میں ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ گر کر پھر اٹھ کھڑا ہونا ان کو نہیں آتا ہو۔ یہی حال عربوں کا ان سے اقتدار چھنتے ہی ہوا، یہی صورت اسپین میں پیش آئی، دولت عثمانیہ کے خاتمہ پر بھی ایسا ہی ہوا، ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہوا تو یہی صورت واقع ہوئی اور اب ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد پھر وہ اسی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

برطانوی راج قائم ہوا تو مسلمانوں کے حق میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان کے لیے یہ اپنے طرز کا پہلا تجربہ تھا، وہ آٹھ سو سال سے مسلسل حکومت کرتے چلے آ رہے تھے، تنزل اور محکومی سے واقف نہ تھے۔ ان کے برخلاف ہندو اپنے یہاں متعدد نشیب و فراز دیکھے ہوئے تھے، ان کو زمانے کے ساتھ چلنا آتا تھا، وہ وقت کے تقاضوں کو پہچانتے تھے اور ان کو پورا کرنے کا گر جانتے تھے، چنانچہ حالات بدلتے ہی انھوں نے اپنے اندر مناسب تبدیلیاں کر لیں اور ترقی کی راہ پر انگریزوں کے پیچھے پیچھے چلنے میں ان کو ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔ مسلمانوں کو اپنی برتری کا غرہ تھا۔ وہ انگریزوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، انھوں نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، اس کی ان کو بڑی سخت قیمت ادا کرنا پڑی۔ مگر انھوں نے پرواہ نہ کی، ان کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب ہندو ان سے بہت آگے نکل چکے تھے، اور یہ فاصلہ آخر تک قائم رہا۔

لیکن اب ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد جو سوالات سامنے آئے ہیں ان کا مقابلہ مسلمانوں کے لیے جتنا دشوار ہو رہا ہے اور وہ اس سلسلہ میں جس عام ذہنیت، نا عاقبت اندیشی، مغلوبیت، فکری انتشار اور قوتِ عمل کے فقدان کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس کا جواز بجز ان کے قومی مزاج کی اس کمزوری کے جس کا شروع میں تذکرہ کیا جا چکا ہے نہیں ہو سکتا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کے سامنے نہ کوئی سوچا سمجھا راستہ ہے اور نہ کوئی متعینہ منزل، نہ ان کا کوئی موقف ہے نہ تنظیم، نہ قیادت، ان کی حالت اس مسافر کی سی ہے جو کسی خطرناک ریگستان میں قافلہ سے الگ ہو گیا ہو وہ ہر سراب کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے ہیں، ایک بار دھوکا کھاتے ہیں، دوسری بار دھوکا کھانے کو فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ میں ان کی مشکل حل ہونے کے بجائے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان کے دل مایوس اور قویٰ شل ہوتے جاتے ہیں، ان کے ہم وطنوں کی نگاہوں میں ان کا بھرم مٹتا جاتا ہے اور خود ان کی نگاہوں میں بھی ان کے قومی وقار کی قیمت روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ خطرہ دو راہوں سے ہے، ایک راہ کا تعلق تعلیم، تہذیب اور معاشرت سے ہے، دوسری کا معاش اور اقتصاد سے۔

کسی قوم کا اس کے ماضی سے رابطہ تاریخی اور تمدنی روایتوں کے ذریعہ ہی قائم رہتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جو قوم اپنے ماضی سے کٹ کر الگ ہو جائے یا کاٹ کر الگ کر دی جائے اس کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا ہے، وہ اس درخت کے مانند ہو جاتی ہے جس کی جڑیں نیچے سے قطع کر دی گئی ہوں، ملک میں اس وقت جو نئی تعلیمی پالیسی رائج کی جا رہی ہے وہ اس پہلو سے مسلمانوں کے لیے سخت خطرناک ہے کیونکہ اس کا مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے تعلیمی وسائل اکثریت کی زبان اور کلچر کی تقویت و اشاعت کے لیے استعمال کیے جائیں تاکہ اقلیتوں کے ذہنوں کو آہستہ آہستہ موڑ کر ایک واحد تہذیبی نمونہ پر لایا جا سکے جو درحقیقت اکثریت کی تہذیب ہی کا نمونہ ہو۔ اس طرح صرف قومیت اور ریاست کو ہم معنی کرنے میں آسانی نہ ہوگی ــــ جو ہر رجعت پسند حکومت کا نصب العین ہوتا ہے۔ بلکہ اس تہذیبی احساسِ کمتری کا بھی مداوا ہو جائے گا جو صدیوں سے اکثریت کے جگر کا ناسور بنا ہوا ہے۔ تہذیبی احساسِ کمتری طاقت حاصل ہو جانے کے بعد عموماً تہذیبی جارحیت کا رنگ اختیار

رلیتا ہے، اور ہندستان کی وہ اقلیتیں جو ملکی کردار کے علاوہ کچھ اپنا انفرادی کردار بھی رکھتی ہیں مثلاً مسلمان، سکھ، اور اینگلو انڈین، آج کل اسی جارحیت کا شکار ہو رہی ہیں، ان اقلیتوں میں سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں کو ہے۔ کیونکہ سکھ ایک علیحدہ جماعت ہوتے ہوئے نسلی حیثیت کے سوا جذباتی اور تاریخی اعتبارات سے بھی ہندوؤں سے خاصہ قریب ہیں، اور اینگلو انڈین کی ایک تو تعداد بہت کم ہے جس کے باعث ان کو آسانی سے اُن کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے، نیز ان کی تنظیم کا مسئلہ بھی اس بنا پر کچھ دشوار نہیں ہے۔ اور دوسرے، تعلیمی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے ان کی عمومی سطح اکثریت کی عمومی سطح سے نمایاں طور پر بلند ہے۔ اس وجہ سے ان کا اکثریت میں ضم ہونا مشکل ہے۔

دوسرا سوال معاشی استحکام کا ہے۔ آزادی کے بعد سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت برابر گرتی جا رہی ہے، ان کی بہت بڑی تعداد بلا مبالغہ فقر و فاقہ کی زد میں آگئی ہے، شمالی ہند میں وہ ایک عرصے زمینداری اور سرکاری ملازمت کے سہارے جیتے چلے آ رہے تھے، عزت و فراغت کی زندگی بسر کرنے کے ان کے یہی دو سب سے اہم ذریعے تھے۔ زمینداری کے خاتمہ نے ان کی کمر توڑ دی، لاکھوں مسلمان زمیندار اور ان کے اتنے ہی متوسلین یکایک اپنے رزق کے واحد ذریعے سے محروم ہو گئے۔ ویسے زمینداریوں کے ختم ہونے سے ہندو، مسلمان دونوں طبقوں کو یکساں متاثر ہونا چاہیے تھا، لیکن چونکہ ہندو زمیندار عموماً کاشتکاری کا کام بھی کرتے تھے اور دیہاتوں میں لین دین کا کاروبار بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا اس لیے زمینداری کے انسداد سے ان کو نقصان تو پہنچا مگر [illegible] حالی کی نوبت نہ آئی۔ مسلمانوں میں جن کے پاس زمینداریاں تھیں وہ کاشتکاری کو ایک گھٹیا درجہ کا کام سمجھا کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کہیں کے نہ رہے۔ زمینداری ختم ہوتے ہی ایسے قوانین بنے کہ جو زمینیں نام کو خود کاشت تھیں اور فی الحقیقت دوسروں کو لگان یا بٹائی پر اٹھی ہوئی تھیں ان پر ان کا کوئی اختیار نہ رہ گیا۔ اب اگر وہ کاشتکاری کرنا چاہتے بھی تو زمین نہ ہونے کے باعث نہیں کر سکتے تھے، مجبوراً معاوضہ کے بانڈ ملتے ہی انھوں نے ان کو بیچ بیچ کر کھانا شروع کر دیا۔ کئی سال سے ان کی گذر اوقات اسی پر ہے۔ پہلے معاوضہ کے بانڈ تھے، اب بحالی کے بانڈ ہیں۔ لیکن یہ بانڈ آخر کب تک ساتھ دیں گے؟ دو، چار، چھ برس میں جب یہ بک بکا کر ختم ہو جائیں گے تو اللہ کے ان بندوں کو دو وقت کی روٹی کہاں سے ملے گی؟ —— یہ حال اس طبقہ کا ہے جس کے ہاتھ میں بارہ پندرہ برس قبل تک ہندوستان میں مسلم سوسائٹی کی

قیادت تھی۔ رہ گئیں سرکاری ملازمتیں تو مسلمانوں کو اس کی عام شکایت ہے کہ ان میں ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا ہے۔ نئی جگہیں ان کو تقریباً ملتی ہی نہیں اور جو پرانی جگہوں پر کام کرتے چلے آ رہے ہیں ان کے لیے ترقی کی راہیں مسدود ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ تجارت سے عمومی طور پر مسلمان الگ رہے اور اب اس کے لیے نہ ان کے پاس سرمایہ ہے، نہ تجربہ، بعض مخصوص اسباب کی بنا پر کسی قومی تنظیم کے بغیر ان کا اس میدان میں قدم رکھنا اس وقت پُرخطر بھی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو قوم اپنے تہذیبی و تمدنی سرمایہ سے تیزی سے محروم ہو رہی ہو اور اس پر معاش کے دروازے ایک ایک کر کے بند ہو رہے ہوں وہ اگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے یا اپنی صلاحیتیں دوسری راہوں میں صرف کرتی رہے تو اس کا حشر کیا ہوگا؟ یہی نہ کہ یا تو وہ اپنا وجود کھو بیٹھے گی یا پستی کی اس سطح پر جا پہونچے گی جہاں ہم آج اچھوتوں کو پاتے ہیں؟ مسلمان اپنی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں کچھ اسی طرح کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ تلخی اور مایوسی نے ان کی عملی قوت سلب کر لی ہے۔ ان پر ایک گہرا جمود، ایک قبرستان جیسی مردنی چھائی ہوئی ہے۔ اس جمود میں اگر زندگی کی ایک آدھ لہر نظر بھی آتی ہے تو اس کی نوعیت یا تو سیاسی ہے یا مذہبی۔ یہ بات بھی کتنی حسرتناک ہے کہ جبکہ مسلمانوں کی بقا و ترقی کا مسئلہ اس وقت اصلاً و اولاً معاشی و معاشرتی ہے۔ ان کی قوم کے ذمہ دار عناصر کو اگر ان کی چارہ گری کی فکر ہوتی بھی ہے تو اس طرز کی جو ان کی ضروریات سے میل نہیں کھاتی۔ بنا بریں سیاسی تنظیم کا یہ وقت نہیں ہے۔ جو سیاسی منزل ملک نے اپنے لیے تجویز کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم ان کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب ہوگی۔ سیاسی لیڈروں اور کارکنوں میں ایک تعداد یقیناً ایسوں کی ہے جو قوم کے مخلص ہیں اور وہ دیانتداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ مستقبل کو محفوظ کرنے کی یہی سب سے بہتر صورت ہے۔ مگر اس میں اکثریت انہی کی ہے جو قیام پاکستان کے بعد بے روزگار ہو گئے ہیں یا سیاسی بزم آرائی ان کی عادت بن چکی ہے۔ اور وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، ذاتی مفاد پر قوم کے مفاد کو قربان کرنے والوں سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے، لیکن جو لوگ واقعی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر ان کو اپنی کوششوں میں کامیابی ہو بھی گئی تو زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوگا نا کہ مرکزی اور ریاستی اسمبلیوں میں مسلمان نمائندوں کی تعداد میں دو چار فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ تو کچھ ہونا نہیں ہے تو اس اضافہ سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچ جائے گا؟

ان کی کون سی دشواری حل ہو جائے گی، کون سی ضرورت پوری ہو جائے گی؟ ایک کھلی ہوئی بات ہو کہ کاؤنسلوں اور اسمبلیوں کے ذریعہ مسلمان بحیثیت ایک جماعت کے ملک کے حالات پر کوئی فیصلہ کن اثر نہیں ڈال سکتے ہیں اور کاؤنسلوں اور اسمبلیوں کے باہر سیاسی جدوجہد ان کے لیے زہر کا کام کر سکتی ہو۔

یہ حقیقت ہو کہ مذہبی اور دینی جدوجہد مسلمانوں کی بقا و ترقی کے لیے بھی ایک ناگزیر چیز ہے مگر تنہا یہ جدوجہد مسلمانوں کی بقا و ترقی کے پورے مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتی، بلکہ فی زمانہ دینی کام کرنے والے، عام طور پر، جس محدود نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے اپنا دائرۂ عمل بناتے ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے تو کہا جا سکتا ہو کہ یہ بالکل ممکن ہو کہ مسلمانوں میں دینی تعلیم و تربیت کا کام خوب زور و شور سے ہوتا رہے اور وہ شودروں اور اچھوتوں کے ہم پلہ ہوتے چلے جائیں۔ اس لیے اپنے دینی بزرگوں سے ہماری التجا ہو کہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں ذرا وسعت پیدا کریں۔ اور مسلمانوں کے اس وقت کے خاص مسائل کو بھی اپنے دائرۂ فکر و عمل میں شامل کریں۔

ہر عہد کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، ان تقاضوں کو سمجھنے اور برتنے ہی میں دنیا میں کامیاب رہنے کا راز مضمر ہو۔ اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت معاشی تنظیم اور ملّی معاشرت کی حفاظت ہو، اور چونکہ ملّی معاشرت کا تحفظ بھی معاشی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا ہو اس لیے اصل سوال معاشی تنظیم و استحکام کا رہ جاتا ہو۔ اس معاملہ میں اصولاً اور اخلاقاً سب سے پہلی ذمہ داری تو حکومت کی ہو، ایک مہذب اور ذمہ دار ریاست کے جہاں اور بہت سے فرائض ہیں وہاں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنے باشندوں کے لیے رزق و معاش کی آسانیاں پیدا کرے، ان کو روزگار سے لگائے اور دیکھے کہ ان کی محنت کا معقول معاوضہ ملتا ہو۔ نیز مسلمانوں کی ایسی بڑی آبادی کی اقتصادی بدحالی سارے ملک کو آگے بڑھنے سے اگر روک نہیں سکتی ہو تو اس کی رفتار سست ضرور کر سکتی ہو اور اس کے لیے مختلف طرح کی دوسری پریشانیاں بھی پیدا کر سکتی ہو اس لیے بھی یہ حکومت کے سوچنے کا مسئلہ ہو۔ لیکن بدقسمتی سے جو مزاج اس وقت ملک کا ہو رہا ہو وہ حکومت سے اس طرح کی کوئی توقع رکھنے کی اجازت نہیں دیتا ہو۔ اس لیے مسلمانوں کو اگر ایک باعزت قوم کی طرح زندہ رہنا ہو تو ان کو اپنی تعمیر نو کے لیے خود آگے بڑھنا چاہیے۔

سب سے پہلی بات جو مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے کی ہو وہ یہ کہ ان کا مسئلہ نہ تو چند لوگوں کا

...جسے انفرادی طریقے سے سوچا جا سکتا ہو اور نہ کوئی عارضی صورت ہو جو کچھ عرصہ بعد ختم ہو جائے گی۔ ان کا سوال پار کردہ انسانوں کا سوال ہو جو ملک کے طول و عرض میں ریاست ریاست، شہر شہر، اور دیہات دیہات پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ایک ایسا سوال ہو جسے اگر نظر انداز کیا گیا تو وہ بالآخر اپنے کو حل تو ضرور کرائے گا مگر اس طور پر کہ نہ چمن رہے گا، نہ فکر چمن بندی ہو گی۔ مسلمانوں کو ایک جماعت کی طرح سوچنے کی عادت ڈالنا چاہیے۔ ان میں جو اہلِ اقتدار ہیں ان کو اس بارہ میں کسی شبہ میں نہ رہنا چاہیے کہ خدا نخواستہ اگر جماعت کا سفینہ غرق ہوا تو وہ بھی سلامت نہ رہیں گے، ان کی عزت اور دولت اور قوت ان کو ہلاک ہونے سے ہرگز نہ بچا سکے گی، جب اسپین سے مسلمان نکالے گئے تھے، یا جب ہندوستان کے قدیم باشندوں اور حکمرانوں کو اچھوت اور ناپاک بنایا گیا تھا تو کیا ان کے ممتاز افراد کے ساتھ کوئی رعایت برتی گئی تھی! پھر جو آجکل مسلمانوں میں نمایاں اور صاحب ثروت ہیں وہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اگر قوم پر برا وقت آیا تو ان کو چھوڑ دیا جائے گا کہ تم نے معاشرہ کے ساتھ دغا کر کے جو دولت اکھٹا کر رکھی ہے اس سے حسب دستور لطف اندوز ہوتے رہو اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ چونکہ تم نے عوام سے خود کو الگ رکھا ہے اس لیے تمہارا حشر ان کے ساتھ نہ ہو گا، چونکہ تم ان کے بھوک اور فاقے میں شریک نہیں ہوئے اس لیے تم کو کبھی ان کے بھوک اور فاقہ میں شریک نہ کیا جائے گا۔

آخر میں جو درد مند حضرات قوم کی خدمت کی آرزو اور حوصلہ رکھتے ہوں ان کے سامنے ہم کام کا ایک خاکہ پیش کر رہے ہیں جو نہ کسی معنوں میں جامع ہے نہ مکمل، بلکہ اس کی حیثیت محض ایک ابتدائی مشورہ اور ایک دعوتِ فکر کی ہے جو شاید مسئلہ کو صحیح روشنی میں لانے کا محرک ہو سکے۔

(۱) مسلمانوں سے خوف، سراسیمگی، مایوسی اور پست ہمتی کے خیالات دور کرنا۔

(۲) ان کے اجتماعی احساس کو بیدار کرنا۔

(۳) ان میں محنت، استقلال، سادگی اور کفایت شعاری کی عادتیں پھیلانا۔

(۴) مسلمان دستکاروں اور کاریگروں کی تنظیم اور ان کی پشت پناہی کے لیے امدادی انجمنوں کا قیام۔

(۵) چھوٹے چھوٹے دارالحرفہ جاری کرنا۔

(۶) تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ سرکاری ملازمتوں پر ٹوٹ کر نہ گریں۔
(۷) جو باثر مسلمان اپنے عہدوں یا پیشوں سے ریٹائر ہوں ان کو آمادہ کرنا کہ وہ اپنی بقیہ عمر قوم کے لیے وقف کردیں اور اس کی تعمیری خدمت کریں۔
(۸) مسلمانوں کو زکوٰۃ کی اہمیت بتانا اور اس کو ان میں رائج کرنا۔
(۹) اس کی کوشش کرنا کہ لوگ جو صدقہ، خیرات و زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں نکالیں ان کو بہتر سے بہتر مدوں میں صرف کریں۔
(۱۰) مسلمانوں میں بھیک مانگنے کے رواج کو ختم کرنا۔

مسلمان ہونا آسان ہو مگر صحیح مسلمان بننا بہت مشکل ہو۔ صحیح مسلمان بننے کی پہلی شرط یہ ہو کہ آدمی اپنے کو صحیح انسان بنائے اور صحیح انسان کہلانے کا وہی مستحق ہو جو اپنے کو ایک الگ تھلگ جزیرہ نہیں بلکہ ایک وسیع سلسلہ کی کڑی سمجھتے ہیں۔ بقول مولانا حالی۔

می تواں قطب زماں شد، می تواں شد غوث وقت
ہر چہ خواہی می توانی شد، بجز انساں شدن
چیست انسانی؟ تپیدن در غم ہمسایگاں
از سموم نجد در باغ عدن بریاں شدن
خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

یہی نقطۂ نظر متقاضی ہے کہ ہم اپنے اپنے حال میں مگن رہنے کا بجائے "پوری قوم" کے وسیع نقطۂ نظر سے سوچیں۔ اور ان کاموں کی فکر کریں جو قوم بحیثیت المجموع کی قوت و استحکام کے لیے ضروری ہیں۔

حدیثِ پرویز

(عتیق الرحمٰن سنبھلی)

ایک محترم بزرگ نے جولائی ۱۹۵۹ء کے "طلوعِ اسلام" کے کچھ اوراق بھیجے ہیں، جن کا عنوان ہے۔ "ہماری تاریخ میں کیا لکھا ہے؟"۔

"طلوعِ اسلام" تو آپ سمجھتے ہوں گے؟ —— پرویز صاحب کے خیالات کا ترجمان ہے، اور ان کے خیالات معلوم ہیں۔ پیشِ نظر مضمون میں انھوں نے —— مضمون پر نام اگرچہ درج نہیں ہے مگر غالباً انھوں نے ہی —— یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ "ہماری تاریخ"[1] قرآن فہمی کے راستہ میں روک ہے، قرآن ہمیں کچھ بتاتا ہے اور "تاریخ" ہمیں کچھ سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور پھر اس مشکل کا حل انھوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف پڑے اُسے رد کر دینا چاہیے۔ اور اس تاریخ کو قرآن کی روشنی میں از سرِ نو مرتب کرنا چاہیے۔

بظاہر اس حل میں اُصولی طور پر کوئی بات قابلِ اختلاف نہیں ہے، بڑا نیک کام اور بڑا صحیح نقطۂ نظر ہے، لیکن یہ تو پرویز صاحب بھی جانتے ہیں کہ نفس تاریخی روایات (خواہ وہ قرنِ اول ہی سے متعلق ہوں، کسی کے نزدیک بھی سند و حجت اور سو فی صدی صحیح نہیں ہیں۔ لوگ بے تکلف ان تاریخی بیانات کو رد کرتے آئے ہیں۔ جو قرآن مجید سے متصادم ہوں، پھر یہ مشکل کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ —— مشکل یوں پیدا ہو رہی ہے کہ پرویز صاحب "تاریخ" میں حدیث کو بھی شامل کرتے ہیں، یعنی جو دعویٰ ان کا تاریخ کے بارے میں ہے بعینہٖ احادیث کے بارے میں بھی ہے، اور لوگ احادیثِ صحیحہ کو حجت مانتے ہیں

---

[1] قرنِ اول کی تاریخ۔

پس ظاہر ہے کہ جب احادیث کی حالت یہ ہو کہ وہ قرآن کے خلاف کچھ بتاتی ہوں، اور لوگ حدیث کو سند اور حجیت بھی مانتے ہوں تو لامحالہ قرآن فہمی کے راستہ میں رکاوٹ پیدا ہوگی! ___ آئیے دیکھیں کیا واقعی وہ احادیث بھی جن کو ہم "احادیث صحیحہ" مانتے ہیں، قرآن فہمی کے راستہ میں رکاوٹ اور اصل دین کے لیے حجاب ثابت ہوتی ہیں؟

پرویز صاحب نے مثالیں پیش کی ہیں۔ ان میں ایک مثال تمہیداً اور باقی دو ضمناً آئی ہیں۔ اصل مثال جس کے شرح و بسط ہی سے پورا مضمون تیار ہوا ہے ایک ہے۔ آئیے پہلے اسی پر غور کریں۔

اس مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ "قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار ذاتی جوہر اور حسن عمل ہے نہ کہ حسب و نسب اور رشتہ داری کے تعلقات!" ___ اس ضمن میں قرآنی آیات، "ولقد کرمنا بنی آدم"۔ "و لکل درجات مما عملوا" اور "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" الآیۃ۔ پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ "صحابہ کبار پکے اور سچے مومن تھے۔ ان کی سیرت بہت بلند اور کردار بڑا پاکیزہ تھا اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیوست تھی" ___ اس ذیل میں "والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اولٰئک ھم المؤمنون حقا۔ الآیۃ۔ ___ "محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم"۔ الآیۃ (آیات قرآنی) کو پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ قرآنی نظام کو قائم رکھنا اور آگے چلانا اُمت کا اجتماعی فریضہ ہے ___ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ___ اس کے لیے (انھیں ہدایت تھی کہ) باہمی مشورے سے اپنے میں سے بہتر فرد کو (جو معیار خداوندی پر پورا اُترے) منتخب کرکے رسول کا جانشین بنائیں ___ وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)

یہ قرآنی تصریحات" تھیں ___ "تاریخ" اس کے برعکس (بقول پرویز صاحب) بتاتی ہے کہ (۱) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور آپ کے بعد امیر المومنین کا سوال سامنے آنے لگا تو بعض صحابۂ کبار "قرابت داری اور وراثت" کے نقطۂ نظر سے سوچنے لگے۔ (۲) اور جب آپ کی

آنکھ بند ہوگئی تو بجائے "شوریٰ" کے استبداد سے کام لے کر اور حسب ونسب کو درمیان میں لاکر خلافت کا فیصلہ کیا گیا۔ (۳) اور پھر اس سلسلہ میں نزاع کا وہ قولی وعملی انداز اختیار کیا گیا جو "رحماء بینہم" کے بالکل خلاف تھا اور اُن کی بلندیٔ کردار سے بھی فروتر!

ہم بتا چکے ہیں کہ جہاں تک محض تاریخی روایات کا سوال ہے ان کو کوئی بھی استناد کا وہ درجہ نہیں دیتا کہ اگر پرویز صاحب کو یہ روایات قرآن کے بیانات سے متصادم نظر آئیں تو کوئی کھٹک محسوس کی جائے۔ اس لیے اگرچہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس نوع کی روایات سے نتیجہ اخذ کرنے میں پرویز صاحب سے اختلاف رائے ہو لیکن جب ہمارا موقف یہ ہے جو ابھی عرض کیا گیا تو کوئی ضرورت نہیں کہ جو روایات اس مثال کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے محض کتب تاریخ سے لی ہیں ہم اُن پر بھی گفتگو کریں۔[1] ہمیں تو اُن حدیثی روایات کو دیکھنا ہے جنھیں ہم (حدیث کو حجت ماننے والے) لازماً صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

پرویز صاحب بخاری کی حسب ذیل روایت پیش کرتے ہیں کہ

اس بیماری میں جس میں آپ نے وفات فرمائی۔ علی ابن ابی طالبؓ رسول اللہ صلعم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا ابو الحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے۔ تو عباس بن عبد المطلبؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہوگے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبد المطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں، چلو رسول اللہ

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ پرویز صاحب رونا تو اس تاریخ کا رونا چاہتے ہیں جو "دین بن گئی ہے" (ملاحظہ ہو طلوع اسلام صفحہ ۲) ——— اور وہ وہی واقعات ہیں جو معتبر احادیث کی روایات کے ذیل میں کتب حدیث میں آئے ہیں، اور جنھیں "صحیح" مانا جاتا ہے ——— لیکن بیچ میں روایات وہ لے آئے ہیں جو حدیث کی نہیں تاریخ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ جنھیں سند اور حجت کوئی نہیں مانتا ——— خدا ہی جانے یہ غلط مبحث کیوں ہے۔

صلعم کے پاس چلیں اور آپ سے دریافت کرلیں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور آپؐ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرمادیں گے (اس پر[1] حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے۔ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہوگا) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری۔ باب وفات النبیؐ)

اور پھر اس پر لکھتے ہیں

"اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضور کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت اور کسی کے پاس نہیں جائے گی۔ لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا۔ اسی لیے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافت حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرا لینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا ہے وہ بھی قابل غور ہے یعنی اگر ہم نے رسول اللہ سے دریافت کرلیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لیے کوئی گنجائش (CHANCE) نہیں رہے گا۔

شیعہ حضرات کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے اور اس میں انتخاب اور مشورہ کا کوئی سوال نہیں، اسی طرح خلافت بھی خدا کی طرف سے موہبت ہے۔ اس میں انتخاب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں ....

لیکن سنی حضرات کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک خلیفہ امت کے مشورہ سے منتخب ہوتا ہے۔ مذہبی خلافت کوئی جائداد نہیں ہے جو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں کو بطور ترکہ مل سکتی ہے۔ یہ تصور کہ حکومت باپ کے بعد بیٹے کو ورثہ میں ملتی ہے، ملوکیت ہے جسے مٹانے کے لئے

---

[1] بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔ (منہ)

اسلام آیا تھا۔

جو روایت اوپر درج کی گئی ہے وہ شیعہ حضرات کی نہیں سنیوں کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری میں درج ہے۔ اب آپ غور فرمائیے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہؐ کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟ یہ تصور کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی، یہ معاملہ اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ پھر جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے ان کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔"

ہم اس روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس سے اُن نتائج کا اخذ کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے جنھیں پرویز صاحب ظاہر اور بدیہی ٹھہرا رہے ہیں۔

۱۔ وہ کہتے ہیں :۔

"اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔"

یہ بالکل بے بنیاد خیال ہے۔ روایت کے الفاظ کی روشنی میں حضرت عباسؓ کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ کہ ان کے سامنے "حضورؐ کے بعد" کا سوال آ گیا تھا کہ حضورؐ کے بعد ہم لوگوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ (نہ یہ کہ اُن کے دل میں "خلافت کا خیال" پیدا ہو گیا تھا[۱]) ـــــــ رہے حضرت علیؓ! تو (اُن پر اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں) اُن کے دل میں یہ سوال تک نہ آیا تھا کہ بعد میں کیا ہوگا؟ انھوں نے تو حضرت عباسؓ کے ذکر چھیڑنے پر کہا جو کچھ کہا۔ اپنی طرف سے وہ (اس روایت میں) ایک لمحہ کے لیے بھی سوچتے نہیں نظر آتے کہ حضورؐ کے بعد کیا رہے گا؟ چہ جائیکہ وہ اس فکر میں غلطاں نظر آئیں کہ میں کس طرح حضورؐ کی جانشینی پر قبضہ کروں!

۲۔ ـــــــ "وہ (حضرت عباسؓ) اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافت حضرت علیؓ کے

---

[۱] ان دونوں باتوں میں جو فرق ہے وہ کسی صاحبِ زبان پر پوشیدہ نہیں۔ اگر پرویز صاحب پر پوشیدہ ہو تو ہم انھیں سمجھائیں!

متعلق ، توثیق کرالینا چاہتے تھے "

یہ بھی محض پرویز صاحب کا اختراع ہے۔ حضرت عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں :

"چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلیں ، اور آپ سے دریافت کریں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوگی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے۔"

کیا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عباسؓ خلافت کے سلسلہ میں حضرت علیؓ کی خلافت کی (یا کسی کی بھی خلافت کی) توثیق کرا لینا چاہتے تھے ؟ یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ خلافت کن لوگوں کو ملے گی، تاکہ اگر یہ منصب خاندانِ نبوت سے باہر جانے والا ہو تو حضورؐ اپنے خاندان والوں کے حق میں کچھ وصیت اپنے جانشین کے لیے فرما دیں[۱] ؟

۳۔ پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

"اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہؐ کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے ؟ یہ تصور کہ وہ معاذ اللہ اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے۔ کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی۔ یہ معاملہ اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔"

---

[۱] حضرت عباسؓ نے اس وصیت کی ضرورت کیوں محسوس کی ؟ یہ ایک الگ سوال ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں ضمناً یہ سوال یہاں پیدا ہو۔ اس لیے ہم مختصراً کچھ روشنی ڈالے دیتے ہیں ——— ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عباسؓ چوں کہ ایک معمر اور تجربہ کار بزرگ تھے ان کے سامنے قریش (قبل اسلام) کی وہ ساری تاریخ تھی جس میں بنو ہاشم سے بعض دوسرے قریشی خاندانوں کی چشمکیں، رقابتیں اور آویزشیں موجود تھیں اور یہ سب عناصر اب اسلام میں آ چکے تھے اور جس طرح آ سکے تھے یہ بھی حضرت عباسؓ پر روشن تھا، ان کی عصبی طاقت کا بھی انھیں اندازہ تھا اس لیے قدرتی طور پر انھیں اس قسم کا خطرہ ہو سکتا تھا کہ یہ عناصر غلبہ حاصل کر لیں۔ اور پھر ان پچھلی رقابتوں کے اثرات رونما ہوں اسلیے انھوں نے اسکی پیش بندی ضروری سمجھی۔ واللہ اعلم

جہاں تک بخاری کی روایت کا تعلق ہے (مرسل شعبی سے اضافہ کو چھوڑ کر[۵]) اس کے تو کسی لفظ سے وہ تصور جو پرویز صاحب کے دل میں "قائم" ہو رہا ہے کسی کے دل میں شبہ بن کر بھی نہیں گزر سکتا۔ حضرت عباسؓ کے الفاظ ابھی دوبارہ آپ کے سامنے آ چکے ہیں ان میں نظریہ وراثت اور موروثی استحقاق کا شائبہ تک نہیں ورنہ حضرت عباسؓ اس کی گنجائش کیوں سمجھتے کہ (جس طرح ہماری نامزدگی کا امکان ہے اسی طرح) کسی دوسرے کی نامزدگی کا بھی برابر کا امکان ہے؟ یہ تصور تو جب قائم ہو سکتا تھا جب الفاظ یوں ہوتے کہ چلو خلافت کا حق تو ہمارا ہی ہے چل کے حضورؐ سے اس کی تصریح بھی کرا لیں تاکہ بعد میں کوئی نزاع نہ پیدا ہو۔ اسی طرح حضرت علیؓ کا بھی جو جواب بخاری کی روایت میں ہے (کہ اگر آپ نے ہمارے متعلق انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی نہیں دیں گے الخ) اس سے بھی کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت علیؓ امر خلافت میں اُمت کے مشاورتی فیصلہ کے بجائے (خدانخواستہ) وراثتی استحقاق کے قائل تھے۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے یہ الفاظ (کہ لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی نہیں دیں گے) یہی تصور دیتے ہیں کہ وہ خلیفہ کے تقرر کو مشورہ ہی سے طے ہونے والی بات سمجھتے تھے۔

اب رہ جاتی ہے حضرت علیؓ کے جواب میں مرسل شعبی سے اضافہ شدہ فقرہ کی بات! تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی بنیاد وراثتی استحقاق ہی کے نظریہ پر رکھی جائے اور لازمی طور پر یہ سمجھا جائے کہ حضرت علیؓ خلافت کو وراثۃً اپنا حق سمجھتے تھے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بغیر وراثتی استحقاق کے نظریہ کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خیال یہ ہو کہ لوگ خاندان نبوت ہی میں سے ("معیار خداوندی پر پورا اترنے والے") کسی فرد کے انتخاب کو مصلحت سمجھیں گے! کیا اس بنیاد پر اس قسم کا کوئی فقرہ کسی کی زبان سے نہیں نکل سکتا؟ پھر اس فقرہ سے کیوں یہ لازم آتا ہے۔ اور کیوں یہ تصور قائم ہونا ضروری ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذہن میں وراثتی استحقاق کا نظریہ کام کر رہا تھا؟؟

۴۔ پرویز صاحب آخری بات فرماتے ہیں کہ

---

[۵] مرسل شعبی سے اضافہ کو چھوڑ کر، اس لیے کہ جیسا کہ آپ کے سامنے آ چکا ہے پرویز صاحب نے یہ اعتراض بخاری ہی کی روایت کی بنا پر اٹھایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مرسل شعبی کا اضافہ "بخاری کی روایت" سے خارج ہے۔

"پھر جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہو اس سے اُن کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہو وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں"

اس سے اشارہ اس جواب کی طرف ہو کہ

"اگر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔"

اس سے حضرت علیؓ کے کردار پر کیا زد پڑتی ہو؟ یہ کہ وہ (معاذ اللہ) حکومت کی طمع میں بری طرح گرفتار تھے؟ —— ٹھیک ہو جس کے سامنے حضرت علیؓ نہ ہوں، خلافت ملنے کے بعد کی ان کی زندگی نہ ہو، صرف یہی چند الفاظ و نقوش اس کے سامنے ہوں وہ ضرور دنیا میں پائے جانے والے ہزاروں حریصان حکومت کی طرح انھیں بھی ایک سمجھ لے گا —— اور یہ معاملہ صرف انھیں کے ان فقروں کے ساتھ خاص نہیں، خود رسولؐ کے بہت سے ارشادات کو اسی طرح غلط معنیٰ پہنائے جا سکتے ہیں۔ اور پہنانے والوں کی دست برد سے تو قرآنی فقرے بھی نہ بچ کر نہیں جاتے —— لیکن جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ حضرت علیؓ نے کیا؟ اور جب خلافت ملی ... تو انھوں نے کیسی فقر و مسکنت اور زہد و تقشف کی زندگی گزاری۔ کس طرح وہ دنیا و ما فیہا سے نفور رہے —— کہ راتوں کو اپنی داڑھی پکڑ کر روتے اور یہ کہتے نظر آتے۔

یا دنیا! اَبی تعرّضت ام لی	اے دنیا کیا تو میرے درپے ہوئی ہو، کیا تو
تشوّقت۔ هیهات هیهات	مجھے اپنے حسن و جمال سے دور کرنا چاہتی ہو۔
غرّی غیری قد بتتّك ثلاثًا	دور ہو دور!! کسی اور کو لبھانے کی کوشش
لا رجعة لی فیك فعمرك	کرو میں تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں۔ تو
قصیر وعیشك حقیر وخطرك	مجھ سے مایوس ہو جا، تیری عمر کیا؟ تیرا عیش
کبیر۔ آہ! من قلة الزاد وبُعد	کیا؟ اور تجھ سے خطرہ کتنا بڑا —— آہ!
السفر ووحشة الطریق۔	کہ زادِ سفر کم ہو۔ سفر دراز ہو اور راہ کی
صفة الصفوة لابن الجوزی	وحشت ناکیاں۔ الاماں!!!
(ج ۱ - ص ۱۲)	

ـــــ راتوں کو یہ کھڑے نظر آتے اور دن اُن کی راتوں کی، اور ان کا عمل ان کی زبان کی تصدیق کرتا ـــــ پس جس شخص کو یہ سب معلوم ہو ـــــ وہ کیونکر ان الفاظ میں حضرت علیؓ کی سیرت و کردار کی خامیاں اور (معاذ اللہ) پستیاں دیکھ سکتا ہو؟ ایسا شخص تو ان الفاظ کا واقعی محرک جاننے کے لیے ان کا پس منظر تلاش کرے گا۔ اور تلاش و جستجو میں فوراً ہی اسکی نظر اس حقیقت کی طرف جائے گی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غایت احتیاط سے عام طور پر ہر معاملہ میں اپنے اقرباء کو پیچھے رکھتے تھے، دوسروں کو دیتے تھے اپنوں کو محروم کرتے تھے، چاہے انھیں پورا استحقاق ہو۔ حضورؐ کی یہی عادت شریفہ تھی جس نے حضرت علیؓ کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ حضورؐ کے سامنے اگر بات آئی تو بہت ممکن ہے کہ آپ ہمارے حق میں انکار فرما دیں، خواہ ہم کتنے ہی اہل اور مستحق ہوں۔ اس لیے میں کیوں خواہ مخواہ اپنے حق میں مہر لگواؤں؟ اور اس اعزاز (نیابت رسولؐ) کا دروازہ اپنے ہاتھوں اپنے اوپر بند کروں جس کا اگر انسان حق ادا کرسکے تو رسالت و نبوت کے بعد انسان کی سب سے بڑی سعادت ہے۔

غور فرمائیے۔ جب تمام قرائن حضرت علیؓ کے جواب کا ایک ایسا پاکیزہ محرک سامنے لا رہے ہوں تو کیوں ایک دنی محرک کی طرف تصور دوڑایا جائے، اور کیوں نہ اسی پاکیزہ اور اعلیٰ جذبہ کو ان الفاظ کا محرک ٹھہرایا جائے؟[۵۱] کیا اس اعلیٰ جذبہ کے ماتحت اس طرح کا جواب نہیں دیا جاسکتا تھا؟ ـــــ پھر اس جواب سے حضرت علیؓ کی سیرت و کردار پر کیونکر کوئی زد پڑتی ہے؟؟[۵۲]۔ (باقی آئندہ)

---

[۵۱] ہمارے اس انداز گفتگو سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ ہم کوئی سفارش کر رہے ہیں کہ حضرت علیؓ کے جواب کا یہ محرک سمجھ لیا جاہیے۔ بلکہ حقیقت یہ ہو کہ مذکورہ قرائن شہادت دیتے ہیں کہ یہی محرک تھا اور گرد و پیش کے ان قرائن کو نظر میں رکھنے والا اس جواب کو کسی پست جذبہ پر محمول کر ہی نہیں سکتا۔ پس اگر اس جواب سے کوئی شخص غلط نتیجہ پر پہونچتا ہو تو اس کی ذمہ داری ہماری "تاریخ" پر نہیں، اس شخص کے جہل یا اس کی بے ایمانی پر ہو!

[۵۲] بلکہ اگر اس محدود اور ضابطہ کی سی گفتگو میں ہمیں نکتہ سنجی کی اجازت دی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیرت و

کردار کی پستی کا تو سوال ہی کیا، اس جواب سے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی غیر معمولی بلندی نظر ظاہر ہوتی ہے، ذرا غور تو کیجئے، حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ بھائی! ذرا اپنے حق کی فکر کرلو۔ خلافت اگر ہمارا حصہ نہ ہو تو حقوق کی حفاظت کا تو بندوبست ہو جائے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ چچا، میں ہرگز اس معاملے میں آنحضرتؐ سے بات نہیں کروں گا۔ حقوق کی حفاظت ہونا نہ ہونا تو کوئی ایسی اہم بات نہیں، ایسا نہ ہو کہ حقوق کی فکر میں ہم اس سعادت عظمیٰ سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں جس کے سامنے دنیا کے سارے حقوق ہیچ ہیں۔ یعنی رسول پاکؐ کی نیابت و خلافت! تو میں اس قیمت پر یہ سودا کبھی نہیں کر سکتا ـــــ العظمۃ للہ۔ کیا ٹھکانا ہے اس بلندیٔ نظر اور عظمت کردار کا!

انتخاب

مولانا جلال الدین رومیؒ

مغرب کی نظر میں

مولانا جلال الدین رومی تصوف اور طریقت کے بہت بڑے امام تصور کیے جاتے ہیں ان کی مثنوی اور دیوان کبیر کو مسلمانوں میں اس قدر قبول عام حاصل ہوا کہ ایران اور ہندوستان میں تو ان کی تعلیمات ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا لازمہ بن گئیں۔ آج بھی جب ہمارے ملک میں فارسی کا رواج برائے نام رہ گیا ہے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا ہو جس کو مولانا کی مثنوی کے دو چار شعر زبانی نہ یاد ہوں۔

مغرب میں جب مشرقی علوم سے شغف پیدا ہوا اور یہاں کا سرمایۂ علم و معرفت یورپی زبانوں میں منتقل کیا جانے لگا تو مولانا جلال الدین رومی کے افکار و خیالات کی طرف بھی یورپی مؤرخین اور محققین نے توجہ دی اور ان کا پیش کردہ فلسفۂ تصوف متعدد زبانوں میں منتقل کیا۔

شیخ سعدیؒ (وفات ۱۲۹۲ء) پہلے ایرانی شاعر ہیں جن کا ترانہ فکر ۱۶۵۱ء میں کسی یورپی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کے کوئی ایک سو سال بعد حافظ شیرازی (وفات ۱۳۸۹ء) کی نظموں کا ترجمہ کیا گیا۔ مولانا رومی کی تخلیقات کو کسی یورپی مصنف یا مترجم نے گوئٹے کے عہد تک ہاتھ نہیں لگایا۔ سب سے پہلے وان ہیمر نے دیوان کبیر اور مثنوی کے پچاس منتخب حصے ترجمے کے ساتھ شایع کیے، اگرچہ ان ترجموں میں صحت معانی کا بڑا خیال رکھا گیا مگر اصل میں شاعری کا جو حسن، خوبصورتی اور بانکپن موجود ہے ان ترجموں میں یہ رنگ بالکل مفقود ہے۔

اس صدی میں ایک جرمن مستشرق فریڈرک روکرٹ (۱۸۶۶ - ۱۷۸۸) نے جو ویانا میں ہیمر سے فارسی سیکھتا تھا مولانا کی نظموں کا ترجمہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ تصوف کی حقیقی روح جرمن زبان میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوا۔

مولانا جلال الدین رومی نے اپنی نظموں کا انتساب شمس الدین کی طرف کیا تھا۔ روکرٹ نے اپنے تراجم کا انتساب خود مولانا کی ذات کی طرف کیا، روکرٹ نے پہلی بار جرمن ادب کو غزل سے روشناس کیا اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ مولانا کی مثنویوں کی اہتزاز انگیز نغمگی اور تصوف کا سوز و ساز گہرائی، گیرائی اور کیف و مستی اپنانے اور ان کو اپنی مادری زبان کا سرمایہ بنا دینے میں ناکام نہیں رہا۔ روکرٹ بعض اوقات مولانا کے کسی ایک مصرعہ سے اس قدر وجد میں آتا ہے کہ ایک پوری نئی غزل تخلیق کر ڈالتا ہے۔ اس نے ہیمر کے بے روح تراجم کے بعض حصوں پر نظر ثانی کر کے ان میں اصل کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ روکرٹ کے تراجم موجودہ صدی میں انگریزی زبان میں بھی منتقل کیے گئے۔

یورپ نے مشرقی تہذیب ثقافت سے روشناسی اور واقفیت حاصل کرنے کے معاملے میں دلچسپی کا مظاہرہ پچھلی صدی کے اوائل میں کیا۔ یہ دلچسپی زبان و لغت سے زیادہ ثقافت سے تعلق رکھتی تھی۔ جب انیسویں صدی نصف سے آگے بڑھی تو عالم اسلام پوری طرح مغرب کی توجہات کا مرکز بن چکا تھا، اور نئے نئے تراجم اور کتابیں اشاعت پذیر ہونے لگی تھیں، اس زمانے میں مولانا رومی کی تصانیف کے کچھ حصے بھی انگریزی اور جرمن زبانوں میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے۔ انگلینڈ میں ہاٹ فیلڈ مثنوی کا مطالعہ کر رہا تھا اس کے ترجمہ نے علم الٰہیات اور مشرقی علوم کے حلقوں میں بعض دلچسپ مباحث کا باب کھولا۔ اس سے چند سال پیشتر ایک جرمن مستشرق جی روزن نے بھی مثنوی کی ابتدائی چند حصوں کا منظوم ترجمہ کیا، اس نے اپنی کتاب میں ایک مفید دیباچہ کے ساتھ تشریحی حاشیے بھی لکھے مگر روزن مولانا جلال الدین رومی کی روح کو اپنانے میں اس قدر کامیاب نہ ہوا جتنی کامیابی روکرٹ کو حاصل ہوئی تھی۔ یہی صورت حال ایک اور آسٹریلوی مستشرق روزن ویگ سسشوانو کے ساتھ بھی پیش آئی۔ البتہ طباعت کی آرائش و زیبائش کے اعتبار سے اس کی کوشش قابل ستائش رہی۔ روزن اور روزن ویگ سسشوانو ان ترجموں کے اثرات سے اپنے آپ کو بالاتر نہ رکھ سکے جو انیسویں صدی میں کیے گئے تھے۔ یہ اگرچہ ایک فطری بات تھی مگر ترجمہ کے معاملے میں یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اصل کی خوبصورتی اور مطلب پر وقت اور مقام کا اختلاف اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ ان تراجم میں فن شاعریت اور مولانا کا تصوف پوری طرح جلوہ نما ہے لیکن قاری ان کے ذریعہ ان اسرار و رموز کی تہہ اور کنہہ کو پہنچنے سے قاصر رہتا ہے جو مولانا کو مولانا بنا گئے۔

کسی شاعر یا مصنف کی کاوشوں سے متعلق کامیاب تصنیف وہی قرار دی جاسکتی ہے جو اس کو مناسب طریق پر سمجھنے میں مدد دے سکے۔ مشہور برطانوی مستشرق آر۔ اے نکلسن نے ۱۸۹۸ء میں ایک ایسی ہی کاوش کے ذریعہ سرمایۂ علم میں اضافہ کیا۔ اس نے دیوان شمس تبریزی کی کوئی چالیس غزلیں طبع کیں۔ اس کتاب میں اس نے مولانا کے اوصاف، خصوصیات اور تصوف کی تاریخ سے متعلق بعض بڑی قیمتی معلومات شامل کی ہیں۔ یہ مایۂ ناز مصنف یورپ کو تصوف کی تاریخ سے روشناس کرنے کے لیے چالیس سال تک متواتر جد و جہد کرتا رہا۔ اور یہ اسی کاوش کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ اور ایشیا دونوں کے پاس مثنوی مولانا روم سے متعلق آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک ناقابل فراموش کتاب موجود ہو۔ موجودہ دور میں جو شخص بھی مولانا کی مثنوی کا غائر مطالعہ کرنا چاہے گا اس کو اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ "دیوان کبیر" پر بھی ایک ایسی ہی کتاب کی ضرورت ہو۔

انگریزی زبان میں مولانا پر جو اور کام کیا گیا ہے، اُن میں مولانا کی وہ رباعیات بھی شامل ہیں جن کو حال ہی میں ایک انگریزی محقق اے۔ جے۔ آربری نے شائع کیا ہے۔ موصوف تصوف میں تخصص حاصل کر رہے ہیں۔ مصنف نے کچھ منظوم تراجم بھی کیے ہیں۔

مولانا کا اثر مغرب پر کتنا گہرا اور وسیع ہے؟ اس سلسلے میں مشرقی جرمنی کی ایک سادہ مثال پیش کر دینی خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ یہاں ایک معمر صاحب فن فارسی زبان سے بالکل ناواقف ہے۔ اُس نے مولانا کو جرمن زبان کے تراجم کے ذریعہ جانا پہچانا اور اُن سے متاثر ہو کر بڑی خوب غزلیں لکھیں۔

(البلاغ، بمبئی)

ضروری اعلان

شوال اور ذی قعدہ ۱۳۸۹ھ کا الفرقان دفتر میں بالکل ختم ہو چکا ہے اس لئے ان دونوں شماروں کے متعلق کسی شکایت کی تلافی اب نہیں کی جاسکتی۔

منیجر

تعارف و تبصرہ

القادیانی والقادیانیہ

از۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ناشر[1] مجلس ختم نبوت ملتان (پاکستان)۔ قیمت -/۲ صفحات ۱۴۰

قادیانیت عربی ممالک اور دوسرے اسلامی ممالک میں نفوذ کی سعی کافی عرصہ سے کر رہی ہے۔ باہر کے سب لوگ اسکی اصل حقیقت سے ناواقف ہیں۔ قادیانیت کے اصل مآخذان کی دسترس سے باہر بھی ہیں۔ اور رسائی ہو بھی جائے تو غیر زبان کی وجہ سے وہ لوگ ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ مجلس ختم نبوت ملتان نے اس چیز کو محسوس کیا اور شاید انہی حضرات نے شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری مدظلہ العالی کو اسکی طرف متوجہ کیا۔ حضرت ممدوح چونکہ قادیانیت کی فتنہ کاریوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسلئے آپنے خصوصاً عرب ممالک اور عموماً دوسرے اسلامی ممالک کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے بڑے اہتمام اور خصوصی دلچسپی کے ساتھ یہ عربی کتاب تیار کرائی جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

عربی تحریر و تقریر پر مولانا ندوی کی قدرت محتاج بیان نہیں ہے۔ جس شخص کی عربی انشاء پردازی پر خود عربوں کو اتنا اعتماد ہو کہ "المسلمون" (دمشق) جیسے بلند پایہ عربی ماہنامہ کی ادارہ نگاری کا فریضہ اُسے ہندوستان میں بیٹھ کر انجام دینا پڑے، اُسکی عربی کے متعلق کیا موقع ہے کہ ایک ہندی زبان کھولے۔ اس کتاب کی تحریر و تالیف میں ایک شیخ وقت کی روحانی مدد کے ساتھ ساتھ (جو ہمارے نزدیک ایک حقیقت ہے) چونکہ اس موضوع کے خصوصی ماہرین کی معاونت بھی شامل رہی ہے (جن کا ذکر مؤلف نے پیش لفظ میں کیا ہے) اس لیے یہ واقعہ ہے کہ یہ عربی میں قادیانیت کے صحیح تعارف کی ایک کامیاب کوشش بن گئی ہے۔

---

[1] ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اس کتاب میں چار ابواب ہیں، اور ہر باب کئی کئی فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلا باب ـــــ الشخصیات الاساسیہ وعصرها وبیئتها۔

دوسرا باب ـــــ تطور فکرۃ المرزا غلام احمد وعقیدتہ وتدرجہ فی الدعاوی۔

تیسرا باب ـــــ القادیانی فی المیزان

چوتھا باب ـــــ القادیانیۃ فی المیزان

پہلا باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ فصل اول میں بدء قادیانیت کے وہ حالات دکھائے گئے ہیں جو اسکے نشو ونما کے لیے مساعد ہوئے۔ فصل دوم میں مرزا جی کی پیدائش سے وفات تک کا تذکرہ ہے۔ سوم میں۔ اُن کے خلیفہ اوّل حکیم نورالدین بھیروی کا تعارف ہے ـــ یہ باب مختصر ہے۔

باب دوم میں بھی تین فصلیں ہیں۔ ۱ مرزا، ایک مصنف اور داعی اسلام کی حیثیت میں۔ ۲ تصنیف و دعوت سے دعوئے "مسیح موعود" تک۔ ۳ "مسیحیت" سے نبوت اور اس سے بھی آگے تک۔

باب سوم میں چار فصلیں ہیں۔ ۱ زندگی اور معیشت۔ ۲ برطانوی حکومت کی پشت پناہی اور تنسیخ جہاد۔ ۳ فحش کلامی اور بدگوئی۔ ۴ پیشنگوئی، جو پوری نہیں ہوئی۔

چوتھا باب بھی چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ اوّل ـــ ایک متوازی دین اور متوازی امت۔ دوم ـــ نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت۔ سوم ـــ لاہوری شاخ، اس کا عقیدہ اور تفسیر (از مولوی محمد علی ایم اے) چہارم ـــ قادیانیت نے کیا دیا؟

اس تفصیل سے کتاب کی جامعیت کا کافی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کی عمومی حیثیت ایک جامع متن کی ہے، یا اسے آئینہ قادیانیت کہہ لیجئے ـــ قادیانیت کے اصل آخذ ...... سے بھرپور (اور منتخب) مواد ہر فصل میں دیدیا گیا ہے۔ صرف آخری باب کی بعض فصلیں ایسی ہیں جن میں مواد کم اور تبصرہ زیادہ ہے۔

آیئے، کچھ تھوڑی سی سیر بھی اس کتاب کی کریں!

قادیانیت کے لئے مساعد حالات

انیسویں صدی عیسوی کا دور عالم اسلامی کے بڑے فکری اضطراب اور شدید ذہنی کشمکش کا دور تھا۔

۱۸۵۷ء کے حادثۂ ہزیمت اور اس کے لائے ہوئے مصائب نے ہندوستان میں یہ اضطراب اور کشمکش سب ہی جگہ سے زیادہ شدید کردی تھی۔ ایک عجیب اندرونی افراتفری برپا تھی۔ مسلمانوں پر یاس نے اس حد تک غلبہ پالیا تھا کہ کسی معجزانی عامل کے بغیر حالات کی اصلاح ناممکن نظر آنے لگی تھی، پنجاب میں یہ صورت حال باقی تمام ہندوستان سے بھی شدید تر تھی، کیونکہ وہاں سکھوں کی وحشی حکومت نے مسلمانوں کا حال اور بھی زیادہ خراب کر رکھا تھا۔ یہ حال تھا جو کسی کے مہدیٔ موعود بن کر ظاہر ہونے کے لئے بڑا سازگار تھا۔ (خلاصہ باب اول۔ فصل اوّل)

دعوائے مسیحیت و نبوت اور اسکی تمہید مرزا غلام احمد قادیانی (پیدائش ۱۸۳۹ یا ۴۰) ان حالات میں ایک اسلامی مصنف، مناظر اور داعی کے روپ میں ظاہر ہوئے، اور دس بارہ سال تک، اپنی تالیفات و ملفوظات میں مناسب موقعوں سے، عنوان بدل کر، امتیوں کے لیے خصائص و مراتب نبوت کے امکانات لوگوں کو پلاتے رہے، اور پھر جب زمین پوری طرح تیار ہوگئی تو اس انداز سے دعوائے "مسیحیت" کی طرح ڈالی کہ ثانی اثنین حکیم نورالدین (خلیفۂ اول) نے ایک خط میں عرض کیا کہ حضور تو "مثل مسیح" اور ان احادیث کا مصداق ہیں جن میں نزول مسیح کی خبر دی گئی ہے۔ پھر آپ اس کا دعویٰ کیوں نہیں فرماتے؟ جواب دیا کہ اس عاجز کا منتہائے آرزو بس یہ ہے کہ "جدخلہ اللّٰہ فی عبادہ المتواضعین المطیعین" (اللہ تعالیٰ اپنے مطیع و متواضع بندوں میں داخل کرلے) مجھے اس بلند بانگ دعوے کی کیا حاجت ہے؟ ـــــ مگر قبل اسکے کہ سال (۱۸۹۱ء) گزرے، یہ تکلف برطرف ہوگیا اور سننے والوں کو خوشخبری سنادی گئی کہ تم نے مسیح موعود کا وہ عہد معہود پا لیا ہے جس کے انتظار و اشتیاق میں تمہارے باپ دادے اس دنیا سے گزر گئے۔

اسکے بعد جب آٹھ نو سال کے عرصہ میں معتقدین کو "آمنا وصدقنا" کہنے کی اچھی طرح عادت پڑگئی تو اصل منتہائے آرزو (مرتبۂ نبوت) کی طرف اس حزم و احتیاط کے ساتھ قدم اٹھایا گیا کہ ایک جمعہ میں یکایک جامع قادیان کے خطیب نے "اپنی طرف سے" انکشاف کیا کہ مرزا صاحب نبی و رسول ہیں، اور دیگر انبیاء کی طرح ان پر بھی ایمان واجب ہے۔ مرزا صاحب نہایت خاموشی کے ساتھ ہفتہ بھر اس شگوفہ کا ردعمل دیکھتے رہے۔ اندازہ ہوا کہ سوائے چند "بدنصیبوں" کے یہ گولی

بھی لوگ ہضم کرلیں گے۔ لہٰذا دوسرے جمعہ میں خطیب صاحب نے "ملأ اعلیٰ" کے اشارہ سے پھر وہی راگ چھیڑا۔ اور اب کی مرزا صاحب کو بھی مخاطب کیا کہ "غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں" مرزا صاحب خاموش رہے۔ نماز اطمینان کے ساتھ ہوگئی، ارادہ فرمایا کہ واپس ہوں۔ خطیب صاحب نے دامانِ مبارک پکڑ لیا کہ اب تو آپ کو بات صاف کرنا ہی ہوگی، میرا خیال غلط تو نہیں ہے؟ ـــــ کہیں اتنے پر جا کر مرزا صاحب نے بصد تکلف زبان کھولی کہ "ھذا الذی ادین بہ و ادعیہ" (ہاں بھئی، بات یونہی ہے!) اور پھر پوری درازنفسیوں کے ساتھ نبوت ہونے لگی ـــــ

(خلاصۂ باب دوم)

حیاتِ و معیشت "نبی"! ان نبی صاحب کی ـــ جو (معاذ اللہ) خود تمام انبیاء سے بڑھ کر اور ان کے "صحابہ" تمام نبیوں کے اصحاب سے بڑھ کر تھے ـــــ زندگی اور معیشت۔ کیا تھی؟ اس روحانی سیادت سے پہلے وہ نہایت خستہ حال تھے، لیکن جب اس سیادت نے فتوحات کا دروازہ کھول دیا، تو معیشت کا رنگ یہ ہوا کہ خواجہ کمال الدین مولوی محمد علی لاہوری سے گلے مل کر روتے ہیں کہ ہم اپنی عورتوں اور بیٹیوں کو اقتداءِ اصحاب نبیؐ کی ترغیب دے کر زہد و قناعت پر آمادہ کرتے اور اس طرح اپنے مال میں سے قادیان کا حصہ نکالتے تھے، مگر جب ہماری یہ عورتیں، بیٹیاں قادیان گئیں اور دیکھا کہ مرزا صاحب کے گھرانے کے کیا ٹھاٹھ باٹھ ہیں، تو انھوں نے کہدیا کہ تم اب تک ہمیں دھوکے میں رکھتے تھے۔ اب ہم قادیان کی خاطر زہد و قناعت کا کوئی وعظ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

پسر تمام کند ...... ایک ایسا شخص جو قادیانیوں کے ہاتھ پر "مسلمان" ہوا، انھیں کی تربیت میں رہا۔ مصر میں اسے تعلیم دلائی گئی اور جامعہ تعلیم الاسلام قادیان کا پرنسپل بنا۔ امامت میں مرزا بشیر الدین محمود (موجودہ خلیفہ و فرزند مرزا غلام احمد) کی نیابت کا اعزاز تک اُسے حاصل تھا اسی شخص پر جب "اسرارِ خلوت" کھلے تو ۱۹۳۸ء میں ایک عدالتی بیان میں اس نے قلمبند کرایا کہ

"مرزا بشیر الدین محمود اعلیٰ درجہ کا فاسق ہے، وہ دینی پیشوائی کے پردے میں نوجوان لڑکیوں کا شکار کرتا ہے۔ اس کام کے لیے عورتوں اور مردوں میں

سے اُس نے باقاعدہ دلال چھوڑ رکھے ہیں"

(باب سوم۔ فصل اول)

اِن اپنی کتابوں کے بارے میں تحریر ہے کہ

" یہ ایسی کتابیں ہیں کہ ہر مسلمان ان کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کے علوم و معارف سے استفادہ کرتا ہے۔ اور میری دعوت کی تصدیق کرتا ہے۔ بجز کسبیوں کی اولاد کے" (او کما قال) ـــ الخ (فصل سوم)

کفرِ ملّةٌ واحدة ڈاکٹر شنکر داس مہرا، اخبار " بندے ماترم" میں لکھتے ہیں :۔

احمدی (قادیانی) تحریک کی ترقی، عربی تہذیب اور اسلامی وحدت پر ایک بے پناہ ضرب ہے۔۔۔۔۔۔

احمدی تحریک اسلام اور عرب تہذیب کی واحد حریف ہو اسی لیے احمدی تحریک خلافت سے علحٰدہ رہے، کہ وہ ترکی اور جزیرۂ عرب کے بجائے قادیان کو مرکز خلافت بنانا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ خواہ مسلمانوں کے لیے کتنا ہی تکلیف دہ ہو، کہ وہ ہمیشہ اتحاد اسلامی اور اتحاد عربی کے خواب دیکھا کرتے ہیں لیکن وطن پرست ہندوستانیوں (غیر مسلموں) کے لئے سرچشمۂ سرور و اطمینان ہے!"

(باب چہارم فصل اول)

اس سے زیادہ کی اِن صفحات میں گنجائش نہیں۔ کتاب شروع سے آخر تک پڑھنے کی ہے۔ بہت ہلکی پھلکی اور نہایت کارآمد۔ ہم جیبوں کے لیے خاص طور پر مفید نی اور قادیانیت کی خرافات و مہملات کا طومار پڑھنے کی تاب نہیں رکھتے ـــ نہ بہترین عربی ٹائپ سے ہوئی ہے اور کاغذ بھی اعلیٰ درجہ کا لگا ہے۔

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ۔ دفتر الفرقان، کچہری روڈ۔ لکھنؤ

مولانا اصلاحی کی شخصیت تعارف سے بے نیاز ہو۔ وہ ایک صاحب فکر عالم ہیں اور ایک خاص قرآنی مکتب فکر کی امانتوں کے حامل ہیں۔ ہمارا اشارہ استاذ حمید الدین فراہی کے اسکول کی طرف ہو جس کے غالباً اسوقت سب سے بڑے فاضل مولانا موصوف ہی ہیں۔ مولانا کا یہ ماہنامہ جون سے نکلنا شروع ہوا اور دو شمارے اس وقت تک آ چکے ہیں۔ دونوں کے دونوں اول سے آخر تک مولانا ہی کے اثرات خامہ پر مشتمل ہیں اور ہر مضمون قابل مطالعہ اور لائق استفادہ ہے۔ "تذکرہ و تبصرہ" (اداریہ) تو مستقل عنوان ہے ہی۔ "تدبر قرآن" اور "تزکیہ نفس" کی نوعیت بھی مستقل عنوانات ہی کی سی ہے —— تدبر قرآن، مولانا کی تفسیر قرآن کا نام ہو جسے الفرقان نے اس ماہنامہ میں "بسم اللہ" سے شائع کرنا شروع کیا ہو یہ خصوصاً طلباء اور تعلیم یافتہ حضرات کے استفادہ کے لائق ہو۔ "تزکیۂ نفس" اُن کے مضامین کا ایک سلسلہ ہے۔ جس کا کافی حصہ میثاق سے پہلے دوسرے بعض رسالوں میں نکل چکا ہے۔ اس سے متوسط درجہ کے عوام بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جولائی کے شمارہ میں "انفاق اور آفات انفاق" کا مضمون ہو۔ جس کا ایک حصہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے جو اس کے مفید اور پسندیدہ ہونے ہی کی دلیل ہے۔

تفسیر قرآن کی طرح "اسلامی قانون" بھی مولانا اصلاحی کا خاص موضوع مطالعہ ہے چنانچہ اس موضوع پر بھی ان کے مضامین پہلے ہی شمارہ سے میثاق میں آ رہے ہیں۔ گذشتہ سال سفر حج میں مولانا نے جو سفرنامہ تیار کیا تھا اس کی قسطیں بھی میثاق میں نکل رہی ہیں کسی صاحب فکر اور صاحب قلم مومن کے سفرنامۂ حجاز میں جو خصوصیتیں ہو سکتی ہیں وہ قریب قریب سب اس میں موجود ہیں۔ وللناس فیما یعشقون مذاھب۔

ہمیں امید ہے کہ تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ نیا دینی ماہنامہ خاص طور پر مقبول ہوگا۔ اور "میثاقِ ایمانی" کی تجدید کا باعث بنے گا۔ جو اس کا مقصد اشاعت ہے۔

۱۔ چہل حدیث زوجین	از درویش میر شبیر علی صاحب چشتی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی		۶۶ صفحات قیمت ۵۰ نئے پیسے
۲۔ چہل حدیث سلوک			۱۴۰ صفحات قیمت ۵۰ نئے پیسے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ نشاۃِ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد دکن

چہل حدیث کا انتخاب اور اشاعت حدیث کی مد سے ایک مبارک کام ہے۔ میر شبیر علی صاحب نے اسی جذبہ سے چہل حدیث کے یہ دو مجموعے مرتب کیے ہیں۔ نمبر ا میں ایسی چالیس حدیثیں (مع ترجمہ و تشریح) ہیں جن سے میاں بیوی کے باہمی حقوق، ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اولاد پر ماں باپ کے حقوق، نیز عورتوں کے باہمی حقوق واضح ہوتے ہیں، گویا کتاب کا دائرہ اپنے موضوع سے وسیع تر ہے۔ کتاب کی فی الجملہ افادیت میں شبہ نہیں، مگر اس میں اصلاح اور نظر ثانی کی بہت گنجائش ہے۔ نمبر ۲ میں ایسی چالیس حدیثیں ہیں جو سالکین کے لیے مشعل راہ ہیں ان کے ساتھ بھی ترجمہ اور مختصر تشریحات ہیں، یہ انتخاب جستہ جستہ نظر سے بہت مناسب نظر آیا۔ سالکین کیا ہر مسلمان کے کام کی چیز ہے —— مرتب پر ذرا کہیں کہیں صوفیت غالب ہو گئی ہے۔ مثلاً "اپنے مبشرات سے مراد مرید کے اپنے خواب ہیں، دوسروں کے مبشرات پیر کے خواب ہیں جو مرید کے لیے دیکھتا ہے" (صفحہ ۳) یہ تحدید تو حدیث سے زائد ہے۔

انسانی فضیلت کا راز	از حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی۔ ۱۰۴ صفحات قیمت بارہ آنے۔ ناشر:۔ دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور)

یہ مولانا موصوف کی ایک تقریر ہے جو دار العلوم حقانیہ کے جلسۂ دستار بندی (اکتوبر ۱۹۵۹ء) میں فرمائی گئی تھی۔ اس میں مولانا نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسانی فضیلت کا راز وہ امانت علم ہے جو پیغمبروں کے ذریعہ نوعِ انسانی کو ملی ہے، مولانا کے بیان کی عالمانہ شان اور اس کی دل نشینی اور دلپذیری ایک حرف بیان کی بھی محتاج نہیں، ہند و پاکستان میں کم لوگ ہوں گے جنھیں موصوف کے مواعظ و بیانات سننے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ اس تقریر کے مطالعہ سے لوگ ان شاء اللہ

وہی لطف اور وہی فائدہ حاصل کریں گے جو مجلس تقریر میں شرکت سے حاصل ہوتا — دارالعلوم حقانیہ کے ادارۂ نشرواشاعت نے اچھا کیا کہ اس کو شائع کرکے عام کر دیا۔

۱۔ **میراث محبوب** : از پیرزادہ سید نثار علی صاحب نظامی } ناشر: کتب خانۂ انجمن ترقی اردو

۲۔ **مرقع اسناد** : علامہ اخلاق حسین صاحب دہلوی } جامع مسجد، دہلی

یہ دونوں رسالے سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی جدّی وراثت اور نسبی جانشینی کے ایک دعوے کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ اس نزاع سے دلچسپی یا درگاہ سلطان المشائخ سے وابستگی رکھنے والوں کے لیے لائق مطالعہ ہیں۔ بحث سنجیدہ اور تحقیقی انداز سے کی ہے۔ پہلے رسالہ پر قیمت درج نہیں ہے۔ ۲ پر دس روپے درج ہے یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی، جبکہ ضخامت کل ۲۴ صفحات ہے۔ اول الذکر کی بھی ضخامت اتنی ہی ہے۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک زندہ فیصلہ ہے، وہ اصل یہ

اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے۔

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لاتے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی والی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں، ہم اس کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرة

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

"ادارۂ الفرقان"

مسئول

محمد منظور نعمانی

مرتب

عتیق الرحمٰن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو میں بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مشترک تالیف ہے [illegible] اس لحاظ سے [illegible] کہ اس کے مطالعہ سے حج کا [illegible] تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے اور دل میں عشق و محبت اور ذوق و شوق کی وہ کیفیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو اصل حج کی روح اور جان ہیں

کاغذ سفید ... قیمت مجلد ... ۳/-

آسان حج — یہ آسان زبان میں "حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے [illegible] اسان اور [illegible] اردو بھی پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں

طباعت معیاری ... قیمت ... [illegible]

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو [illegible] خاص مقبولیت عطا فرمائی ہے پچھلے چند سالوں میں تقریباً [illegible] ہزار اردو [illegible] شائع ہو چکی ہے

[illegible] کافی ہے۔

[illegible] طباعت [illegible]

[illegible] قیمت تین روپے ۳/-

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

[illegible] مولانا نعمانی

اس میں اسلام کے کلمۂ دعوت
"لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ"
کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ مطالعہ سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے
اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ... /۶/-

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمۂ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل، جذبات اور دل و دماغ کو یکساں متاثر کرتا ہے

قیمت .... /۱۲/-

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت /۶/-

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت ۱/-

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب ... قیمت ۱/-/-

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے قابل قدر فاضلانہ اور مبسوط مقدمہ ۲/۸/-

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی قیمت ۱/۸/-

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ .... قیمت ۱/-/-

انیس نسواں

از محترمہ بیگم سید [illegible] حسین صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کے علاج اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے ...... قیمت /۱۰/-

برکات رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن "صوم رمضان" اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت مؤثر اور شوق انگیز بیان اور حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن۔ قیمت /۱۲/-

ماہنامہ
الفرقان لکھنؤ

فی کاپی ..... آٹھ آنے

ہندوستان پاکستان سے
سالانہ چندہ (دیگر ہندوستان) ۶/،
سالانہ چندہ (دیگر پاکستان) ۷/،
ششماہی ... ... ۳/،

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ..... ۱۰ شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ .... ۲۵/،

جلد ۲۷ | بابتہ صفر المظفر ۱۳۷۹ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۹ء | شمارہ ۲

تصحیح محرم ۱۳۷۹ھ کا شمارہ غلطی سے "مطابق جولائی ۱۹۵۹ء" لکھ گیا تھا۔ براہ کرم جولائی کاٹ کر اگست لکھ لیجئے تاکہ آئندہ غلط فہمی نہ ہو۔

اگر اس دائرہ میں ○ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ وی پی میں آپ کے کچھ آنے زائد صرف ہوں گے رسالہ دیر سے بھی پہنچے گا، چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ ستمبر تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار :- اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلین بلڈنگ، لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت :- رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی کو روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۱۰ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں ان کی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :-

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

بے وقوفی سے یا بھول چوک سے کسی حصہ میں آگ لگا دے' تو کون عقلمند ہوگا جو کہے کہ پہلے بیرونی حملہ پسپا کر دو آگ بعد میں بجھانا؟ ظاہر ہے کہ اہل خانہ، اہل محلہ یا اہل شہر کو دونوں کام ساتھ ساتھ کرنا پڑیں گے اور یہی دانشمندی اور عاقبت اندیشی ہوگی! کوئی کہنے لگے کہ بیرونی حملہ پسپا نہ ہوا اور دوسری طرف توجہ کی وجہ سے قوت مدافعت کمزور پڑ گئی تو آگ سے جو کچھ تم بچا ؤگے اُس سے بھی محروم ہو جاؤگے، اس لیے کہ وہ دشمن لے اُڑے گا۔ لہٰذا سب یکسو ہو کر بیرونی مورچے ہی پر ڈٹے رہو تاکہ آگ سے جو کچھ خود بچ رہے (جیسے سِکّے اور معدنیات وغیرہ، بلکہ خود وہ زمین جس پر از سرِ نو تعمیر کی جا سکتی ہے) وہ تو تمھارا رہے، بتائیے کون ہے جو اس منطق کو قبول کر لے گا؟

اسی طرح یہ منطق بھی سخت تباہ کن ہے کہ فلاں اصول سے زیادہ سے زیادہ نظام عمل میں کچھ فتور پیدا ہو جائے گا، مگر یہ جو الحاد و بیدینی کا سیلاب ہے، اس میں تو ایمانیات اور اساسات دین تک کی خیر نہیں۔ پس' پہلے اس کو روکو۔ اندر کے فتنوں کی بعد میں خبر لینا۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کا خطرناک اصول اگر کوئی ایسا شخص پیش کرتا ہے جس کا اہل دین میں کوئی خاص وقار اور کوئی خاص وزن نہیں ہے تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق اہمیت کے باوجود اتنی توجہ اور اتنی فکر کا مستحق نہیں ہے جتنی توجہ اور جتنی فکر کا مستحق ایسا کوئی وہ اصول ہے جو کسی ایسی شخصیت کی طرف سے پیش کیا جائے جسے اہل دین کی نظر میں کوئی خاص وزن اور کسی دینی طبقہ کی نظر میں دینی اتھارٹی کی حیثیت حاصل ہو۔ ایسے کسی شخص سے اگر ایسی کوئی بات سرزد ہوتی ہے تو اُس پر اُسے ٹوکنا خصوصیت کے ساتھ زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک بڑی جماعت کی گمراہی کا خطرہ یقینی ہے۔

ہاں اب یہ اس شخص کا اور اُس کے حامیوں کا فرض ہے، اگر وہ مخلص ہیں، کہ انھیں اگر کسی بات پر ٹوکا جاتا ہے تو وہ اس کو نزاع کی صورت نہ دیں۔ تاکہ حتی الامکان اور کسی کسی حد تک اتحاد و تعاون کی گنجائش باقی رہ سکے۔ لیکن اگر وہ "اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ" کا مظاہرہ کرنے لگ جائیں۔ اور ایک اصولی اختلاف کو زبردستی ذاتی عناد کا نتیجہ قرار دیکر تنابز بالالقاب کی مہم شروع کر دیں۔ تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اتحاد و تعاون کی گنجائش برقرار رکھنا کسی بھی شخص کے بس کی بات نہیں۔

اور اسکی تمامتر ذمہ داری اسی شخص پر ہے جو بحث کو یہ غلط رنگ دے ــــــــ تاہم یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص ضبط و تحمل سے کام لے کر، اپنی حد تک فضا کو زیادہ خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کرے۔

لیکن اسکے بعد اگر یہ درجہ آجائے کہ حق واضح ہوجانے پر اور اسکی شہادتیں چاروں طرف سے ہویدا ہوجانے پر بھی آدمی اپنی بات کی پچ میں پینترہ بازی دکھائے اور اپنی ساری ذہانت، ساری استدلالی قوت اور تقریر و تحریر کی تمامتر مہارت ایک باطل کو حق بنا دینے میں صرف کرنے لگے۔ کتاب و سنت کا غلط استعمال کرے اور فقہاء و محدثین کے بیانات کو بے محل استعمال میں لائے۔ اور اس طرح ایک اصولی گمراہی کے ساتھ ساتھ دس جزئی علمی و دینی غلط فہمیاں لوگوں میں پیدا کرے۔ تو ہرگز روا نہیں ہے کہ اسکے ساتھ ادنیٰ رعایت کی جائے۔ وہ اگر عصری طوفانوں کے مقابلہ میں "اصل دین" کی حفاظت کی کوئی بڑی خدمت بھی انجام دے رہا ہے اور ان طوفانی لہروں کی تخریب کے مقابلہ میں تعمیرِ نو کا علمبردار ہو۔ تو لوگ ایسی تعمیر کو لیکر کیا کریں گے جس میں کتنی ہی خرابیوں کی صورتیں پیشگی مضمر ہوں؟ اور جسکا معمار اس بات کا روادار ہو کہ محض اپنے وقار کی خاطر دین کے کتنے ہی حصہ کو کسی وقت خود اپنے ہی ہاتھوں مسخ کردے۔

تَحْسَبُونَہٗ ھَیِّنًا وَّ ھُوَ عِنْدَ اللہِ عَظِیْمٌ۔

ارشاداتِ مجدّدِ الفِ ثانیؒ

مکتوبات کے پیرایے میں

تلخیص و ترجمہ ——— مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی

مکتوباتِ معصومیہ کے تلخیص و ترجمہ کے بعد اب مکتوباتِ امام ربّانی ہر سہ جلد کی تلخیص کا کام شروع کر رہا ہوں ——— وہ مکتوبات جو بلند حقائق و معارف پر مشتمل اور متوسط اذہان سے بالاتر ہیں ان کو اس انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا ہے ——— احسان و تصوف، تعمیر باطن اور اُمّتِ مسلمہ کی عام بہبودی اور ملّتِ بیضا کی سرسبزی کے لیے جو کچھ جس مکتوب میں ہے اس کو شامل کیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ارادہ ہے کہ مکتوب الیہم کے حالات بھی جہاں تک معلوم ہو سکیں وہ حاشیے پر لکھ دیے جائیں، تاکہ معلوم ہو کہ مجدّد الف ثانیؒ نے احیاء سنت اور ترویج احکام شریعت کی جدّ و جہد میں اُس زمانے کی عظیم و مؤثر شخصیتوں سے مکاتبت کر کے کس کس پیرایے میں اپنے درد دل کو صفحات و رقعات کے سپرد کیا ہے، اور کس حذاقت کے ساتھ اُمت کے اصل مرض کی تشخیص اور ازالے کی تجویز پیش کی ہے۔ درحقیقت آپ نے اپنے خلفاء و مریدین کے علاوہ دیگر علماء و صلحاء، اُمراء و حکام، عوام و خواص غرضکہ سب کے سامنے احساسِ عظمتِ دین کی ضرورت رکھی اور سب کو بیدار کیا۔ ——— تاریخ گواہ ہے کہ مستقبل قریب میں ان مکتوبات کی صدائے بازگشت نے قافلۂ اُمّتِ مصطفویہ کے حق میں امیرِ کارواں کا کام انجام دیا ——— اور نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ آج بھی ان مکتوبات کی روشنی میں ہم اپنی منزلِ مقصود کا پتہ چلا سکتے ہیں ——— گو ترجمہ لفظی نہ ہو گا۔ لیکن حتی الامکان کوشش اس امر کی ہوگی کہ لفظوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مفہوم پیدا اور واضح

ہوجائے ـــــ اللہ تعالیٰ اس کام کو بحسن و خوبی انجام پذیر کرے اور ان ارشادات عالیہ پر عمل پیرا ہونے کی مجھے اور تمام مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے ـــــ (آمین)

[نسیم احمد فریدی غفرلہٗ]

مکتوب (۲۳) جلد اول ـــــ عبدالرحیمؒ خانخاناںؒ کے نام (بزبان عربی)

{ناقص پیر سے اخذ طریقہ کی مضرت اور کفریہ لقاب کی ممانعت کے بیان میں}

تمہارا خط مجھے ایک صاحب سے ملا اور انھوں نے زبانی بھی تمہارا پیغام پہونچایا۔ میں نے (قاصد کی آمد پر) یہ شعر پڑھا۔

اھلاً لسعدیٰ والرسول وحبذا ‌ ‌ ‌ ‌ وجہ الرسول لحبّ وجہ المرسلِ

(سُعدیٰ اور اس کے قاصد کو مرحبا ـــــ خط بھیجنے والے کی محبت کی بنا پر قاصد کی ذات قابل مدح ہے)

لہ مرزا عبدالرحیم بن بیرم خاں خانخاناں ـــــ ۱۴ صفر ۹۶۴ھ کو لاہور میں امیر جمال خاں میواتی کی صاحبزادی کے بطن سے پیدا ہوئے ـــــ چار سال کی عمر تھی کہ باپ پٹن گجرات میں قتل ہوگئے۔ آگرہ میں ان کی پرورش ہوئی۔ تعلیم مولانا محمد امین اندجانی، قاضی نظام الدین بدخشی، حکیم علی گیلانی اور علامہ فتح اللہ شیرازی سے حاصل کی، گجرات پہونچ کر شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی سے بھی اخذ علوم کیا ـــــ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً اکبر بادشاہ نے ان کو جہانگیر کا اتالیق مقرر کیا، پھر یہ برابر ترقی کرتے رہے ـــــ بلاد گجرات، بلاد سندھ اور اقطاع اقلیم دکن انھیں کے ہاتھ پر فتح ہوئے۔ خانخاناں (امیرالامراء) ان کا لقب تھا۔

عربی، فارسی، ترکی اور ہندی چاروں زبانوں کے ماہر تھے اور فصاحت کے ساتھ ان زبانوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتے تھے۔ شعر گوئی میں بھی کمال حاصل تھا، علم ادب اور فن تاریخ میں خاص ملکہ تھا ـــــ تزک بابری جو ترکی زبان میں تھی اس کا ترجمہ سب سے پہلے انھوں نے ہی ۹۹۸ھ میں کیا، مطالعہ کتب کا اتنا شوق تھا کہ گھوڑے کی پشت پر عین میدان جنگ میں بھی کتاب ہاتھ میں رہتی تھی اور حد یہ ہے کہ غسل کرتے وقت بھی غسل خانے سے باہر ایک خادم کتاب کے اجزاء ہاتھ میں اٹھائے کھڑا رہتا تھا، ان کے یہاں علماء کا اتنا مجمع رہتا تھا کہ کسی بادشاہ یا امیر کے یہاں اتنا نہیں پایا گیا۔ علماء کا انتہائی اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ اموال و صلات سے برابر ان کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ ان کی امداد

(باقی ص ۔۔)

اور کمالات کی استعداد رکھنے والے بھائی! اللہ تعالیٰ تمھاری استعداد کو قوۃ سے فعل میں لائے۔ ——— سنو ——— دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ افسوس اس پر ہے جو یہاں زراعت نہ کرے۔ زمینِ استعداد کو معطل اور تخمِ اعمال کو ضائع کردے ——— یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ زمین کو بیکار اور ضائع کر دینا دو طریقے پر ہوتا ہے۔

(۱) یا تو اس میں کچھ بویا ہی نہ جائے۔ (۲) یا اس میں خراب بیج ڈالے۔

امر دوم: مضرت و فساد کے لحاظ سے امرِ اول کے مقابلے میں زیادہ شدید ہے جیسا کہ ظاہر ہے ——— بیج کی خرابی اور اس کا فساد یہ ہے کہ کسی ناقص پیر سے طریقہ اخذ کرکے اس کے مسلک پر گامزن ہو۔ اسلئے کہ ناقص پیر اپنی خواہشاتِ نفسانی کا پیرو ہوتا ہے اور وہ بات جو خواہشِ نفسانی سے آمیختہ ہوتی ہے کچھ اثر نہیں کرتی، اور اگر اثر کرے گی تو خواہشات کے لیے ہی معین و مددگار ہوگی، پس ظلمت پر ظلمت بڑھے گی۔ ——— نیز ناقص کو یہ تمیز بھی نہیں ہوتی کہ کون سا راستہ اللہ تک پہونچا تا ہے اور کون سا نہیں؟ اس لیے کہ وہ خود واصل نہیں ہے ——— اور اسی طرح وہ طلبہ کی مختلف استعدادوں کی بھی تمیز نہیں رکھتا اس کو "طریقۂ جذبہ" اور "طریقِ سلوک" میں بھی امتیاز نہیں ہوتا، بسا اوقات ایک طالبِ علم کی استعداد ابتداءً طریقِ جذبہ کے مناسب اور طریقِ سلوک کے غیر مناسب ہوتی ہے، اور وہ ناقص رہنما اس کو (اس کی استعداد کے برخلاف) طریقِ سلوک پر گامزن کرتا ہے، لہٰذا اس کو بھی اپنا جیسا گمراہ کر دیتا ہے ——— شیخِ کامل و مکمل جب کسی ایسے (گم کردہ منزل) طالب کی تربیت کرتا ہے تو اولاً اس کو اس امر کی احتیاج ہوتی ہے کہ وہ پیرِ ناقص کے غلط اثرات کو زائل کرے اور اس کے سبب جو فساد لاحق ہوا ہے اس کی اصلاح کرے

(بقیہ حاشیہ صـــ)
دور دراز علاقوں تک علماء کے پاس پہونچتی تھی۔

شعراء کا بھی ایک بڑا گروہ ان کے اردگرد جمع ہوگیا تھا ——— غرضکہ یہ علم وادب حلم و تواضع اور شجاعت و کرم کا مرقع تھے ——— علامہ حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے نزہۃ الخواطر جلد خامس میں مآثر الامراء اور خزانۂ عامرہ کے حوالے سے ان کے مفصل حالات لکھے ہیں اور فرمایا ہے۔ لم نسمع من الهند احد مثله ولا من غيره من الاقاليم السبعة من يكون جامعاً لاشتات الفضائل یعنی ہندوستان بلکہ ہفت اقلیم میں ایسا جامع فضائل امیر پیدا نہیں ہوا۔ ۱۰۲۹ھ میں وفات پائی اور دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ کے سامنے دفن ہوئے۔ حضرت مجدد الف ثانی ؒ کے متعدد مکتوبات ان کے نام ہیں۔

ـــــ پھر وہ تخم صالح جو اس طالب کی استعداد کے موافق ہو اس کی استعداد کی زمین میں ڈالے ـ اس سے پیداوار اچھی ہوگی ـــــ .... صحبت شیخ کامل، کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے، اس کی نظر دوا اور اس کا کلمہ شفا ہے .... اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمھیں جادۂ شریعت مصطفویہ پہ ثابت قدم رکھے کیونکہ یہی امر مدار نجات اور ذریعہ سعادت ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

محمد عربی کا بروئے ہر دو سرا ست　　کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

.... اس حال (تعجب) نے یہ بھی بیان کیا کہ تمھارے حاضر باش شعراء میں سے ایک شاعر صاحب کفری تخلص فرماتے ہیں، حالانکہ وہ صاحب (نسباً) سادات عظام میں سے ہیں ـــــ خدا جانے ان شاعر صاحب کو اس غلط قسم کے تخلص پر کس چیز نے آمادہ کیا ـــــ مسلم کو چاہیئے کہ وہ اس قسم کے ناموں سے ـــــ جتنا شیر خونخوار سے بھاگتا ہے اس سے بھی زیادہ بھاگے ـــــ اور پوری پوری کراہت کرے، اس لیے کہ یہ اسم (کفر)، اور اس کا مسمیٰ دونوں اللہ اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور تمام سچے مسلمانوں کے نزدیک قابل بغض ہیں۔ پس ایسے اسم قبیح سے پرہیز کرنا واجب ہے ـــــ اور بعض مشائخ کی عبارات میں غلبۂ سکر کی بنا پر کفر کی مدح اور زنار بندی کی جو ترغیب پائی جاتی ہے وہ عبارات ظاہر معنیٰ سے پھیر لی گئی ہیں اور ان کی تاویل کی گئی ہے۔ اس وجہ سے کہ اہل سکر کا کلام محمول علی التاویل ہوتا ہے اور "ظاہر متبادر" سے پھیر لیا جاتا ہے ـــ وہ غلبۂ سکر کی بنا پر معذور ہوتے ہیں ...... لیکن جو اہل سکر نہیں وہ ان کی تقلید میں غیر معذور ہیں۔ ان بزرگوں کے نزدیک بھی اور عند الشرع بھی ......

اُن صاحب سے میری جانب سے کہو کہ وہ اپنا تخلص تبدیل کر کے اسلامی تخلص رکھیں، یہ تخلص، حال و قال مسلم کے موافق بھی ہے ـــ اور اس اسلام کی طرف اس کا انتساب ہے جو عند اللہ و عند الرسول پسندیدہ ہے ـــــ اور اس میں موقع تہمت سے بچنا بھی ہے جس کا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے) ان الفاظ میں حکم فرمایا ہے ـــــ اتقوا من مواضع التہم ـــــ (تہمت کے موقعوں سے بچو) ـــ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ولعبدٌ مومن خیرٌ من مشرکٍ ـــــ مومن بندہ مشرک سے بہتر ہے ـــ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ ـــــ

مکتوب (۲۴) محمد قلیج خاں[1] کے نام ـــــ (بزبان عربی)

[1] امیر کبیر فاضل علامہ قلیج محمد حنفی الاندجانی ـــ ان کو اکبر بادشاہ نے قلعہ سورت کی حفاظت کے لیے مقرر (باقی صفحہ)

سلکم اللہ سبحانہ وعافاکم بحرمۃ سید المرسلین علیہ وآلہ الصلوات والتسلیمات

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہی) المرء مع من احب (آدمی اس کے ساتھ ہو جس سے اُس کی محبت ہی) پس خوشا نصیب اس کے جس کے قلب میں اللہ کے ماسوا کی محبت نہ ہو اور وہ اللہ کی مرضیات کے علاوہ کسی چیز کا ارادہ نہ کرے۔ ایسا آدمی اللہ کے ساتھ ہی ہو۔ اگرچہ اس کا ظاہر مع الخلق ہو......

...... قلب سے ایک سے زیادہ کی محبت متعلق نہیں ہوتی۔ جب تک کسی ایک سے تعلق حبّی قائم ہو، اس کے ماسوا سے محبت نہیں ہوگی ــــ اور یہ جو دیکھنے میں آتا ہو کہ اشیا متعددہ سے انسان کو محبت ہو جیسا کہ مال، اولاد، مدح، رفعت عند الناس سے ــــ درحقیقت یہ سب مل کر ایک ہی چیز بنتی ہو اور وہ نفس ہو ــــ ان سب مذکورۂ بالا چیزوں کی محبت اسی ایک نفس کی محبت کی فرع ہو، کیونکہ یہ سب چیزیں (آدمی) نفس ہی کیلئے چاہتا ہو۔ فی نفسہٖ ان اشیا کو نہیں چاہتا ــــ جب اس سے اپنے نفس کی محبت زائل ہوئی تو تبعاً ان تمام چیزوں کی محبت بھی زائل ہوگئی ــــ اسی لیے کہا گیا ہو کہ عبد اور رب کے درمیان نفسِ عبد، حجاب ہو۔ عالم حجاب نہیں ہو ــــ اس لیے کہ عالم فی نفسہٖ بندے کا مقصود نہیں کہ اس کو حجاب قرار دیا جائے۔ بندہ کا مقصود تو نفس ہو لہٰذا وہی حجاب بھی ہو۔ پس جب تک بندہ مرادِ نفس سے خالی نہ ہوگا، رب اس کا مقصود نہ بنے گا اور اس کے دل میں محبتِ خدا نہیں سما سکتی۔ یہ دولتِ عظمیٰ فناءِ مطلق کے بعد ہی حاصل ہوتی ہو اور فناءِ مطلق، تجلیٔ ذاتی سے متعلق ہو، ظلمات کا بالکلیہ

(بقیہ صفحہ ۹)

کیا تھا، پھر گجرات کا حاکم کیا، بعدۂ وزارت کے عہدے پر پہونچایا، ــــ اکبر نے ان کو اپنے لڑکے دانیال کا اتالیق بھی مقرر کیا تھا۔ مختلف اوقات میں بعہد اکبری لاہور، کابل، آگرہ، مالوہ اور پنجاب کا انتظام ان کے سپرد کیا گیا اور سنبھل کا علاقہ ان کی جاگیر میں دیا گیا ــــ بعہد جہانگیر گجرات کے حاکم بعدۂ پنجاب و کابل کے حاکم بنائے گئے۔ معقول و منقول کے ماہر تھے، صالح و متقی تھے، درس و افادہ میں بھی مشغول رہتے تھے اور جس زمانہ میں لاہور میں تھے بنفسِ نفیس روزانہ ایک مدرسے میں پہونچ کر فقہ اور حدیث و تفسیر کا درس دیتے اور نشر و اشاعتِ علوم میں کوشش کرتے تھے۔ غرضیکہ صاحبِ سیف و علم بھی تھے اور مسندِ درس و تدریس کی زینت بھی۔ اسّی سے زیادہ عمر پائی اور بعہد جہانگیری سنہ ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی۔

(ماخوذ از نزہۃ الخواطر جلد خامس صـ ۳۱۲ و ۳۱۳)

دفع ہونا آفتاب کے طلوع ہوئے بغیر متصور نہیں ۔ جب یہ محبت جس کو محبت ذاتیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے حاصل ہوگئی تو محب کے نزدیک انعام محبوب اور ایلام[۵۱] محبوب دونوں مساوی ہوگئے ـــــ اسی وقت اخلاص حاصل ہوگا ـــــ اب وہ اپنے رب کی عبادت اپنے نفس کے لیے نہیں کرے گا کہ انعام طلب کرے اور ایلام کو دفع کرے ۔ اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں اس کے نزدیک برابر ہوتی ہیں ۔ الخ

مکتوب (۲۹) ـــــ شیخ نظام[۵۲] الدین فاروقی تھانیسریؒ کے نام

اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو تعصب و تعسّف سے محفوظ رکھے اور تلہف و تاسف سے نجات دے ۔ بحرمۃ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم ۔

اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والے اعمال یا فرائض ہیں یا نوافل ـــــ مگر نوافل کا فرائض کے مقابلے میں کوئی اعتبار نہیں ۔ اپنے وقت میں کسی فرض کا ادا کرنا ہزار سالہ نوافل سے بہتر ہے ۔ اگرچہ وہ نوافل بہ نیت خالص ادا کیے جائیں ـــــ کوئی بھی نفل ہو ، نفلی نماز ہو ، نفلی روزہ ہو ، ذکر و فکر ہو ،

---

۵۱ تکلیف دینا ۔

۵۲ شیخ نظام الدین فاروقیؒ ابن شیخ عبد الشکور فاروقیؒ ـــــ آپ سلسلۂ امدادیہ صابریہ چشتیہ کے اکابر طریقت میں سے ہیں ـــــ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کئی مکتوبات آپ کے نام ہیں ۔ اور ان سے آپ کے اور مجدد صاحبؒ کے باہمی خوشگوار تعلقات کا پتہ چلتا ہے ـــــ یہ مکتوب بھی اصلاحی نقطۂ نظر سے بربنائے رابطۂ محبت لکھا گیا ہے ـــــ شیخ نظام الدین تھانیسریؒ ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کے برادر زادہ ، داماد ، اور مرید و خلیفہ تھے ۔ جہانگیر کی ناراضگی کے باعث آپ نے بلخ کو جائے رہائش بنا لیا تھا ۔ حضرت شیخ ابو سعید گنگوہیؒ آپ ہی کے خلیفہ تھے ـــــ ان کے علاوہ بہت سے علماء و مشائخ نے آپ سے فیض حاصل کیا ۔ شرح لمعات عراقی ، شرح سوانح غزالی ، رسالۂ حقیقتہ ، رسالۂ لجنیہ اور تفسیر نظامی آپ کی تصنیفات ہیں ـــــ انوار العارفین مؤلفہ صوفی محمد حسین مراد آبادی کے بیان کی رو سے آپ اُمّی تھے ، لیکن چشمۂ علم لدنی آپ کے باطن میں جوش زن تھا ۔ جو حقائق و معارف بیان فرماتے تھے آپ کے خلفاء اس کو قلمبند کر لیتے تھے ، اس طرح یہ چند تصنیفات تیار ہوگئیں ۔ ۸ رجب سنہ ۱۰۳۰ھ و بقولے سنہ ۱۰۳۶ھ اور بقولے سنہ ۱۰۲۴ھ کو جمعہ کے دن وفات پائی ۔ بلخ میں آپ کا مزار مبارک ہے ـــــ (انوار العارفین و نزہۃ الخواطر جلد خامس)

اور کسی نہ کسی بہانے ہمارا ذکر آجاتا ہو۔ ع ۔ بارے بہ ہیچ خاطر خود شاد می کنم

آپ نے پیر دستگیر (حضرت خواجہ باقی باللہ رح) کی نسبت خاصہ کی عدم واقفیت کے بارے میں لکھا تھا اور اس کا سبب دریافت کیا تھا ـــ مخدوما! اس قسم کی باتیں بطریق تحریر بلکہ تقریر میں بھی مناسب نہیں ہیں معلوم نہیں کسی کی سمجھ میں کیا آئے اور اس سے کیا نتیجہ نکالے ـــ اس کے لیے حضور، بشرط حسن ظن اور طول صحبت درکار ہو، جس طور پر ہو ـــ مگر اس وجہ سے کہ کسی سوال کا جواب بھی کچھ نہ کچھ چاہیے اس قدر لکھتا ہوں کہ ہر مقام کے "علوم و معارف" جداگانہ ہیں اور "احوال و مواجید" علیحدہ ہیں ـــ کسی مقام میں ذکر و توجہ مناسب ہو کسی مقام میں تلاوت و نماز ـ کوئی مقام مخصوص بہ جذبہ ہو اور کوئی مخصوص بہ سلوک، کوئی مقام ایسا ہو کہ ان ہر دو دولتوں (جذبہ و سلوک) سے مرکب ہے ـــ ایک مقام وہ بھی ہو کہ جذبہ و سلوک سے جدا ہو، نہ جذبہ کو اس سے تعلق نہ سلوک کو ـــ یہ مقام بہت ہی نادر ہو ـــ

اصحاب آنسرور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام کے ساتھ ممتاز اور اس دولت عظمیٰ سے مشرف ہیں۔ اس مقام کے حضرات کو امتیاز تام حاصل ہوتا ہو، ارباب مقامات دیگر سے کمتر مشابہت رکھتے ہیں۔ بخلاف اصحاب مقامات دیگر کے کہ وہ با یکدگر مشابہت رکھتے ہیں اگرچہ کسی حیثیت سے ہو... مشائخ سلاسل

(بقیہ حاشیہ) یہیں تعلیم حاصل کی ـــ ابوالفضل کی ہمشیرہ آپ کو منسوب ہوئی تھیں ـــ ان کو ان کے والد کے انتقال کے بعد منصب جاگیر پہونچے تھے ـــ اکبر بادشاہ نے ان کو اپنے لشکر میں عبدالرحیم خانخاناں کے زیر قیادت داخل کر لیا تھا، خانخاناں ان کے والد قاضی نظام الدین کے شاگرد تھے ـــ انھوں نے کچھ دنوں لشکر کی خدمت بکراہت انجام دی، آخر کار بلطائف الحیل اس خدمت سے مستعفی ہوئے اور دہلی آگئے، یہاں حضرت خواجہ باقی باللہ رح کے دربار فیض آثار میں رہ کر فیوض حاصل کیے اور خلیفۂ مجاز ہوئے اور پیر و مرشد کی وفات تک برابر ان کی خدمت کرتے رہے۔ قرآن مجید کو ایک ماہ میں پندرہ مرتبہ ختم کر لیتے تھے ـــ غلبۂ ترک و تجرید کی بنا پر تمام عمر مسند ارشاد و مشیخت پر نہ بیٹھے۔ اپنے مرشد کی حیات میں ان کی خدمت اور بعد وفات مرشد ان کے صاحبزادگان کی تربیت کی ـــ سنہ ۱۰۴۳ھ میں آگرہ میں انتقال کیا اور دہلی میں اپنے پیر و مرشد کے مقبرے میں دفن ہوئے ـــ آپ خواجہ ابرار کے لقب سے مشہور تھے، آپ کے نام مکتوبات امام ربانی تقریباً پندرہ عدد ہیں ـــ الفرقان بابتہ رمضان و شوال ۱۳۷۳ھ میں آپ پر مفصل مقالہ لکھ چکا ہوں، یہ مختصر حالات نزہتہ الخواطر سے ماخوذ ہیں ـــ

میں سے بہت کم حضرات نے اس مقام کی خبر دی ہو. پھر بھلا اس کے معارف کا بیان کیونکر کیا جائے.

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم ـــــ اصحاب کرامؓ کو یہ نسبت عزیز الوجود" اول قدم میں ظاہر ہوتی تھی اور درجۂ کمال کو پہونچی تھی ــــ دوسرے کو اگر اس دولت سے (قضاو قدر) مشرف کریں اور اصحاب کرام کی نسبت کے مطابق تربیت دیں تو وہ جذبہ وسلوک کے منازل قطع کرنے اور علوم و معارف کے طے کرنے کے بعد اس دولت عظمیٰ سے سعادت یاب ہوگا. اس نسبت مخصوص کا ابتدا میں ظاہر ہونا مخصوص ہے. برکت صحبت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ـــــ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین میں سے کسی کو اس برکت سے مشرف کر دیا جائے اور اس کی صحبت بھی ابتدا میں اس نسبت علیہ کے ظہور کا سبب ہو جائے ...... اس بیان سے زیادہ گنجائش نہیں ہے. ؎

ومن بعد هذا ما يدق صفاته وما كتمه احظى لديه واجمل

(اس کے بعد وہ باتیں ہیں جن کا بیان دقیق ہے اور جن کا پوشیدہ رکھنا زیادہ اچھا اور بہتر ہے)

اس کے بعد اگر ملاقات ہوئی اور مستمعین کی طرف سے حسنِ استماع کا گمان غالب ہوا تو اس مقام سے متعلق کچھ اور بیان بھی ان شاء اللہ کیا جائے گا ـــــ وھو سبحانہ الموفق ـــــ

بعض دوستوں کے بارے میں آپ نے لکھا تھا ـــ اس فقیر نے اُن کی لغزشوں کو معاف کر دیا ـــ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے، وہ بھی معاف فرمائے گا ـــ لیکن دوستوں کو نصیحت کیجئے کہ حضور و غیبت میں درپئے آزار نہ رہیں اور اپنے طور طریقے کو بدلیں ـــــ انّ الله لا يغيّر ما بقومٍ حتّى يغيّروا ما بانفسهم، واذا اراد الله بقومٍ سوءً فلا مردّ له و ما لهم من دونه من وال[1] ـــــ

---

[1] بیشک اللہ کسی قوم کی عافیت و نعمت کو متغیر نہیں کرتا جب تک وہ متغیر نہ کریں اس کیفیت کو جو اُن کے قلب میں ہو (یعنی جب وہ اخلاق جمیلہ کو اخلاق رذیلہ سے بدل دیں گے اللہ اُن کی عافیت و نعمت کو بدل دے گا) اور جب اللہ کسی قوم پر عذاب کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں ہے ـــ اور اُن کے لیے سوائے خدا کے کوئی کارساز نہیں ہے ـــــ

میاں شیخ الہداد کے بارے میں خاص طور پر لکھا تھا فقیر کے لیے (ان کو معاف کرنے میں بھی) کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن مشارٌ الیہ کا اپنے تغیرِ وضع سے نادم ہونا ضروری ہے۔

اَلنَّدَمُ تَوبَۃٌ (ندامت توبہ کا دوسرا نام ہے) ان کا آپ سے سفارش طلب کرنا بھی ندامت کی فرع ہے، بہر تقدیر فقیر اپنی طرف سے معاف کرتا ہے جانبِ دیگر کو وہی جانیں ـــــ علاوہ ازیں سرہند کو اپنا گھر تصور کریں۔ علاقۂ محبت اور ہم پیرگی کی نسبت ایسی چیز نہیں ہے کہ عارضی امور سے ٹوٹ جائے۔ زیادہ کیا لکھوں ـــــ والسلام ـــــ مخدوم زادگان اور تمام اہلبیت دعا کے ساتھ مخصوص ہیں ـــــ

مکتوب (۳۳) حاجی محمد لاہوری کے نام ـــــ

[مذمّت علماءِ سُو اور مدح علماءِ حق]

اہلِ علم کا دُنیا سے محبت کرنا اور اس سے رغبت رکھنا ان کے چہرۂ جمال پر بدنما داغ ہے۔ ـــــ ایسے علماء سے خلائق کو اگرچہ فائدہ حاصل ہو جائے لیکن ان کا علم خود ان کے حق میں نافع نہیں ہوتا۔ ہر چند تائیدِ شریعت اور تقویتِ ملّت ان سے ہو مگر یہ تائید و تقویت اہلِ فجور اور اربابِ فتور سے بھی ہو جایا کرتی ہے ـــــ جیسا کہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مردِ فاجر کے متعلق تائیدِ دین کی خبر دی ہے اور فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِر (بیشک اللہ تعالیٰ دینِ اسلام کی خدمت کسی مردِ فاجر سے بھی لے لیتا ہے) ایسے علماء سنگِ پارس کی مانند ہیں کہ تانبا اور لوہا جو بھی اس تک پہونچتا ہے سونا ہو جاتا ہے لیکن وہ خود پتھر کا پتھر ہی ہے۔

جو آگ پتھر اور بانس میں پوشیدہ ہے اس کا حال بھی یہی ہے کہ مخلوق کو تو اس آگ سے منفعت حاصل ہوتی ہے لیکن خود وہ پتھر اور بانس اپنی آتشِ درونی سے بے نصیب ہیں ـــــ بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ علم ان علماءِ سوء کے حق میں مضرت رساں ہوتا ہے اس لیے کہ وہ ان پر حجّت قائم کر دیتا ہے۔

---

۵۱ آپ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے خلفاء میں سے ہیں ـــــ بعد وفات خواجہ دہلویؒ بتقضائے بشریت کچھ باہمی رنجش ہو گئی تھی جس کا ازالہ بعد میں ہو گیا۔

انّ اشد الناس عذاباً یوم القیٰمۃ عالم لم ینفعہ اللّٰہ بعلمہ (بیشک سب سے زیادہ شدید عذاب قیامت کے دن اس عالم پر ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہیں پہونچایا) ــــ اور (علم ایسے علماء کے حق میں) معرفت رساں کیوں نہ ہو جبکہ اس علم کو جو خدا کے نزدیک عزیز اور اشرف موجودات ہو، دنیائے دنیا اور مال وجاہ وریاست کا وسیلہ بنا رکھا ہو، حالانکہ یہ چیزیں نزد حق تعالیٰ ذلیل وخوار ہیں اور بدترین مخلوقات ــــ پس عزیزِ خدا کو ذلیل کرنا اور خدا کے نزدیک جو چیز ذلیل ہو (دنیا) اس کو عزت دینا بے انتہا قبیح ہو۔ یہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ سے مقابلہ ومعارضہ کرنا ہے ــــ تدریس وافتاء اس وقت نافع ثابت ہوتے ہیں جب کہ خالصاً لوجہ اللہ ہوں، اور شائبۂ حُبِّ وجاہ وریاست اور حصولِ مال ورفعت سے خالی ہوں ــــ اور اس خلو کی علامت دنیا وما فیہا سے بے پرواہ اور بے رغبت ہونا ہو۔ جو علماء کہ محبتِ دُنیا کی بلا میں مبتلا ہیں وہ علماء دنیا میں سے ہیں اور یہی علماء سوء، بشرار مردم اور دُزدانِ دین (دین کے چور) ہیں۔ چاہے وہ اپنے آپ کو مقتدائے دین اور بہترین خلائق جانتے ہوں ــــ یحسبون انھم علیٰ شیٔ الا انھم ھم الکاذبون استحوذ علیھم الشیطان فانساھم ذکر اللّٰہ اولٰئک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون ــــ

ایک درویش نے شیطان لعین کو دیکھا کہ بیکار بیٹھا ہے اور گمراہ کرنے اور بہکانے کے کام سے فارغ ہوگیا ہے۔ اس درویش نے اس کی وجہ دریافت کی۔ شیطان نے کہا کہ اس وقت علماء سوء نے اس کام میں میری بڑی مدد کی ہے اور مجھ کو اس مہم سے بے فکر کردیا ہے۔ ــــ سچ یہ ہے کہ اس زمانے میں ہر وہ سستی اور مداہنت، جو امور شریعت میں ہو رہی ہے اور ہر وہ فتور جو ترویج ملت میں ظاہر ہو رہا ہے تمام کا تمام علماء سوء کی نحوست کا اثر ہے اور اُن کی نیتوں کے

لے گمان کرتے ہیں کہ وہ کچھ مفید کام انجام دے رہے ہیں، آگاہ رہو یقیناً وہ لوگ اپنے اس خیال میں جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان غالب آگیا ہے اس نے اللہ کی یاد کو ان کے دلوں سے فراموش کر دیا ہے۔ یہ جماعت لشکر شیطان ہے۔ آگاہ رہو کہ بے شک وشبہ لشکر شیطان کے افراد خسارہ میں ہیں۔

کے فساد کا نتیجہ ہو ــــــ ہاں وہ علماء جو دنیا سے بے رغبت ہیں اور جاہ و ریاست، مال و رفعت کی محبت سے آزاد ہیں وہ علماء آخرت ہیں۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے وارث ہیں ــــــ بہترین خلائق وہی ہیں ــــ فردائے قیامت میں ان کی سیاہیٔ قلم کو شہداء فی سبیل اللہ کے خون کے ساتھ وزن کیا جائے گا۔ اور ان کی سیاہی کا پلہ غالب رہے گا۔ نوم العلماء عبادۃٌ (علماء کی نیند عبادت ہو) ایسے ہی علماء کے حق میں متحقق ہو ــ یہی وہ لوگ ہیں کہ جمالِ آخرت اُن کی نظر میں مستحسن ہو اور قباحتِ دُنیا ان کے مشاہدے میں آگئی ہو۔ آخرت کو انھوں نے پائدار دیکھا ہو اور دنیا کو داغِ زوال سے داغدار پایا ہے۔ بیشک انھوں نے خود کو باقی کے سپرد کر دیا اور فانی سے علیحدہ رکھا ہو۔ عظمتِ آخرت کا خیال رکھنا درحقیقت جلالِ خداوندی کا نظر میں رکھنا ہو اور دنیا و مافیہا کو ذلیل رکھنا شاہدۂ عظمتِ آخرت کے لوازم میں سے ہو ــــــ دنیا و آخرت آپس میں سوتن سوتن ہیں اگر ایک راضی ہوئی دوسری ناراض ہوگئی۔ اگر دنیا عزیز ہو تو آخرت خوار ہو اور دنیا خوار ہو تو آخرت عزیز ہو ــــ ان دونوں کا جمع ہونا جمع اضداد کے قبیل سے ہو..... ہاں مشائخ کی ایک جماعت نے جس نے اپنی خودی اور اپنے ذاتی ارادہ سے نجات حاصل کرلی ہو، صحیح نیتوں کے ساتھ اہلِ دُنیا کی صورت بنالی ہو اور بظاہر راغبِ دنیا نظر آتے ہیں لیکن فی الحقیقت ان کو کوئی تعلق دنیا سے نہیں ہو ــــــ دنیا و مافیہا سے اُن کا باطن بالکل آزاد اور فارغ ہو ــــــ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ــــــ کوئی چھوٹی بڑی تجارت اُن کے حق میں ذکرِ خدا سے مانع نہیں ہوتی ــــ وہ تجارت و بیع سے تعلق رکھتے ہوئے بھی بے تعلق ہیں۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند قدس سرہ نے فرمایا ہو کہ میں نے منیٰ کے بازار میں ایک تاجر کو دیکھا کہ کم و بیش پچاس ہزار اشرفیوں کا مال اس نے خریدا اور بیچا لیکن اس کا دل ایک لحظہ کے لیے بھی حق تعالیٰ سے غافل نہیں ہوا۔

مکتوب (۳۶) حاجی محمد لاہوری کے نام ــــــــ

[اس بیان میں کہ شریعت تمام سعادت دنیویہ و اخرویہ کی کفیل ہو اور طریقت و حقیقت خادمانِ شریعت ہیں۔]

.....شریعت کے تین جزء ہیں (۱) علم (۲) عمل (۳) اخلاص ــــــ جب تک یہ تین جزء متحقق نہ ہوں شریعت متحقق نہ ہوگی ــ شریعت متحقق ہوگی تو رضائے حق سبحانہٗ حاصل ہوگی ــ اور یہ رضائے باری

ہی تمام سعادات دنیویہ و اخرویہ سے لبند و بالا ہے ـــ ورضوانٌ من اللہ اکبر ـــ پس شریعت ہی تمام سعادت دارین کی ضامن ہے ـــ اب کوئی مقصد نہ رہا کہ اس مقصد کے لیے شریعت کے علاوہ کسی امر کی احتیاج ہو ـــ طریقت و حقیقت جن کے ساتھ صوفیا ممتاز ہیں دونوں شریعت کے جزو سوم یعنی اخلاص کی تکمیل کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ بس ان دونوں کی تحصیل سے غرض تکمیل شریعت ہی ہے، نہ کہ کوئی اور امر علاوہ شریعت کے ـــ احوال و مواجید، علوم و معارف، جو صوفیا کو اثناء راہ میں حاصل ہوتے ہیں وہ مقاصد نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت اُن خیالات کی ہے جن سے اطفال طریقت کی تربیت ہوتی ہے۔ ان سب چیزوں سے آگے بڑھ کر مقام "رضا" تک پہونچنا چاہیے۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں مقامات جذبہ و سلوک کی انتہا ہے ـــ اس لیے کہ منازل طریقت و حقیقت کو طے کرنے سے مقصود سوائے تحصیل اخلاص کے اور کچھ نہیں ـــ اور اخلاص رضاء باری تعالیٰ کو مستلزم ہے ـــ تجلیات و مشاہدات عارفانہ سے گزار کر دولت اخلاص اور مقام رضا تک ہزاروں میں سے کسی ایک کو پہونچایا جاتا ہے کوتاہ نظر لوگ احوال و مواجید کو مقاصد میں اور مشاہدات و تجلیات کو مطالب میں شمار کرتے ہیں ـــ اسی وجہ سے "زندانِ وہم و خیال" میں گرفتار اور کمالات شریعت سے محروم رہتے ہیں...... ہاں یہ بات ضرور ہے کہ حصولِ مقام اخلاص اور وصول مرتبۂ رضا، ان احوال و مواجید اور علوم و معارف کے تحقق سے وابستہ ہے ـــ لہذا یہ احوال و مواجید مقدماتِ مقصود ہیں (نہ کہ مقصود) ـــ مجھے یہ حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں کامل دس سال کے بعد اس راہ میں چل کر واضح ہوئی ہے اور "شاہد شریعت" کما حقہ جلوہ گر ہوا ہے ـــ ہر چند کہ میں شروع سے بھی احوال و مواجید میں گرفتار نہ تھا اور حقیقت شریعت کے تحقق کے علاوہ کوئی مقصد میرے پیش نظر نہ تھا، لیکن بعد عشرۂ کاملہ (پورے دس سال کے بعد) حقیقت امر پورے طریقے پر ظاہر ہوئی ـــ الحمد للہ علی ذالک حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ مبارکاً علیہ ـــ الخ

مکتوب (۳۷) شیخ محمد خیری کے نام ـــــــ

[اتباع سنت نبویہ کی ترغیب میں]

تم نے جو مکتوب بھیجا تھا اُس کے مطالعہ سے مسرور ہوا ـــ طریقۂ نقشبندیہ پر اپنی استقامت تم نے لکھی تھی ـــ الحمد للہ علی ذالک ـــ حضرت حق سبحانہٗ اس طریقہ کے اکابر کی برکت سے

ترقیات بے نہایت عنایت فرمائے ــــ یہ طریقہ کبریت احمر ہے اور متابعت سنت پر مبنی ہے ــــ

یہ فقیر اپنے متعلق لکھتا ہے کہ مدتوں علوم و معارف آب نیساں کی طرح مجھ پر برسے ہیں، اور جو کام ہونا چاہیے تھا عنایت خداوندی سے انجام پایا لیکن اب سوائے ایک آرزو کے کوئی آرزو باقی نہیں رہی اور وہ یہ کہ سنن مصطفویہ میں سے کسی سنت کو زندہ کیا جائے......

مکتوب (۳۹) شیخ محمد چتروڑی کے نام ــــ

[اس بیان میں کہ مدار کار قلب پر ہے محض اعمال صوری سے کام نہیں چلتا]

...... مدار کار قلب پر ہے اگر دل غیر خدا میں گرفتار ہے خراب و ابتر ہے ــ محض اعمال صوری اور عبادات رسمی سے کام نہیں چلتا ــــ التفات ما سوائے سلامتی قلب ــــ اور اعمال صالحہ ــ جو بدن سے تعلق رکھتے ہیں اور شریعت نے جن کے کرنے کا حکم فرمایا ہے یہ دونوں چیزیں درکار ہیں۔ (مگر) بغیر اعمال صالحہ بدنیہ کے سلامتی قلب کا دعوی بھی محض باطل ہے۔ اس دنیا میں جس طرح بے بدن کے روح غیر متصور ہے اسی طرح احوال قلبی، بغیر اعمال صالحہ بدنی کے محال ہیں ــــ بہت سے ملحدین زمانہ اس قسم کا (یعنی احوال قلبی بغیر اعمال صالحہ کا) دعوی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے برے معتقدات سے بچائے ــــ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ــــ

مکتوب (۴۱) شیخ درویش کے نام ــــ

[ترغیب متابعت سنت مصطفویہ میں]

حق سبحانہ تعالیٰ ظاہر و باطن کو سنت مصطفویہ کی متابعت سے مزین فرمائے بحرمۃ النبی وآلہ الامجاد علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات ــــ

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، محبوب رب العلمین ہیں ــــ ہر چیز جو خوب و مرغوب ہے وہ محبوب و مطلوب کو دی جاتی ہے ــــ بنا بریں حق سبحانہ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتے ہیں۔ انك لعلى خلق عظيم ــــ (اے رسول آپ بلند ہی اخلاق پر فائز ہیں) نیز فرمایا ہے اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ــ (بیشک آپ مرسلین میں سے ہیں، سیدھے راستے پر) ایک جگہ فرمایا۔ انَّ هٰذا صِرَاطِي مُسْتَقِيماً فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

(باقی صفحہ پر)

قسط دوم

حدیثِ پرویز

از ——— عتیق الرحمٰن سنبھلی

بخاری کی اس روایت پر گفتگو کرنے کے بعد پرویز صاحب فرماتے ہیں:۔

"اب آگے بڑھئے۔ نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ خلافت (جانشینی رسول) کا معاملہ امت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اسکے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی، تاکہ امت کی آزادی رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا...... .. اس لیے امت نے تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا ضروری سمجھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے اس وقت وہاں یعنی (حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ اس اجتماع کی جو روداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابل غور ہے"

یہ تمہید ڈال کر پرویز صاحب نے سقیفۂ بنی ساعدہ کی روداد بیان کی ہے۔ اور اس سے حسب ذیل دو الزامات (جن کا ذکر ہم پہلے بھی کر چکے ہیں) "تاریخ" پر عائد کئے ہیں:۔

۱۔ یہ "ہماری تاریخ" بتاتی ہے کہ خلافت کا فیصلہ جو قرآن کے حکم کے مطابق باہمی مشاورت کے ذریعہ ہونا چاہیے تھا، حضورؐ کے صحابہ نے استبداد سے کام لے کر اور حسب و نسب کو درمیان میں لاکر (یہ فیصلہ) کیا ——— ۲۔ اور اس سلسلہ میں نزاع کا وہ قولی اور عملی انداز اختیار کیا گیا، جو "رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ" کے بھی خلاف تھا اور صحابہ کرام

کی بلند کرداری سے بھی فروتر!

پرویز صاحب کے اس خلطِ مبحث کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ ان کے سامنے مسئلہ تو حدیثی روایات پر اعتماد و عدمِ اعتماد کا ہے۔ لیکن وہ بحث میں لاتے ہیں! تاریخی روایات کو بھی۔ اور اس بحث سے جو نتائج نکلتے ہیں ان سب کو لیجا کر چسپاں کر دیتے ہیں حدیث پر ــــ اب ہم تھوڑی سی وضاحت اپنے اس اشارہ کی کر دینا چاہتے ہیں۔

سقیفۂ بنی ساعدہ کے اجتماع کی روئداد سے متعلق تمام روایات پرویز صاحب نے تاریخ طبری یا محمد حسین ہیکل (مصری) کی کتاب ابوبکر صدیق سے نقل کی ہیں (جو ہیکل نے طبری وغیرہ مورخین ہی کی کتابوں سے لی ہیں) اور اسکے بعد (کافی بعد کے بعض واقعات کے متعلق بعض حدیثی روایات درمیان میں لاکر) بے تکلف ارشاد فرما دیا ہے کہ

> "اس مقام پر آپکے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جب تاریخ کی یہ کیفیت ہے اسے مسترد کیوں نہ کر دیا جائے؟ ایسا کرنے میں کون سا امر مانع ہے؟ بات بڑی معقول ہے اور ایسا کرنے میں کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری تاریخ کو تاریخ کے مقام سے اٹھا کر دین بنا لیا گیا ہے' ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہو کہ یہ خدا کی طرف سے رسول اللہ کو بذریعہ وحی خفی ملی تھیں اسلئے یہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ہیں (مثلہٗ معہٗ) (طلوعِ اسلام۔ جولائی ۵۹ء صہ۲)

کوئی حد ہے اس خلطِ مبحث کی! بلکہ یہ ڈبل خلطِ مبحث ہے، ایک تو یہ کہ حدیثی روایات کے ساتھ خالص تاریخی روایات پر بھی " احادیث " کا اطلاق کیا جا رہا ہے ــــ اور اس طرح، تاریخ کے سر جو الزامات آتے ہیں، الفاظ کے کھیل سے انھیں حدیث کے سر منڈھا جا رہا ہے ــــ دوم یہ کہ "مثلہٗ معہٗ" کا اطلاق صرف اقوال و افعالِ نبویؐ پر کیا جاتا ہے، نہ کہ حدیث کی کتابوں میں ان اقوال و افعال کے ساتھ ساتھ جو دوسری چیزیں آجاتی ہیں ان پر بھی۔ لیکن پرویز صاحب نے صرف ایک ارشادِ نبوی کو ضمناً ذکر میں لاکر اس پورے تاریخی سلسلۂ روایات کو جو کتبِ حدیث ہی کی نہیں بلکہ کتبِ تاریخ کی بھی (اور زیادہ تر انہی کی) روایات پر مشتمل ہے، حدیث کے ماننے والوں کے نزدیک بے تکلف "مثلہٗ

کا مصداق ٹھہرا دیا ہے۔ اور اس طرح یہ گمراہ کن اور مہمل تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ لوگ عہد رسالت سے متعلق خالص تاریخی روایات تک کو " مثلہ معہ" کے زمرہ میں شامل کرتے ہیں۔ حالانکہ تاریخی روایات تو الگ رہیں، حدیثی روایات میں بھی جو چیزیں اقوال و افعال نبوی کے ماسوا ہوتی ہیں انکی اہمیت کا بھی وہ درجہ کسی کے نزدیک نہیں ہوتا جو اقوال و افعالِ نبوی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی ہے جو " مثلہ معہ" کا مصداق ہے۔

بہرحال ہم اس دوسرے خلطِ مبحث سے فی الوقت صرف نظر کرتے ہوئے صرف پہلے خلطِ مبحث کے متعلق پرویز صاحب سے پوچھتے ہیں کہ آخر یہ کیا اندھیر ہے کہ وحشت تو ہو آپ کو طبری اور محمد حسین ہیکل کی تالیفات سے اور رد کرنے لگیں آپ بخاری اور مسلم کو؟ گمراہ کن ٹھیریں کتب تاریخ کی روایات لیکن آپ لوگوں کو یہ پڑھائیں کہ حدیث بھی چونکہ تاریخ ہی ہے اس لیے اسکی روایات کو بھی تاریخی روایات کے ساتھ باندھ کر دریا برد کر دو؟ — یہ آخر کونسی منطق ہے؟ قصور جس کا ہو سزا اسی کو ملنی چاہیئے۔ نہ یہ کہ قصور ہم زید کا ثابت کریں اور پھانسی کسی اور کو زید نام رکھ کر دلادیں! — سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعہ میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خلافت کا فیصلہ استبداد سے کام لے کر اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے نسبی قرابت کی دھونس دیکر کیا گیا، نیز یہ کہ وہاں صحابہ کرام اس طرح " دست بگریباں" نظر آئے جو اُن کی شانِ " رحماء بینھم" اور انکی سیرت عالیہ سے کسی طرح مطابقت نہیں رکھتا، آپنے تمامتر روایات طبری اور محمد حسین ہیکل کی کتابوں سے لی ہیں۔ ان روایات کی بنیاد پر آپ کو کس طرح حق پہنچتا ہے کہ اُس " تاریخ" کے اعتماد کو مجروح کریں جو " دین بن گئی ہو"؟ ان روایات سے خطا ہوئی ہے تو اُن کے ماخذ کے عدم اعتماد کا فتویٰ صادر کر دیجئے۔ لیکن اگر حدیث کے اعتماد کو مجروح کرنا ہے تو یہ روایات بجائے تاریخ کے کسی صحیح احادیث کے مجموعہ سے لاکر دکھایئے!

بخاری پر آپ کی خاص طور سے نظر کرم ہے، کیونکہ حدیث والوں کو اسی پر سب سے زیادہ اعتماد ہے۔ اور وہی حدیث کا سب سے زیادہ مضبوط مورچہ ہے۔ اسی لیے آپنے اس مضمون میں بھی حدیث کے نام سے جہاں کہیں موقع ملا ہے، بخاری ہی پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بخاری میں سقیفہ کی تقریروں کا متن آپ کی پیش کردہ رپورٹ کے مقابلہ میں اس طرح ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ :۔

فلما جلسنا قليلاً تشهّد خطيبهم	ہم سقیفۂ بنی ساعدہ میں جا کر تھوڑی
فاثنیٰ علی الله بما هو اهلهٗ	ہی دیر بیٹھے تھے کہ انصار کا خطیب
ثم قال اما بعد فنحن	کھڑا ہوا اور خطبہ مسنونہ کے بعد اُس
انصار الله وكتيبة الاسلام	نے کہا ۔۔ " ہم اللہ کے انصار اور
وانتم معاشر المهاجرين	اسلام کا لشکر ہیں، اور تم لوگ مہاجرین
رهطٌ وقد دفّت دافّةٌ	ایک تھوڑی سی تعداد ہو۔ اور ایک
من قومكم۔	پریشان حال جماعت ہو جو اپنی قوم
	سے نکل کر ہم میں آگئی ہے[1]

اسکے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب انصار کا خطیب خاموش ہوا تو میں نے چاہا کہ کچھ بولوں، مگر ابوبکرؓ نے مجھے روک دیا اور خود کھڑے ہو کر فرمایا :۔

ما ذكرتم فيكم من خير	تم نے جو کچھ اپنے بارے میں کہا ہے،
فانتم لهٗ اهل ولن يُعرف	(اے انصار) یہ بالکل درست ہو۔ لیکن اسکو
هذا الامر الّا لهذا الحيّ	کیا کیا جائے کہ اہل عرب اس قبیلۂ قریش
من قريش هم اوسطُ العرب	کے سوا کسی کی سرداری کو جانتے ہی نہیں یہ
نسباً ودارًا وقد رضيتُ	باعتبار نسب اور گھرانے (یا مقام) کے عرب
لكم احد هذين الرجلين	میں سب سے فائق ہیں (اور اسی لئے سب ان
فبايعوا ايّهما شئتم۔	کی سرداری پر مجتمع چلے آرہے ہیں) اچھا تو میں

ان دو آدمیوں میں سے ایک کو تمھارے لئے پسند کرتا ہوں انہیں سے کسی ایک سے بیعت کر لو۔ (یعنی عمرؓ اور ابوعبیدہؓ میں سے ایک)

---

[1] اسکے بعد روایت میں ایک فقرہ ہے " فاذا هم يريدون ان يختزلونا من اصلنا وان يحضنونا منّا الامر " اس روایت میں تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطیب انصار ہی کا قول ہو لیکن بعض روایات میں ایسے الفاظ ہیں جو اسے حضرت عمرؓ کا فقرہ بتاتے ہیں، یعنی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے خطیب انصار کے ان جملوں سے یہ سمجھا کہ " یہ لوگ ہمیں اس معاملہ سے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔" ہمارا رجحان اسی دوسری روایت کی جانب ہو ۔۔۔۔۔۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بخاری ہی کی کتاب المناقب (مناقب ابی بکر) میں حضرت عائشہؓ سے بھی اس واقعہ کی ایک روایت ہے اور اسمیں اسی تقریر کا اتنا ٹکڑا اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صدیقؓ نے فرمایا:۔

"پس بات یوں رہے گی کہ ہم امیر اور تم وزیر" (نحن الامراء وانتم الوزراء)

اس پر ایک انصاری کھڑے ہوئے (جن کا نام حباب بن منذرؓ بتایا گیا ہے) اور انھوں نے کچھ روایتی پرجوش الفاظ فرما کر فرمایا:۔ کہ نہیں اگر ہو تو یوں ہو کہ دو امیر ہوں

منّا امیرٌ ومنکم امیر	ایک امیر ہم میں سے اور ایک لے
یا معشر قریش!	قریش! تم میں سے۔

(بخاری۔ کتاب الحدود۔ باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت)

یہ ہے بخاری میں سقیفہ کی تقریروں کا رنگ! سوال یہ ہے کہ ان تقریروں میں کہاں کوئی بات" رحماءُ بینھم" کے خلاف نظر آرہی ہے؟[۱] اور کہاں" صحابہ کرام کے باہمی تعلقات اور اخلاق کا وہ نقشہ" نظر آرہا ہے جس کی بنا پر ان کتابوں کو چاک کر دیا جائے؟

اچھا اب اِن تقریروں کے علاوہ باقی روئداد بھی اس اجتماع کی بخاری سے سُن لیجئے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:۔

فکثر اللغط وارتفعت	(حضرت ابوبکر کی تقریر کے بعد
الاصوات حتی فرقت	نمائندہ انصار نے جو تقریر کی) اُس پر
من الاختلاف فقلت	ایک شور ہونے لگا حتیٰ کہ میں ڈرا کہ
اُبسُط یدك یا ابا بکر	اختلاف بڑھ نہ جائے، پس میں نے
فبسطَ یدَہٗ فبایعتہٗ وبایعہٗ	ابوبکر سے کہا لائیے ہاتھ بڑھائیے۔
المھاجرون ثم بایعتہٗ	انھوں نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اور
الانصار ونزونا علیٰ سعد	میں نے بیعت کی اور دوسرے مہاجرین نے

[۱] یہ دینصاحب نے اجتماع سقیفہ کی روئداد پیش کرتے ہوئے اپنے اعتراض کی اسی شق کو پہلے سامنے رکھا تو ہم بھی اُن کے اتباع میں پہلے اسی شق پر گفتگو کر رہے ہیں جب نسب اور استبداد والی شق پر گفتگو بعد میں آئے گی۔

بن عبادہ فقال قائل منہم قتلتم سعد بن عبادہ فقلت قتل اللہ سعد بن عبادہ۔

(ایضاً)

بیعت کی۔ اور پھر انصار نے بیعت کی۔ اور ہم بیعت کرنے والوں کی اس یلغار نے سعد بن عبادہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ (یعنی وہ اس ہجوم میں پس گئے[۱]) اس پر ایک انصاری نے کہا تم نے تو سعد بن عبادہ کو مار ڈالا۔ میں نے کہا اللہ اس کو مارے۔

یہاں نہ ہمیں کوئی "دست و گریباں" ہوتا نظر آتا ہے اور نہ ایک دوسرے کی داڑھی نوچتا ہوا[۲] لے دے سکے حضرت عمرؓ کا ایک فقرہ ہے "قتل اللہ سعد بن عبادہ" تو اس کو باہمی تعلقات اور اخلاق کی خرابی پر کوئی بدعقل یا حضرت عمرؓ سے قطعاً ناواقف ہی محمول کر سکتا ہو۔ سب جانتے ہیں کہ دینی معاملات میں حضرت عمرؓ کا پارہ بہت تیز تھا۔ وہ اس معاملے میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ اور ہمیں کسی بدعقل کا علم نہیں ہے جو ان معاملات میں حضرت عمرؓ کی حرارت اور تیزی کو "رحماء بینھم" کے خلاف سمجھے۔ خلافت کا مسئلہ سراسر ایک دینی اور نہایت اہم دینی مسئلہ تھا۔ ایسا کہ اس مسئلہ پر اس وقت اسلام کے مستقبل کا انحصار تھا۔ سعد بن عبادہؓ جو انصار کے لیڈر تھے، ان کا موقف حضرت عمرؓ کے نزدیک انتہائی غلط تھا اور جو کارروائی وہ کرنے جا رہے تھے (یعنی قریش کو چھوڑ کر انصاری امارت کا قیام) وہ اُن کی (حضرت عمرؓ کی) نظر میں اسلام کے لیے نہایت نقصان دہ تھی۔ اس پر ان کا غصہ قدرتی بات تھی۔ کوئی اچنبھے کی اور چھپی ہونے کی بات نہیں، اگر کوئی روایت یہ بتاتی ہے کہ

---

[۱] نزاع علیہ کے معنی کسی پر گرنے اور روندنے کے آتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اس بیان کے شروع میں آیا ہے کہ جب ہم سقیفے میں پہنچے تو سعد بن عبادہ بخار کی وجہ سے ایک کمبل میں اس طرح لپیٹے ہوئے بیٹھے تھے کہ پہچانے نہیں جاتے تھے اور پوچھنا پڑا یہ کون ہیں؟ حضرت سعد کی اسی ہیئت کا نتیجہ تھا کہ جب ایکدم سے لوگ بیعت کے لیے بڑھے تو اس ہجوم میں پس گئے۔

[۲] پروفیسر صاحب نے یہ سب کچھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

وہی ہے جو حدیثی روایات میں ہے) ہم یہ بھی کہنے کو تیار رہیں کہ اگر کسی مستند ذریعہ سے یہ ثابت ہو جائے کہ کتب حدیث کی روایات میں کچھ اختصار ہے اور فی الواقع کچھ تیزی اور سخت کلامی سقیفہ کی مجلس میں ہوئی بھی تھی، جسے تاریخ نے بہت بڑھا چڑھا کر ہم تک پہنچایا ہے، تو ہم نفس تیزی اور سخت کلامی سے بھی گھبرانے اور غصہ میں آکر ایسی کسی مستند روایت کو پیچ دینے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کوئی شاذ واقعہ، کسی خاص ماحول میں، کسی کے عمومی وصف کے خلاف سرزد ہو جانا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ یہ انتہائی عقلی افلاس ہوگا کہ ہم صحابہ کرام کی تاریخ کا کوئی اتفاقی واقعہ ان کے عام رنگ سے ہٹا ہوا پائیں اور ذریعہ علم پر ہم کوئی معقول جرح نہ کر سکتے ہوں تو ہم بجائے اس کی توجیہ کے کھٹ سے اس روایت کو غلط کہدیں اور دلیل صرف یہ دیں کہ یہ صحابہ کے عام رنگ کے خلاف ہے جو قرآن سے ثابت ہو۔ قرآن ہی نے تو صحابہ کرام کی پاکیزگیٔ نفس اور طہارت وتقویٰ کی سب سے بلند تر شہادت "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" کہہ کر دی ہے۔ اس میں تمام ایمانی بلندیوں اور اخلاقی طہارتوں کا دفتر سمٹا ہوا ہے، اور ہمارا ایمان ہے کہ اُن کا عام رنگ اور عام حال یہی تھا، لیکن قرآن ہی ہمیں بتاتا ہے کہ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ رسول پاکؐ کے کئی ایک اصحاب قابل گرفت حد تک اور ان گنے چنوں کے علاوہ بھی بہت سے نفر قابل گرفت حد تک تو نہیں لیکن قابل سرزنش حد تک اِن فتنوں سے پھسل گئے۔ اٹھائیے قرآن اور پڑھئے سورۂ نور (اٹھارواں پارہ) ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ	جن لوگوں نے یہ طوفان تہمت برپا کیا ہو وہ تم ہی میں کا ایک گروہ ہو ....
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔	ان میں سے ہر ایک کے لیے اپنے کئے کی جزا ہے، اور ان میں سے جس نے اس تہمت میں سب سے بڑا حصہ لیا ہے اس کے لیے زبردست عذاب ہے۔

اور پھر ارشاد ہوتا ہے:-

لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ
الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ
بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّ قَالُوْا
هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ۔

جب تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان بیبیوں نے آپس والوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا۔ اور یوں کیوں نہ کہا کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔

پھر ایک آیت کے بعد فرمایا جاتا ہے:-

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ
فِيْمَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ
وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ
لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا
وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْ لَآ
اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ
اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ
هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ
اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(النور۔ پ ۱۸ ع ۲)

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور کرم نہ ہوتا دنیا میں اور آخرت میں تو جس شغل میں تم پڑے ہو اس میں تم پر سخت عذاب واقع ہوتا، جبکہ تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات نکال رہے تھے جس کا تمہیں مطلق صحیح علم نہ تھا۔ اور تم اس کو معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی ـــــ اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اس کو سنا تھا تو کہا ہوتا کہ ہم کیونکر ایسی بات منہ سے نکالیں۔ توبہ توبہ یہ تو بڑا زبردست بہتان ہے! اللہ تم کو نصیحت فرماتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو خبردار آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کرنا! ـــــــــــــــ

یہ اتفاقی بات ہے کہ مثال میں قرآن کا ایک ایسا ٹکڑا آ گیا ہے جس کے اشارے (اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ) کو سمجھنے کے لیے ہم اسی "تاریخ" کا منہ دیکھنے پر مجبور ہیں جس کو یہ دیر "عجمی سازش" کا نام دے کر اوّل سے آخر تک مجروح کر دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اگر یہ دیدہ

کا کہاں امکان کہ ہم اس "تاریخ" کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں تو کوئی بتائے کہ کس سے ہم اس واقعہ کو دریافت کرنے جائیں گے جس کی طرف قرآن نے "جاءو ا با لا فک" کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے؟ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جو ایک معقول آدمی کو تاریخ کا ممنون ہونے اور محدثین کی مساعی کا شکرگزار ہونے پر مجبور کرتی ہیں جنھوں نے ہماری اس ضرورت کو پورا کیا اور ان امور میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جن سے ہمیں اطمینان حاصل ہوسکتا کہ ان کی پہنچائی ہوئی روایات میں صحت ہے یا نہیں؟

بہرحال یہ تو ایک درمیانی بات ہے، اصل بات جو ان آیات کو سامنے لاکر کہنا تھی یہ ہے کہ دیکھئے یہ "تاریخ" نہیں قرآن بتا رہا ہے کہ حضورؐ کا سایہ بھی ابھی قرنِ اوّل کے مسلم معاشرہ پر قائم تھا کہ وہ حضرات جنھیں قرآن "رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ" کا "سرٹیفکیٹ" دیکر انکے تزکیۂ طہارت کی عظیم ترین شہادت دے رہا ہے، اُن میں سے ایک تعداد کسی نہ کسی طور پر زنا کی ایک ایسی تہمت میں ملوّث ہوگئی جس پر جلال وعتاب الٰہی کا وہ رنگ ہے کہ ایک مومن ان آیات سے گزرتا ہے تو پسینہ چھوٹ جاتا ہے، دیکھئے، پھر دیکھئے! فرمایا جارہا ہے:۔

"اگر تم پر اللّٰہ کا خاص فضل و کرم دنیا اور آخرت میں نہ ہوتا تو یہ جو کام تم نے کیا تھا یقیناً اس پر اللّٰہ کا زبردست عذاب تم کو آ لیتا۔"

اور فرمایا جاتا ہے:۔

"تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ یہ اللّٰہ کی نظر میں بہت ہی بڑی بات تھی۔"

اور آگے چلئے، عتاب و سرزنش کا یہ سلسلہ ان الفاظ پر جا کر رُکتا ہے:۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔	اللّٰہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو خبردار! جو آئندہ کبھی ایسے کام میں پڑے!

یہ واقعہ کیا تھا؟ کس پر تہمت ناگفتہ بہ رکھی گئی تھی؟ اس سب کو چھوڑ دیجئے کہ یہ قرآن میں مذکور[1]

[1] یہ بات ہم پرویز صاحب کی رعایت سے کہہ رہے ہیں، لیکن ہمارے بہت سے (باقی اگلے صفحہ پر)

نہیں ہے، لیکن یہ جتنا کچھ مذکور ہے، کیا یہ بتانے کے لیے کچھ کم ہے کہ کوئی بہت بڑی دینی اور اخلاقی لغزش صحابہ کرام سے ہوئی تھی، کہ بس اللہ کا خصوصی فضل وکرم ہی حائل ہوگیا ورنہ نہ معلوم کیا ہونا تھا! ——— تو کیا ہم قرآن کی ان آیات سے انکار کر دیں؟ اور کہدیں کہ یہ صحابہ کرام کو بدنام کرنے کے لیے کسی "عجمی" نے الحاق کر دیا ہے؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! ——— سیدھی بات ہو کہ صحابہ کرام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) ناظرین کے لیے قرآن کا یہ اقتباس چیستاں بن کر رہ جائے گا، اگر ہم واقعہ کا ذکر نہ کریں ——
واقعہ یوں ہوا تھا کہ ایک غزوہ میں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم سفر تھیں غزوہ سے واپسی ہوئی اور مدینہ کے کچھ دور ایک مقام پر رات گزارنے کے لیے لشکر نے قیام کیا۔ حضرت عائشہؓ اتر کر قضائے حاجت کے لیے تشریف لے گئیں۔ واپس آئیں تو دیکھا کہ گلے کا ہار کہیں گر گیا ہے۔ پلٹ کر اسکی تلاش میں چلی گئیں۔ یہاں اتنے میں کوس رحلت بج گیا، اور جو لوگ حضرت عائشہؓ کا محمل اٹھا کر سواری پر رکھتے تھے انھوں نے رکھدیا، چونکہ ہلکی پھلکی تھیں اس لیے اٹھانے والوں نے یہ نہ محسوس کیا کہ وہ محمل میں نہیں ہیں۔ قافلہ کوچ کر گیا۔ اب جو وہ منزل پر واپس آئیں تو قافلہ (لشکر) کا کہیں پتہ نشان نہ تھا۔ حیران و پریشان ہو کر بیٹھ رہیں، زیادہ دیر ہوئی تو اسی عالم میں آنکھ لگ گئی۔ ایک صحابی صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ جو اس منزل ہی پر سوتے رہ گئے تھے یا اس غرض سے چھوڑ دیے گئے تھے کہ سپیدۂ سحر طلوع ہونے پر چلیں۔ اور راستہ میں لشکر کی کوئی چیز گر گئی ہو تو اٹھاتے ہوئے لائیں وہ جب اپنی جگہ سے روانہ ہوئے تو دیکھا کوئی لیٹا سا ہے۔ ذرا قریب پہنچے دیکھا کہ حضرت عائشہ ہیں (پردہ سے پہلے دیکھے ہوئے تھے اس لیے پہچانتے تھے) یہ دیکھ کر انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا۔ حضرت عائشہ ان کی آواز سے چونک اٹھیں، کپڑے سمیٹے اور چادر لپیٹی۔ حضرت صفوان نے اپنا اونٹ بٹھا دیا اور انھیں سوار کر کے خود پیدل چلے حتیٰ کہ دوپہر میں جہاں لشکر آرام کے لیے ٹھیر گیا تھا لشکر سے جا ملے۔ لوگوں نے ان کو اور ایک عورت کو اس طرح آتے ہوئے دیکھا۔ پتہ چلا کہ حضرت عائشہ ہیں۔ سرگروہ منافقین عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ اسکی طینت بد کو ایک شوشہ ہاتھ آگیا اور اس نے چھوڑ دیا کہ (معاذ اللہ) یہ دونوں ایک دوسرے سے بچے ہوئے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ۔ حضرت مسطح بن اثاثہؓ (مہاجر بدری) اور حمنہ بنت جحشؓ (صحابیہ) کے متعلق روایات میں نام زد طور پر آتا ہے کہ یہ اس شوشہ سے متاثر ہوگیے اور وہی کہنے لگے جو رئیس المنافقین نے کہا تھا۔ قافلہ مدینہ آگیا، اور اس ہوائی نے مہینہ بھر تک مدینہ میں خوب (باقی اگلے صفحہ پر)

انھوں نے سعد بن عبادہ کے متعلق یہ فقرہ کہا!

اگر تاریخ کے بعض اوراق کو غلط سمجھ کر آپ نے اسلام کی پوری تاریخ سے دستبردار ہونے اور ماضی کے تمام نقوش سے آنکھیں بند کر لینے کا فیصلہ نہیں کر لیا ہے۔ تو یہ دیکھئے حضرت عمر اپنے دورِ خلافت میں فلاں صحابی کو درّہ لگا رہے ہیں، فلاں کو ڈانٹ رہے ہیں، فلاں مسلمان پر حد جاری کر رہے ہیں اور فلاں سے قصاص لے رہے ہیں۔ کیا آپ کہنے کو تیار ہیں کہ یہ سب "رحماءُ بینھم" کے خلاف تھا؟ ——— اور جانے دیجئے تاریخ کے بیانات کو، قرآن کی اس قسم کی آیات کو کیا کیجئے گا کہ جن کا وصف "رحماءُ بینھم" بتایا جا رہا ہو، انہی سے کہا جا رہا ہے کہ لَا تَاخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ (النور۔ ع ۱) "اللہ کے دین کے معاملہ میں ان دونوں کے ساتھ تمھیں آپس کی نرم دلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے" یہ حدِّ زنا کا معاملہ ہے۔ کیا زنا کے بعد آدمی مسلمان نہیں رہتا۔ یا عہدِ رسالت کے کسی مسلمان سے یہ جرم ہو جاتا (اور ہمارے نزدیک یہ ہوا بھی ہے) تو کیا وہ "رحماءُ بینھم" کے زمرہ سے خارج ہو جاتا؟ ——— پھر یہ عقل کی دشمنی نہیں ہو گی تو کیا ہو گا کہ حضرت عمر کے اس فقرے کو کوئی "رحماءُ بینھم" کے خلاف بتانے لگے؟

دراصل ہم ابتک تو اس بنیاد پر گفتگو کر رہے ہیں کہ احادیث کی روایاتِ صحیحہ میں اس واقعہ کی تقریروں اور گفتگوؤں کی روداد کیا ہے اور کیا نہیں ہے اور ہم خود اس کے قائل ہیں کہ اس واقعہ کی جو تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں ہیں وہ پوری طرح صحیح نہیں ہیں (اور نہ ہونا کچھ تعجب بھی نہیں جب کہ تاریخ کی (نہ کہ حدیث کی) روایات میں چھان پھٹک کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ طبری نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "چونکہ تاریخ کا معاملہ" اخبارِ مخبرین اور نقلِ ناقلین" پر منحصر ہے۔ "استخراج بالعقول اور استنباط بالفکر" کو اس میں دخل نہیں ہے اس لئے میری اس کتاب میں ایسی جو روایت کسی کی نظر پڑے جو اسے غلط اور مہمل معلوم ہو تو اُسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ ہماری طرف سے نہیں ہے بلکہ ہم سے پہلے لوگوں سے ہم تک پہنچی ہے اور جیسی ہم کو پہنچی تھی ویسی ہی ہم نے دوسروں کو پہنچا دی ہو" (ص ۵) لیکن یہ سمجھنے کے باوجود (کہ تاریخ کی یہ تمام تفصیلات صحیح نہیں ہیں قابلِ اعتماد صرف

کا عام رنگ اور عام حال بیشک وہی تھا جس پر انھیں "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کا طغرائے امتیاز عطا ہوا۔ لیکن بشری فطرت کی کمزوریاں (جن سے سوائے رسول کے کوئی بشر معصوم نہیں) اور منافقین کی ریشہ دوانیاں مل جل کر بعض دفعہ ایسا اثر پیدا کر دیتی تھیں کہ گاہے ان میں سے بعض کا وہ عام رنگ ہلکا پڑ جاتا تھا۔ چنانچہ یہی صورت اس واقعہ اِفک میں بھی بنی، کہ منافقین نے ایک شوشہ چھوڑا اور بعض صحابہ اس کے تأثر میں بہہ گئے، اور کیسے کیسے صحابہ؟ حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ جن کا امتیازی وصف ہی حرمت وناموسِ نبوی کا دفاع تھا۔ شعرائے مکہ آنحضرت کی ہجو کرتے اور رکیک حملے کرتے تھے، تو حسان بن ثابت مدینہ میں بیٹھ کر اس کا جواب دیتے۔ حضور ان کی اشعار خوانی کے لیے مسجد نبوی میں منبر رکھواتے اور "فداک ابی وامّی" تک کا انعام انھیں عطا فرماتے ——— حضرت مسطح بن اثاثہؓ جو مہاجر بھی تھے اور بدری (شریک جنگ بدر) بھی۔ اور یہ آخری وصف وہ وصف ہے جس پر درگاہِ رب العزت سے "قد غفرت لکم" کا خصوصی مژدہ سنایا گیا ہو۔

پس اگر یہ ہو سکتا تھا کہ منافقین کی ریشہ دوانیوں کے زیر اثر صحابہ کرام سے اتنی زبردست لغزش ہو جائے کہ جن ازواج مطہرات کے متعلق فرمایا گیا تھا "یہ مسلمانوں کی مائیں ہیں ——" (وازواجہٗ امّھاتھم) انھیں پر "اِفک" میں وہ شریک ہو جائیں یا اس تہمت ناگفتہ بہ کو سن کر ہضم کر لیں۔ اور یہ بھی اسی حالت میں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ ابھی سروں پر قائم ہے، جو بجائے خود تزکیہ کا ایک بڑا سامان اور اعلیٰ ایمانی کیفیات کا ضامن ہے، تو اس

(بقیہ حاشیہ صـ) گشت کیا۔ حضورؐ اور حضرت عائشہ کی آزردگی انتہا کو پہنچ رہی تھی، چرچے برابر بڑھتے جا رہے تھے اور کتنے ہی سچے مسلمان بھی اس میں مبتلا ہو رہے تھے کہ حضرت عائشہ کی براءت میں یہ آیات نازل ہوئیں جن میں ظاہر کیا گیا کہ یہ سراسر تہمت ہے۔ جس کے پھیلانے کی ذمہ دار تمھیں میں کی ایک جماعت ہے اور پھر اس جماعت میں سے منافق عبداللہ بن اُبی جو اس تہمت کا بانی مبانی اور سب سے زیادہ حصہ دار تھا اسکو "والذی تولیٰ کبرہٗ لہٗ عذاب عظیم" کہہ کر الگ کر دیا گیا۔ اور جو مومنین تہمت پھیلانے میں تو شریک نہ تھے مگر اس کو سنتے اور انکار نہ کرتے تھے یا اس طرح کے تذکروں میں کسی نہ کسی طور پر خود بھی حصہ لیتے تھے ان کو سخت سرزنش فرمائی گئی۔

کے مقابلہ میں یہ کیا بڑی بات ہے کہ حضور کا سایۂ مبارک بھی سر سے اٹھ چکا ہے، بلکہ ایسا وقت ہے کہ ہوش و حواس بھی پوری طرح قائم نہوں گے ـــــ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے قوی القلب صحابی کے متعلق آتا ہے کہ ان کا عجیب حال وفات نبوی کی خبر سن کر ہو گیا تھا ـــــ تو یہ کیا بڑی بات ہے کہ ایسے وقت میں منافقین کا گروہ صحابہ کے اس گروہ کو جس میں منافقین کا یہ گروہ ملا جلا رہتا تھا (یعنی انصار) کوئی ایسی بات سمجھانے میں کامیاب ہو گیا ہو جس کے نتیجہ میں سقیفے کے اس اجتماع میں، ان کے رویہ میں کچھ تیزی اور سختی پیدا ہو گئی ہو۔ اور تھوڑی دیر کے لیے وہ "رحماءُ بینھم" کی شان بھول گئے ہوں؟ اگر منافقین کی ریشہ دوانیاں کچھ وقت کے لیے "ازواجہٗ امّھاتھم" کا نص بھلا سکتی ہیں تو "رحماءُ بینھم" سے غفلت تو اس کے مقابلہ میں بہت ہی ہلکی بات ہے!

اگر آپ غور کریں گے، اور قرآن کی شہادت آپ کے نزدیک کوئی چیز ہے تو آپ خود بالیقین اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع ہی دراصل منافقین کی اندرونی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا[1] ـــــ منافقین کے متعلق "تاریخ" نہیں خود قرآن بتاتا ہے کہ یہ مہاجرین کی جڑ کاٹنے اور مدینہ سے انھیں بیدخل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ کھولئے سورۃ المنافقون" (اٹھائیسواں پارہ)

ارشاد ہوتا ہے:-

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا۔	یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ مت خرچ کرو ان لوگوں پر جو رسول کے پاس (آ آ کر) جمع ہو گئے ہیں تاکہ یہ آپ ہی منتشر ہو جائیں۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:-

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ	یہ کہتے ہیں کہ اب جو ہم لوٹ کر مدینہ پہنچیں گے تو "عزت والے" (یعنی ہم) ان ذلیلوں"

---

[1] ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ اس حقیقت کا اشارہ ہمیں مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کی فاضلانہ تصنیف "صدیق اکبر" سے ملا تھا۔ ہم نے جب غور و فکر کیا تو حسب ذیل قرآن سے اسکی تائید ہوئی جو ہم آگے بیان کر رہے ہیں۔

مِنۡهَا الۡاَذَلَّ۔ کو نکال کر ہی دم لیں گے۔ (جو بہت سر
(ع۔ ۱) چڑھ گئے ہیں۔)

یہ تھے منافقین کے عزائم اور ان کی ریشہ دوانیوں کا حال! یہ باتیں وہ کس سے کہتے تھے؟ انھیں سے جو رسول اور ان کے مہاجر ساتھیوں کو مدینہ لائے تھے، اور اپنا سب کچھ ان کے لیے حاضر کیے ہوئے تھے، یعنی انصار ــــــ یہ واقعہ کیا تھا جس کی طرف قرآن میں یہ اشارات ہیں؟ واقعہ یہ تھا کہ ایک غزوہ سے اسلامی لشکر کی واپسی ہو رہی تھی، جس کے ساتھ حضورؐ بھی تھے۔ ایک بات پر ایک انصاری اور ایک مہاجر میں کچھ مناقشہ ہو گیا۔ مہاجر کے کسی حمایتی نے مغلوب الغضب ہو کر انصاری کے ایک ہاتھ مار دیا۔ لشکر میں منافقین کا گروہ اور خود رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی بھی تھا۔ کیونکہ حضور ان کا پردہ فاش نہیں کرتے تھے اور عام لوگ انکو مسلمان ہی سمجھتے تھے (اور یہ الفاظ جو قرآن نے نقل کئے ہیں اسی عبداللہ بن ابی کے تھے) انھیں آیات کے ذیل میں مفسرین نے نقل کیا ہے کہ ایک انصاری صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منافق سے درگزر کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے عرض کیا تھا کہ حضور! قصہ یہ ہے کہ آپ کی مدینے تشریف آوری سے کچھ قبل اس شخص کا قبیلہ اسکو باقاعدہ بادشاہ بنا کر اسکی تاجپوشی کی تیاریاں کر رہا تھا، کہ آپ کی آمد ہو گئی۔ اور یہ کام کھٹائی میں پڑ گیا۔ اسی کا اثر ہے کہ اس سے اس طرح کی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک فکر و نظر کا کام کرتی ہے عبداللہ بن اُبَی کے گروہ کے دل کی یہی آگ تھی جس نے ان کو منافقت کی راہ پر ڈالا۔ اور اسی آگ کی لپٹیں تھیں جو کبھی کبھی اس طرح منھ سے نکلتی تھیں کہ " لَا تُنۡفِقُوۡا عَلٰی مَنۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ الخ" یا " لَيُخۡرِجَنَّ الۡاَعَزُّ مِنۡهَا الۡاَذَلَّ "ـــ ــــ سوچنے کی بات ہے کہ جب منافقین کا گروہ انصار کو مہاجرین سے لڑانے اور ان کے خلاف ورغلانے کی تدبیریں اور اپنے لیے میدان صاف کرنے کی کوششیں آنحضرت کی زندگی میں کرتا رہتا تھا، اور کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا، تو جب اس طرح کی کسی کوشش کا بہترین موقع فراہم ہوا ہوگا ــــ یعنی وفات نبوی کا موقع ـــ تب یہ گروہ کیونکر متقی اور پرہیزگار بن کر بیٹھ گیا ہوگا؟ کیا معنی تھے کہ وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا؟

غور کیجیے کہ ادھر تو حضور کا وصال ہوا ہے، نعش مبارک ابھی شرمندۂ تجہیز وتکفین نہیں ہے۔ لوگوں کو غش آرہے ہیں، اور حواس پراگندہ ہیں۔ کیا سوچا جا سکتا ہے کہ اللہ کے رسول کو اپنے گھر بلا کر لانے والے، اس پر اپنی جان اور مال سے فدا ہونے والے، بڑی سے بڑی مصیبت اٹھا کر اس کا روئے انور دیکھ کر ساری مصیبتیں بھول جانے والے[1] اسکی آنکھ بند ہوتے ہی ایسے بے مروت اور سخت دل ہو گئے ہوں گے کہ تجہیز وتکفین اور تدفین سے بھی پہلے انتخاب امیر کے قضیہ میں لگ جائیں! اور بجائے اسکی بالیں پر اشکہائے عقیدت لٹانے اور مہاجرین کی طرح ماہئ بے آب نظر آنے کے اپنے گھروں پر بیٹھے فکرِ فردا کرنے لگیں؟ حاشا ثم حاشا!! — یہ بے مروتی یہ بے رخی اور یہ سخت دلی، ان جان نثارانِ رسول سے، تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ عقل کہتی ہے، ایمان کہتا ہے اور منافقین کے عزائم اور انکی ریشہ دوانیوں کی جو خبر ہمیں قرآن نے دی ہے وہ کہتی ہے کہ ہو نہ ہو یہ منافقین کی کسی سازش کا نتیجہ تھا ——— ایسی سازش کہ اگر کامیاب ہو جاتی تو منافقین کی ساری مرادیں بر آتیں ——— یقیناً انصار کے بعض افراد کو منافقین نے کوئی ایسی دینی پٹی پڑھائی تھی، کہ اُسی کے اثر سے یہ اُن ہونی ہوئی۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ اس طرح کا کوئی وعظ اور اس طرح کی کوئی تلقین تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کی بات تو اور تھی، وہ بتقاضائے رسالت آپ آپ مسلمانوں کے امیر تھے۔ لیکن اب تو قدرتی طور پر نظم ونسق کی ذمہ داریاں انہی لوگوں کی طرف لوٹتی ہیں جو اس سرزمین (مدینہ) کے اصل باشندے ہیں، اور جن کا یہ اصلی وطن ہے۔ پس ایسی صورت میں

---

[1] غزوہ احد میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شہید ہو جانے کی خبر اڑی اور مدینہ کی عورتیں تک یہ خبر سُن کر اُحد کی طرف دوڑ پڑیں تو کسی نے میدان جنگ کے قریب انہیں کسی ایک کو بتایا کہ تمھارے باپ بھائی اور شوہر ..... آج سب کام آگیے تو انھوں نے فرمایا یہ چھوڑو مجھے رسول اللہ کی خیریت بتاؤ۔ غالباً روایت میں یوں ہے کہ اتنے ہی میں انکی نظر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو بے اختیار پکار اٹھیں۔ کُلُّ مصیبۃٍ بعدکَ جللٌ یا رسولَ اللہ! اگر آپ سلامت ہیں تو یا رسول اللہ پھر ہر مصیبت ہلکی ہے۔)

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے، لوگ سراسیمہ اور پراگندہ حواس ہیں، چاروں طرف کی غیر مسلم طاقتوں سے اسلام کی نوزائیدہ طاقت کو خطرات ہیں، اور یہ خبر ان طاقتوں کا حوصلہ بڑھا سکتی ہے، اور مدینہ پر آناً فاناً کوئی مصیبت آسکتی ہے، اس لیے اہل مدینہ کو چاہیئے کہ وہ جلد سے جلد امارت کا نظم قائم کریں اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوں!

ان میں سے ہر بات نہایت معصوم اور انصار مدینہ کے جذبۂ دینی کو صد درجہ اپیل کرنے والی تھی۔ ہم وثوق کے ساتھ سمجھتے ہیں اور کہنا چاہیئے کہ اسی قسم کی کوئی بات تھی جو انصار کے اندر گھلے ملے منافقین کے گروہ نے اپنے لیے میدان صاف کرنے اور اسلام کا کام تمام کرنے کے لیے انصار کے دلوں میں اتار دی تھی۔ اور محض یہی سبب تھا کہ مہاجرین سے رجوع کیے بغیر اور ایسی حالت میں کہ جسد نبوت کی تکفین و تدفین کے تمام مراحل ابھی باقی تھے۔ یہ لوگ سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہو گیے، اور امیر کا انتخاب کرنے لگے۔

اس اجتماع کے انعقاد میں منافقین کے عمل دخل کی تائید اس قرینہ سے بھی ہوتی ہے کہ منافقین اگر سب نہیں تو بیشتر خزرجی تھے۔ (اس لیے کہ عبداللہ بن اُبَی (رأس المنافقین) خزرجی[1] ہی تھا) اور اس اجتماع کے لیڈر بھی خزرجی تھے۔ حضرت سعد بن عبادہؓ جن کو امیر بنایا جا رہا تھا وہ بھی خزرجی تھے۔ اور حباب بن منذرؓ جن کی تقریر نمائندۂ انصار کی حیثیت سے پروفیسر صاحب نے پیش کی ہے وہ بھی خزرجی ہیں۔

بہرحال یہ تھا اس اجتماع کا پس منظر جس کے ثبوت میں کوئی تاریخی دستاویز تو ہمارے پاس نہیں ہے، لیکن تمام قرائن کا یہ گویا قطعی فیصلہ ہے!

اب اصل مسئلہ کی طرف آئیے! حضرت عمر اور حضرت ابوبکر وغیرہ یکایک اطلاع پاکر اس اجتماع میں پہنچتے ہیں۔ ان کے پہنچنے پر جو پہلی تقریر انصار کی طرف سے ہوتی ہے، اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی نے اس کارروائی پر اعتراض کیا ہوگا۔ انصاری لیڈر جن کے ذہن میں ہمارے قیاس کے مطابق وہ باتیں اتر چکی تھیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، ان کی سمجھ میں اس اعتراض کی

---

[1] انصار کے دو قبیلے تھے ایک کا نام اوس تھا ایک کا خزرج۔

معقولیت نہ آئی اور انھوں نے کہا:-

نحن انصار اللہ وکتیبۃ الاسلام	ہم اللہ کے انصار اور اسلام کی فوج
وانتم معاشر المھاجرین رھط	ہیں اور اے مہاجرین تم تو ایک چھوٹی سی
وقد دفت دافۃ من قومکم	تعداد ہو۔ ایک پریشان حال جماعت تھی

جو اپنی قوم سے نکل یہاں چلی آئی تھی (پس یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم کیوں اس کارروائی پر معترض ہو رہے ہو۔)

انصاری خطیب کے یہ جملے ہمارے اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے ذہن میں یہ بات نہایت مضبوطی کے ساتھ اتری ہوئی تھی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مملکتِ مدینہ کا نظم و نسق قدرتی طور پر ہم اہل مدینہ ہی کی ذمہ داری ہے۔ یہ بات ازخود بھی ان کے ذہن میں ہو سکتی تھی، مگر اس کا یہ ظہور کہ ایسے ہوشربا سانحہ کے وقت اس کام کے لیے اجتماع منعقد ہو جائے، قیاس کہتا ہے کہ یہ منافقین ہی کی وعظ و تلقین کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس خیال کا تقاضہ کچھ مؤخر ہو کر پورا ہوتا ——— بہرحال یہ خیال تھا جس کے نتیجہ میں انصار انتخابِ امیر کی کارروائی کرنے کے لیے بیٹھے ——— اور یہ خیال یقیناً ایک حد تک بجا تھا جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تقریر کے اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے ——— جو بخاری کی دوسری روایات میں آیا ہے ——— کہ "امیر تو قریش ہی میں سے ہونا چاہیئے لیکن وزیر انصار ہوں گے"[1] یہ گویا صدیق اکبرؓ کی طرف سے اس امر کا اعتراف تھا کہ انصار کا موقف فی الجملہ صحیح ہے (غلطی صرف خاص امارت کے مطالبہ میں ہے۔)

ظاہر بات ہے جب کسی کے موقف کی یہ نوعیت ہو[2] تو کچھ بھی بعید نہیں، بلکہ انسانی فطرت

---

[1] نحن الامراء و انتم الوزراء" بخاری باب مناقب ابی بکرؓ ——— عن عائشہؓ)

[2] خصوصاً یہ بات اور ذہن میں رکھیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار کے موقف کی فی الجملہ صحت کا اعتراف فرماتے ہوئے ان کے مطالبۂ امارت سے اختلاف، بخاری کی روایت کی رو سے، اس بنیاد پر کیا تھا کہ "عرب قریش کے سوا کسی کی سرداری کو تسلیم نہیں کر سکتے" ظاہر ہے کہ یہ ایسی بات نہ تھی کہ انصار کو (باقی ص ۳۰ پر)

سے نہایت قریب ہے کہ وہ اپنے موقف پر اصرار کرے۔ اور جب اسکی مخالفت میں اصرار ہو حتیٰ کہ وہ اپنے موقف سے کچھ نیچے بھی اتر آئے کہ "مِنّا امیرٌ و منکم امیرٌ" (ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے) کی تجویز پیش کرے، اور اس پر بھی مخالفت ہو، تو اُسے کچھ شکایت ہو، اسکی طرف سے کچھ گرمی کا اظہار ہو ــ ظاہر ہو کہ یہ بات انسانی طبیعت سے، خواہ وہ کسی بھی درجہ کے انسان ہوں، ذرا بھی بعید نہیں ہے ـــــ ایسی صورت حال میں ہنگامی طور پر بڑی سے بڑی بات ہو سکتی ہے۔ اور جو اس دنیا میں رہتا ہے وہ جانتا ہو کہ ہو سکتی ہی نہیں، ہوتی ہے۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں میں بدگمانیاں اور شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس سے انکی نیک نفسی پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یہ تو انصار کی بات ہے ـــ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ـــ رہا مہاجرین کا معاملہ، تو اُنکی طرف سے اگر کسی مرحلہ پر کوئی تلخی یا درشتی آئی، تو وہ تو اور بھی ناقابل اعتراض ہے۔ مہاجرین ان آزمائشی لمحات میں بھی "رُحماءُ بینھم" کی شان اس طرح برقرار رکھے ہوئے تھے کہ حضرت عمرؓ جن سے سب سے زیادہ تیزی اور سختی کا خطرہ ہو سکتا تھا وہ اسی بخاری کی روایت میں بیان کرتے ہیں کہ انصار کا پہلا خطیب جب خاموش ہوا تو میں نے بڑھ کر چاہا کہ بولوں۔ حالانکہ ابوبکرؓ کے سامنے مجھے یہ جرأت نہ کرنی چاہیئے تھی۔ مگر کیوں کی؟ سنیئے! سننے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:۔

كنتُ زوّرتُ مقالةً — میں نے اپنے نزدیک ایک بڑی عمدہ
اعجبتني أُريدُ أن أُقدّمها — تقریر سوچ رکھی تھی۔ میں نے اس کو ابوبکر
بَيْنَ يدَيْ ابي بكرٍ وكنتُ — سے پہلے پیش کر دینا چاہتا تھا اور مقصد
أُداري منه بعضَ الحدِّ — یہ تھا کہ ابوبکر کہیں اس موقع پر گرم نہ ہو جائیں

لہذا میں پہلے سے ایسی باتیں کہہ دوں کہ اسکی نوبت نہ آئے۔ (گویا پیش بندی ہو جائے اور مجلس کی فضا خوشگوار رہے)

یہ تھا مہاجرین میں سے اس شخص کا رویّہ جس سے سب سے زیادہ شدت کا خطرہ ہو سکتا تھا لیکن حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو تقریر سے روک دیا۔ اور خود کھڑے ہوئے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا رویّہ کیا رہا؟ حضرت عمرؓ ہی فرماتے ہیں:۔

فكانَ هو أحلَمَ منّي وأوقَرَ — پس وہ تو مجھ سے بھی زیادہ حلیم اور باوقار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷) اس سے اختلاف کا حق نہ ہوتا۔ انصار کی رائے ہو سکتی تھی کہ ایسا نہیں ہو۔ ہم امارت کی ذمہ داریوں کو سنبھا سکتے ہیں۔ اور انصار کی خدمات اور اسلام میں اُنکے مقام کی بنا پر اسلام کے تمام حلقہ بگوش اُن کے سامنے جھک سکتے ہیں۔

واللہِ ما ترکَ من کلمۃٍ اعجبتنی فی تزویری الّا قالَ فی بدیھتہٖ مثلھا او افضلَ منھا۔

تھے ہی (اس موقع پر بھی اُن کا یہی رنگ رہا) بخدا کوئی وہ بہتر بات جو میں نے سوچ رکھی ہو، انھوں نے ایسی نہیں چھوڑی کہ فی البدیہہ اُس جیسی یا اُس سے بہتر نہ کہی ہو۔

بخاری کی روایت میں اس تقریر کا حاصل کہیے یا محض ایک جزو کہیے ذکر ہوا ہے۔ پوری تقریر کا نقشہ اس سے سامنے نہیں آتا۔ مسند احمد کی روایت میں اگرچہ ہے تو اختصار ہی مگر ایسا اختصار ہے کہ گویا پوری تقریر سامنے آجاتی ہے۔ لہٰذا اس روایت میں دیکھئے :۔

راوی ۔ حُمید بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں :۔

فتکلّم ابوبکر ولم یترکْ شیئاً اُنزلَ فی الانصار ولا ذکرہٗ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی شأنھم الّا ذکرہٗ قالَ الا وقد علمتم اَنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالَ لو سلکَ الناس وادیاً وسلکتِ الانصار وادیاً لسلکتُ وادی الانصار!

(مسند احمد جلد اوّل۔ مرویات ابی بکر)

حضرت ابوبکر نے تقریر فرمائی اور اس تقریر میں انھوں نے انصار کے فضائل ومناقب میں سے کوئی چیز نہ چھوڑی جو قرآن وحدیث میں وارد ہوئی ہو ـــ مگر یہ کہ اسکو بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر سب لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار ان سے الگ دوسری وادی میں تو میں انصار ہی کی وادی اختیار کرونگا اور انہی کے ساتھ چلوں گا۔

یہ ہے ان روایات کی روسے اس مجمع میں مہاجرین کی شان جنھیں بدنام کن تاریخ کا نام دیکر نسیاً منسیّاً کرا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے ـــــ کیا برادرانہ روش ہے اور کیا الفت ومودّت سے لبریز انداز گفتگو!! لیکن ہم مانے لیتے ہیں کہ بعد کے کسی مرحلہ پر مہاجرین کے رویہ میں کبھی سختی آگئی اور کچھ تیز باتیں ان کی طرف سے بھی نکل گئیں۔ تو بالفرض اگر ہم اسکے ساتھ یہ بھی مان لیں کہ یہ باتیں محض جوابی اور غیظِ طبعی کی پیداوار تھیں۔ تو ہم بتا چکے ہیں کہ

(باقی ص۵۴ پر)

ترجمہ

قانون اور مذہب

سر الفریڈ ڈیننگ

["سر الفریڈ ڈیننگ، انگلستان کے مشہور ماہر قانون اور جج ہیں۔ اس وقت دولت برطانیہ کے چیف جسٹس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔" آپ کا یہ مضمون "چراغ راہ" اسلامی قانون نمبر سے نقل کیا جا رہا ہے اور مضمون نگار کا یہ تعارف بھی چراغ راہ ہی سے لیا گیا ہے۔ ادارہ]

عہد قدیم میں مذہب اور قانون کا تعلق بہت ہی گہرا تھا مگر جدید زمانہ میں مذہب کا قانون پر کوئی نمایاں اثر باقی نہیں رہا ہے۔ گزشتہ ادوار میں مذہب، اخلاق اور قانون اجزاء لاینفک کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً تورات کے احکام عشرہ میں سے پہلا حکم مذہبی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں "خدا نے فرمایا کہ میں خداوند تیرا خدا ہوں، تیرا کوئی الٰہ نہیں ہے سوائے میرے"۔ پانچواں حکم اخلاقی نوعیت کا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "اپنے والدین کی عزت کرو، تاکہ تیرا قیام اس زمین میں دراز ہو جو تجھے خدا عطا کرے۔" آٹھواں حکم ایک قانونی فریضہ ہے اور اس کی عبارت یہ ہے۔ "تو ہرگز چوری نہ کر"۔ قدیم مذاہب و اقوام سب میں یہی صورت حال تھی۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ مذہب، اخلاق و قانون تینوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا، اس تفریق و امتیاز کو بہت دور تک پہونچا دیا گیا ہے حتیٰ کہ بہت سے لوگوں میں اب یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب اور قانون کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کا مقولہ یہ ہے کہ "مذہب خدا اور انسان کے تعلقات متعین کرتا ہے اور قانون ایک انسان اور دوسرے انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے"۔ اسی طرح ان لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ قانون کا اخلاق سے بھی واسطہ نہیں ہے، قانون بہر حال واجب الاتباع ہے، خواہ وہ اخلاقی لحاظ سے صحیح ہو یا غلط، قانون کا مقصد معاشرہ میں نظم و ضبط کو برقرار رکھنا ہے، نہ کہ عدل

انصاف کو قائم کرنا۔

میری دانست میں تفریق و انقطاع کا یہ تصور حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اگرچہ مذہب و قانون کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں بہت بڑی حد تک ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ مذہب کے بغیر اخلاق کا وجود ناممکن ہے۔ اخلاق کے بغیر قانون کا وجود محال ہے۔ آئیے میں آپ کو یہ دکھانے کی کوشش کروں کہ ہمارے قانون کے بنیادی اصول کس طرح عیسائیت کی تعلیمات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اصول حق و صداقت

سب سے پہلے ہم حق و صداقت کے اصول کو لیتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ سچ بولنا ہر آدمی کا بنیادی فریضہ ہے، اب اگر مذہب، اخلاق اور قانون کے تقاضوں سے قطع نظر کر کے محض مصلحت وقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حق پرستی کے خلاف بھی اتنے ہی دلائل دیئے جا سکتے ہیں، جتنے اس کے حق میں دیئے جا سکتے ہیں۔ انگریزی کی ایک ضرب المثل ہے کہ "دیانت و صداقت بہترین پالیسی ہے"۔ لیکن ایک مصلحت بین انسان کی نگاہ میں اسی ضرب المثل پہ کاربند ہونا، دانشمندانہ نہیں، بلکہ سراسر احمقانہ فعل قرار پائے گا۔ اگر جھوٹ بولنے سے اس کا مقصد حاصل ہوگا تو وہ ضرور جھوٹ بولے گا اور دلیل یہ دے گا کہ اصل اعتبار مقصد کا ہے نہ کہ ذریعہ کا ___ مثلاً ایک مصلحت پرست انسان کے خلاف اگر یہ الزام عائد کیا جائے کہ وہ نشہ کی حالت میں کار چلا رہا تھا، تو وہ بڑی آسانی سے انکار کر دے گا، خواہ یہ الزام صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جھوٹ سے ہمیں صرف اس لیے نفرت ہے کہ ہمیں اپنے والدین نے اس وقت سچ بولنے کی تعلیم دی تھی جبکہ ان کی آغوش عاطفت میں ہمارے اندر بھلے اور برے کی تمیز پیدا ہو رہی تھی۔ ہمیں دین مسیحیت نے یہ سکھایا ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر حال میں سچ بولیں۔ سینٹ پال نے فرمایا تھا۔ "جھوٹ کو ترک کر کے ہر آدمی اپنے ہمسایہ کے سامنے سچ بولے، کیونکہ ہم ایک ہی برادری کے افراد ہیں"۔ ہمارے اندر غصہ اور ناراضگی کے جذبات سب سے زیادہ اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے سامنے دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہماری شخصیت کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا آدمی ہمیں دھوکا دے اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم کسی دوسرے کو دھوکا دیں۔

بعض مذہبی خیال رکھنے والے لوگ خاص حالات میں نیک مقصد کے لیے جھوٹ بول لینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ ایک زمانے میں اسے جائز قرار دیتا تھا۔ مثلاً حضرت مسیح اور دوسرے صلحار کی زندگیوں کے بارے میں افسانے گھڑکر انھیں حقیقی واقعات کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے مقصود ایمان و اعتقاد کو پختہ کرنا تھا، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک فریب تھا۔ اسی کے نتیجہ میں "مقدس فریب" (Pious Fraud) کی اصطلاح وضع کی گئی جو اب ہماری زبان میں عام رائج ہو چکی ہے۔ —— موجودہ زمانہ میں اس کی مثال وہ دروغ مصلحت آمیز ہے جس کا ارتکاب ایک معالج اپنے مریض کے سامنے کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ فعل مریض کے حق میں نفع بخش ہوتا ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ "ہمسایہ سے سچ بولنے" کا حکم قطعی اور مطلق ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے نزدیک حق گوئی ایک قطعی فریضہ ہے جس میں کسی استثناء کی گنجائش نہیں ہے۔ انھوں نے اس کے حق میں صرف اس دلیل کو کافی سمجھا ہے کہ جھوٹ بولنے والے کو عالم آخرت میں حیاتِ طیبہ نصیب نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دور میں کانٹ اور بعض دیگر مفکرین کا بھی یہی خیال ہے کہ ہر حالت میں سچ بولنا قطعی ضروری ہے۔ آپ یہاں یہ سوال کر سکتے ہیں کہ حالتِ جنگ میں کیا دشمن کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بولا جاسکتا ہے لیکن ایک سچّا عیسائی اس کا بجا طور پر جواب دے سکتا ہے کہ جو دشمن ہمیں تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو اس پر "ہمسایہ" کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس سے سچ کہنا ضروری ہے۔

قانون اور صداقت

اب آپ قانون کو لیجئے، قانون کی نگاہ میں بھی سچ بولنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک خالص سچائی منظر عام پر نہ آئے قانون اور عدل کے تقاضے کبھی بھی پورے نہیں ہو سکتے، قانون اور عدل کی محافظت اور تنفیذ کا بہت بڑا ذریعہ ہمارا عدالتی نظام ہے۔ لیکن اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔ اس سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حق پرستی جس کا اصل سرچشمہ مذہبی تعلیم ہے، قانون کی بقا کے لیے کس قدر ضروری ہے، اور مذہب و قانون کا باہمی تعلق کتنا گہرا اور بنیادی ہے۔ یہاں میں جملہ معترضہ کے طور پر اتنا ضرور کہوں گا کہ میرا یہ استدلال ایک مفروضہ پر مبنی ہے اور یہ استدلال اسی صورت میں صحیح ہوگا جبکہ قانون بذاتِ خود عادلانہ ہو، اور عدالتوں میں بیٹھنے

والے جج خود بھی حق و انصاف کے تقاضوں کو پورے کرنے والے ہوں، اگر قانون ظالمانہ ہوگا یا عدلیہ کے علمبردار اس کے نفاذ و اجراء میں انصاف پسندی سے کام نہیں لیں گے تو عدالتوں میں سامنے پیش ہونے والے گواہوں کے اندر لازماً یہ رجحان پیدا ہوگا کہ وہ "مقدس فریب" سے کام لے کر دروغ بیانی کریں۔ ہمارے ہاں ایک زمانہ وہ تھا کہ چالیس شلنگ نیت کی چوری کی سزا موت تھی اس کا نتیجہ ایک مرتبہ یہ نکلا تھا کہ پانچ پونڈ کے ایک مسروقہ نوٹ کے بارے میں جیوری نے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس نوٹ کی قدر و قیمت انتالیس شلنگ سے ہرگز زائد نہیں ہے اور اس اعلان کو کسی نے بھی قابل مذمت نہیں سمجھا تھا، بہرحال قانون کا صرف واضح اور متعین ہونا ہی کافی نہیں، بلکہ اس کی کامرانی کے لیے اس کا مبنی بر انصاف ہونا بھی ضروری ہے۔

سچائی کے لازمہ قانون و انصاف ہونے اور اس کی ضرورت مسلم ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ دنیا بھر کی عدالتیں سچ بولنے پر اصرار کرتی ہیں اور ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم اٹھائے، ___ قانون کے نقطۂ نظر سے مذہبی تصورات (اعتقادات) کی اہمیت کی اس سے زیادہ واضح مثال ہمارے قانونی نظام میں مشکل سے ملے گی، گویا یہاں ___ قانون کا بنیادی مفروضہ اور نقطۂ آغاز یہ ہے کہ ہر شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور وہ خدا اور ایمان کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولے گا۔ عدالتوں کے قیام پر صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن آج بھی جو شخص گواہ کے کٹہرے کے سامنے آتا ہے اسے سب سے پہلے حلف اٹھانا پڑتا ہے۔ اس فعل کے تقدس کے پیش نظر عدالت میں ایک خاموش فضا پیدا کی جاتی ہے۔ گواہ اپنے ہاتھ میں مقدس کتاب لیتا ہے اور یہ الفاظ کہتا ہے "میں خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچی گواہی دوں گا، میں سچائی، مکمل سچائی پیش کروں گا، اور سچائی کے سوا کچھ پیش نہیں کروں گا۔" گواہ کے ہاتھ میں جو مقدس کتاب دی جاتی ہے وہ انجیل (New Testament) ہوتی ہے، الا یہ کہ گواہ کسی دوسری کتاب کا مطالبہ کرے جس وقت گواہ قسم اٹھاتا ہے تو وہ صرف یہی کو یاد نہیں کرا رہا ہوتا کہ وہ سچ بول رہا ہے، بلکہ وہ اپنے خدا کے سامنے پختہ عہد باندھ رہا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ "مقدس فریب" اور "جزوی صداقت" (Half Truth) خدا کے ہاں کسی کام کی نہیں ہے، ایک عامی سے عامی اور جاہل سے جاہل آدمی بھی جب کٹہرے میں آتا ہے تو اسے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے، ویسٹرن سرکٹ کی ایک عدالت میں اس واقعہ کا

باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے کہ ایک گواہ نے قسم کے پہلے معمول کے مطابق کلمات دُہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ "اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان ابھی قبض کر لے" چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اس کا خاتمہ ہو گیا، اس جگہ پر اس وقت ایک پتھر نصب کر دیا گیا تھا جو اب تک اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہا ہے ــــ اگر گواہ کسی ایسے مذہب یا عقیدے کا پیرو ہو جس کے لحاظ سے قسم کی کوئی دوسری شکل مناسب ہو تو عدالت میں اسی کو اختیار کیا جاتا ہے، گواہ کو بہرحال ایسی قسم اٹھانی پڑتی ہے جو اسے اپنے ضمیر اور اخلاق کے مطابق سچ بولنے کے لیے پابند کر دیتی ہو ــــ

اس بحث سے آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ قانون کا منشا اور تقاضہ صرف اتنا ہے کہ محض عدالت میں قسم کھا کر سچ بولنا ضروری ہو اور دوسرے مواقع پر جھوٹ بولنے میں ہرج نہیں ہے۔ نہیں ہرگز نہیں!! ہر انسان کے لیے یہ ضروری ہو کہ وہ جب کبھی کسی دوسرے انسان سے کوئی معاملہ کرے اس میں حق و صداقت کی روش پر رہے۔ قانون جتنا اس معاملہ میں سخت گیر و متشدد ہے اتنا کسی دوسرے میں نہیں ہے، وہ کسی پس وپیش اور ہیرا پھیری (misrepresentation) کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ایک بیان محض الفاظ کی حد تک صحیح ہو، لیکن اس میں کسی ایسے حصہ کو قصداً حذف کر دیا گیا ہو جس کی وجہ سے غلط اثر پیدا ہوتا ہو تو ایسا بیان ایک "فریب" ہے جیسا کہ لارڈ کیلسینٹ (Lord Kylsant) کو ایک مرتبہ خسارہ اٹھانے کے بعد پھر اس طرح حقیقت کا علم ہوا تھا۔ انھوں نے کیا یہ تھا کہ اپنی کمپنی کے منافع جات کے اعداد و شمار تو انھوں نے شائع کر دیئے، مگر نقصانات کے اعداد شائع نہیں کیے۔ اس سے کمپنی کی مالی حیثیت کا بہت غلط اندازہ ہوتا تھا۔ لارڈ موصوف کو اس کے نتیجے میں ایک سال جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ غلط بیانی اور فریب دہی وغیرہ کے بارہ میں ہمارے ہاں جتنے بھی قوانین نافذ ہیں ان کا اصل الاصول یہ ہے کہ "کسی آدمی کو کذب بیانی سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ بشرطیکہ قانون میں کچھ بھی گنجائش ہو۔ کسی عذر یا تاویل کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کسی نیک مقصد کے لیے بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ پاکیزہ مقصد کا ذریعہ بھی پاک ہونا چاہیے۔" اس معاملہ میں ہمارا قانون تو بلاشبہ بہت مضبوط اور معقول ہے۔ مگر میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قانون تنہا کافی نہیں ہے۔ اگر لوگوں کے اندر مذہب کی سچی روح مفقود ہو تو محض قانونی دفعات بالکل بے کار اور لاطائل ہیں۔ کیا دیانت و امانت کے

آجکل ناپید ہونے کی اصل وجہ الحاد و بے دینی نہیں ہے؟ بیشتر گواہ جو ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں، وہ حلف کی تقدیس کا کچھ بھی لحاظ نہیں رکھتے اور ایسا بیان دیتے ہیں، جو ان کے خیال میں ان کے مقدمہ کے لیے مفید ہو، خواہ وہ سچ ہو یا جھوٹ ہو۔

ایفائے عہد

وعدے کا پورا کرنا بھی، سچ بولنے سے کچھ اہم نہیں ہے۔ زبور کے الفاظ میں "کھرا آدمی صرف وہی ... ہے جو زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرے۔ خواہ اسے خود تکلیف کا سامنا کرنا پڑے"۔ اس اصول کو ہمارے قانون میں بڑا دخل ہے۔ ہمارا قانون معاہدات مختلف مراحل سے گزرتا رہا ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب کہ صرف قانونی دستاویز پر لکھا ہوا اور مہر زدہ معاہدہ قابل وثوق سمجھا جاتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب کہ صرف وہ معاہدہ لازم قرار دیا جاتا تھا جس کے عوض میں کچھ مالی لین دین عمل میں لایا جاتا تھا، لیکن موجودہ زمانہ میں ان تکلفات و رسوم کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ آج کل اگر انسان ایسا وعدہ کرتا ہے جس کی پابندی لازمی قرار دی جائے اور جس بنا پر دوسرا فریق کوئی کارروائی کرتا ہے تو اب اس کارروائی کے وقوع میں آجانے کے بعد اس وعدے کی پابندی ازروئے قانون واجب ہو جاتی ہے۔

معاہدات کی حفاظت کے لیے ہمارے قانون کا مستعد ہونا بڑی خوش آئند بات ہے لیکن بعض حالات میں یہ قانونیت حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس تجاوز کی سب سے واضح مثال ہمارے قانون کا وہ رویہ ہے جو اس نے مطبوعہ اور لگے بندھے معاہدات (standardised contracts) کے بارہ میں اختیار کر رکھا ہے، انشورنس کمپنیاں، بنک اور دوسرے تجارتی اور صنعتی ادارے، معاہدے کے چھپے چھپائے فارم تیار رکھتے ہیں، جن میں بے شمار شرائط درج ہوتے ہیں، ایک عام آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ یا تو ان سارے شرائط پر دستخط کرے یا پھر ان اداروں سے کوئی معاملہ ہی نہ کرے، ان پر دستخط کرنے والے افراد بالعموم اول تو ان ساری شرائط کو پڑھتے نہیں، اور اگر پڑھ بھی لیں تو سمجھتے نہیں، لیکن دستخط کرنے کے بعد ایک شخص ان شرائط کے ساتھ ایسا بندھ جاتا ہے گویا کہ اس نے ان میں سے ایک ایک شرط کو عمداً پورے شعور کے ساتھ قبول کیا ہے۔ پھر جب ان شرائط کی تعبیر اور تشریح کا مرحلہ آتا ہے تو معاہدے کی لفظی

پابندی پر بہت زور دیا جاتا ہو۔ اگر معاہدہ کرنے والا احتجاج کرتا ہو اور کہتا ہو کہ "مجھے ایسی نادیدہ صورت حال کا پیشگی کچھ بھی علم و تصور نہ تھا" تو اسے جواب دیا جاتا ہو کہ "یہ تمھارا اپنا قصور ہو، تمھیں ہوشیار خبردار رہنا چاہیے تھا۔" لیکن میرے خیال میں یہ قانونی روش صحیح نہیں ہو اور مذہبی تعلیمات کی روشنی میں اس کی اصلاح کی ضرورت ہو اگر سینٹ ٹامس اکوی ناس (St. Thomas Acquinas) ہوتے تو وہ یقیناً دستخط کرنے والے کو معذور قرار دیتے۔ فریقین میں سے ہر ایک کے اندر حسن نیت (Good Faith) کی موجودگی ضروری ہو۔ کسی ایک فریق کو اس کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے کہ وہ بال کی کھال نکال کر الفاظ میں سے ایسا مفہوم برآمد کرے جو دوسرے فریق کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ہو۔ قوانین ملکی کی تعبیر میں بھی ایسی دقتیں پیش آتی ہیں۔ بعض حالات میں منصفانہ قوانین کے الفاظ کو بھی ایسے معنی پہنا لئے جاتے ہیں جو قانون سازوں کی منشا کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ اور جن سے انصاف کے تقاضے بری طرح پامال ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون بڑا غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کرتا ہو اور جج یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ "پارلیمنٹ کے پاس کردہ قوانین کے رخنوں کو پُر کرنا ہمارا کام نہیں ہو۔"

لفظی موشگافیاں

میرا خیال یہ ہو کہ معاہدات اور قوانین کی تشریح میں اس قسم کی موشگافیاں سچائی کے بنیادی اور حقیقی تصور کے قطعاً منافی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ انسان الفاظ پر حاکم ہونے کے بجائے ان کا محکوم بن کر رہ جاتا ہو، اگر آپ انجیل پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ محض الفاظ کی غلامی کی کتنی مذمت کی گئی ہو۔ اس سلسلہ کی نمایاں مثال وہ واقعہ ہو جو یوم السبت سے متعلق ہو، توراۃ کا چوتھا حکم یہ ہو کہ "سبت کے دن تو کوئی کام نہ کر۔" ایک مرتبہ حضرت مسیح کے حواری گندم کے کھیت میں سے گذر رہے تھے اور ہفتہ (سبت) کا دن تھا۔ انھوں نے خوشے توڑنے شروع کر دیے۔ فریسیوں نے کہا کہ "سبت کے دن یہ لوگ فعل حرام کا ارتکاب کیوں کر رہے ہیں؟" سینٹ پال نے اسی حقیقت کو ان جامع اور مختصر الفاظ میں بیان کیا ہو کہ "الفاظ جان لیوا ہیں مگر معانی جان بخش ہیں۔" کسی زمانے میں ہمارے انگریزی قانون میں اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں بائبل کا نیا نیا ترجمہ انگریزی میں ہوا تھا۔ ہمارے جج اسے پڑھا کرتے تھے اور ان کے فیصلے بلا شبہ اس سے اثر پذیر ہوا کرتے تھے، وہ قانون کی محض لفظی تعبیر پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ اس خرابی یا کمزوری کو نگاہ میں رکھتے تھے، جسے رفع کرنے

کے لیے قانون بنایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ قانون سازوں کے مقصود و مدعا (Intention) کو زندگی اور قوت بخشتے تھے، لیکن انیسویں صدی میں اس وسیع نقطۂ نظر کو ایک ایسے قاعدے میں بدل دیا گیا، جو بیرن پارک کے الفاظ میں "زرّیں اصول تھا"۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تمام قوانین و معاہدات کے الفاظ کی تعبیر لغت اور گرامر کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں عدل، قانون اور قانون سازوں کا اصل مدعا بالکل فوت ہو جائے، میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جج بالکل آنکھیں بند کرلیں، ہاتھ باندھ لیں۔ اور صورتِ حال کی ساری خرابی کا الزام مقننہ کے سر ڈال دیں۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ الفاظ کی غلامی میں مبتلا ہوئے بغیر عبارت کی ایسی معقول توضیح و تاویل کی جانی چاہیے جو قرینِ عدل و انصاف ہو، حق اور صداقت تک رسائی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔

عدل و انصاف

حق پرستی اور ایفائے عہد کے بعد آئیے۔ اب عدل و انصاف کو لیں۔ میرے خیال میں اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کو ہمیشہ ہر معاملے میں عادلانہ اور منصفانہ رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں انصاف کا مفہوم بالکل وہی ہے جسے مسیحی تعلیمات میں محبت (Love) کا نام دیا گیا ہے۔ آرک بشپ آف کنٹربری ولیم ٹمپل کا بھی یہی خیال ہے اور میں انھیں موجودہ صدی کے عظیم ترین مفکرین میں شمار کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں: "یہ امر مسلم ہے کہ عیسائیت میں غالب اور امتیازی عنصر "محبت" ہوتا ہے اور اجتماعی تنظیمات میں محبت کا ظہور "عدل" کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو انجیل میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ کسی فقیہ نے حضرت مسیح سے پوچھا "اے میرے آقا! حیاتِ ابدی کیسے نصیب ہوتی ہے" آپ نے جواب دیا "کتاب میں تم نے کیا پڑھا ہے؟" اُس نے جواب دیا "لکھا ہے کہ تم اپنے خداوند خدا سے دل و جان سے محبت کرو، اور اپنے ہمسایہ سے ایسی محبت کرو جیسی تمھیں اپنے آپ سے ہے"۔ حضرت مسیح نے فرمایا "تم نے ٹھیک جواب دیا ہے، اس پر عمل کرو اور تم ہمیشہ زندہ رہوگے"۔ خالق و مخلوق سے محبت کا یہ تصور بنیادی طور پر مذہبی تصور ہے اور زندگی کے اکثر معاملات میں اس کا عملی ظہور منصفانہ برتاؤ ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ آپ مثال فرض کیجیے کہ ٹریڈ یونین اور کارخانہ داروں کا جھگڑا چل رہا ہے اور کارخانہ میں ہڑتال کا سخت خطرہ ہے، اب ٹریڈ یونین کمیٹی کو "محبت" کا رویہ اختیار کرنا چاہیے، مگر وہ کس سے محبت کرے مزدوروں سے یا کارخانہ داروں سے، جواب یہ ہے کہ "دونوں سے"۔ آپ پھر یہ سوال کریں گے کہ عملاً اس

جواب سے کچھ رہنمائی حاصل نہیں ہو رہی۔ کہ کس طرح تجاویز مانی یا منوائی جانی چاہییں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں باہمی محبت کا مطلب یہ ہو کہ دونوں سے انصاف برتا جائے اور اس کا عملی طریقہ یہ ہو کہ ایک انتہائی غیر جانبدار ٹربیونل تشکیل کیا جائے جس پر فریقین کو پورا اعتماد ہو، ہر فریق اس کے سامنے اپنا اپنا مقدمہ پورے زور و داد اور دلائل کے ساتھ پیش کرے اور ہر فریق اس بات کا پختہ عزم کرے کہ فیصلہ بلا چون وچرا انشراح صدر کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا، اس طرح سے دونوں کے ساتھ یکساں سطح پر انصاف ہوگا اور یہ ہمارے اس مذہبی اصول کے بالکل مطابق ہوگا کہ "تو اپنے ہمسایہ سے ویسی محبت کر جیسی تو اپنے نفس سے کرتا ہے۔"

عدالت کا فیصلہ

فریقین تنازعہ کے بارے میں ہم نے دیکھ لیا کہ مذہب کی روشنی میں ان کا طرز عمل کیا ہو جس سے "محبت" کا تقاضہ پورا ہو۔ آئیے اب دیکھیں کہ تنازعہ جس جج کے سامنے پیش ہو اس کو کیا کرنا چاہیے، اسے بھی انصاف سے کام لینا چاہیے۔ مگر اسے کیسے معلوم ہوگا کہ انصاف کس شے کا نام ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ایک بہت بڑے جج نے اس مسئلہ کو کیسے حل کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک شربت ساز نے ایسی لاپرواہی سے مشروبات کو تیار اور بند کرایا کہ بوتل میں جیتا جاگتا گھونگا داخل کر دیا گیا۔ یہ بوتل اس سے ایک دوکاندار نے اور دوکاندار سے ایک گاہک نے خریدی، گاہک کی بیوی نے اسے پیا اور بیمار ہو گئی۔ پہلے زمانہ میں ایسے معاملات کے بارہ میں قانون کا فیصلہ یہ تھا کہ مال کا تیار کرنے والا ایسے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے، کیونکہ آخری خریدار کے ساتھ اس کا براہ راست لین دین کا کوئی معاملہ نہیں ہوا، لیکن ۱۹۳۲ء میں ہاؤس آف لارڈس نے یہ پاس کر دیا کہ صناع اس طرح کے نتائج کا ہر لحاظ سے ذمہ دار ہے۔ اس کی بنیا لارڈ اٹکن (

کا وہ فیصلہ تھا جو مسیحیت کی تعلیمات کا صحیح مظہر تھا اور جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ "ہم ہمسائے سے محبت کے اصول کا انطباق قانون کی دنیا میں اس طرح کرتے ہیں کہ ہمسائے کو کوئی گزند نہیں پہونچانا چاہیے۔ آپ کو پوری اور معقول احتیاط برتنا چاہیے کہ آپ کوئی کام ایسا نہ کریں یا کرنے سے باز رہیں جس کے کرنے یا باز رہنے سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہو کہ آپ کے ہمسائے کو تکلیف پہونچے گی۔"

ؒ عیسائیت اور نظام اجتماعی (Temple: Christianity and The Social order)

اب وکیل پوچھتا ہے کہ قانون کی نگاہ میں ہمسایہ کون ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمسائے وہ لوگ ہیں جو میرے فعل سے براہِ راست متاثر ہوتے ہیں اور اتنے قریب سے متاثر ہوتے ہیں کہ فعل کے صدور کے وقت ان لوگوں کے متاثر ہونے کا امکان بجا طور پر میرے ذہن میں موجود ہونا چاہیے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارے ہاں کا ایک بہت بڑا جج قانون کے اصول کو نہیں، بلکہ انصاف کے اصول کو دینی تعلیمات سے اخذ کرے۔ میں نہیں جانتا کہ ایک منصف اگر اس ماخذ اور سرچشمہ کی طرف رجوع نہ کرے تو پھر اور کہاں جائے۔ بعض لوگ فطری انصاف (natural justice) کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں گویا کہ یہ ایک ایسی شئے ہے جسے ہر شخص آپ سے آپ جانتا ہو خواہ اس کی پرورش اور تربیت کیسے ہی ماحول میں کیوں نہ ہوئی ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے اندر انصاف اور سادہ اخلاق عامہ کے تصورات کا نشوونما ایک لمبے تاریخی ارتقائی سفر کے تحت ہوا ہے۔ انگلستان کے قانونِ عامہ (common law) کو صدیوں کے تدریجی عمل کے بعد ان ججوں نے اپنے ہاتھوں سے ایک سانچے میں ڈھالا ہے جن کی تعلیم و تربیت عیسائیت کے مذہبی ماحول میں ہوئی اور جنہوں نے عدل و انصاف کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمیشہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔

جرائم کا سدِّ باب

اب آپ دیکھئے کہ جرائم کی روک تھام کے لیے کس طرح مذہب اور قانون دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ یہ تعلیم کے بغیر چارہ نہیں ہے اور مذہب ہی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کن حالات میں وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جو جرائم کے ارتکاب کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے ہاں گھریلو زندگی کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ اکثر کمسن اور نابالغ مجرمین ٹوٹے ہوئے گھرانوں (broken homes) میں سے آتے ہیں۔ ایک نوعمر انسان جب اپنے گرد و پیش کے ماحول میں اپنے لیے کوئی دلچسپی نہیں پاتا تو وہ اس بے رحم دنیا سے لڑنے کا عزم کر لیتا ہے۔ اس کے اندر لازماً اجتماعیت کش اور مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگ جاتی ہے۔ یہ برباد اور ویران گھرانے جو کثیر تعداد میں مجرمین فراہم کرتے ہیں، ہمارے اس معاشرے کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں، جو رشتۂ ازدواج کا احترام کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے جو اپنے اخلاقی اقدار و معیارات کو خیرباد کہہ رہا ہے اور جو اپنے مذہب سے قطع تعلق کر رہا ہے۔ معاشرے کی اصلاح

کیے بغیر محض مجرموں کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا، مرض کو چھوڑ کر مرض کی علامات کے پیچھے پڑنا ہے۔ ہم مرض کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، اس کے لیے پوری سوسائٹی کی اصلاح لابدی ہے۔ اور اس ضمن میں مذہبی اور اخلاقی مصلحین اور رہناؤں کی ذمہ داری بہت کٹھن ہے۔ یہ دیکھ کر ٹیڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے سب سے اونچے گھرانوں میں خانگی ناچاقیوں اور ازدواجی جرائم کی مثالیں روز افزوں ہیں۔

فرد کی ذمہ داری

جرائم کی ذمہ داری اگرچہ معاشرے پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن نہ تو قانون کی نگاہ میں اور نہ مذہب کی نگاہ میں فرد کو بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ عیسائیت کی رو سے ایک فرد بھی اپنے گناہوں کا بہت حد تک ذمہ دار ہے، عیسائیت ایک خطا کار کو یہ کہہ کر معاف نہیں کر دیتی کہ "جاؤ تمھارے کنبے یا تمھارے ماحول نے ایسا کرنے پر تمھیں مجبور کر دیا تھا" اس سے یہ کہنا تو اس کو اطمینان دلاتا ہے کہ برائی کی روک تھام اور اس کے خلاف انفرادی جد وجہد بالکل غیر ممکن اور غیر ضروری ہے، عیسائیت کا نقطۂ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ مجرم سے تائب و نادم ہونے اور آئندہ اصلاح کرنے کا مطالبہ کرتی ہے — ہماری دعا کی کتاب (Book of Common Prayer) کا اولین فقرہ یہ ہے کہ جب گنہگار اپنے گناہ سے باز آجاتا ہے اور نیکی کا کام کرتا ہے تو وہ اپنی روح کی زندگی اور سلامتی کو محفوظ کر لیتا ہے" سینٹ لیوک (St. Luke) نے فرمایا ہے کہ "جب خدا ایک پشیمان اور خطا کار کو اپنے حضور میں دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے" ایک سزا وار مجرم کے اندر خیانت نفس (sense of guilt) کے احساس کا پیدا ہونا نہایت ضروری ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے بقول اس احساس کے بغیر تطہیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ہنری اول کے عہد میں تو اس بات کو بطور ایک قانونی دفعہ کے ثبت کیا گیا تھا کہ "جرم وہ ہے جس پر ضمیر ملامت کرے" اگر غور اور تامل سے دیکھا جائے تو آج بھی قانون جرائم کی بنیاد یہی نظریہ ہے کہ جو فعل اخلاقی لحاظ سے قابل مذمت ہو قانونی لحاظ سے وہی مستوجب سزا و عقوبت ہے۔ گویا ایک فعل کے "جرم" ہونے کے لیے اس کا "گناہ" ہونا ضروری ہے۔

ص

فرد اور جماعت

اسی بحث کے دوران میں یہ بنیادی سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت —— شہری اور ریاست —— کے باہمی تعلقات کے حقوق کی تعیین کس طرح سے ہو، حق اور انصاف کوئی مجرد تصورات نہیں ہیں کہ ایک فکری خلا کے اندر ان کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان کا عملی مظاہرہ ایک جماعت یا دوسرے لفظوں میں ریاست کے وجود ہی کے تحت ہوتا ہے۔ اب ریاست اور معاشرہ کو ایسی بنیادوں پر بھی استوار کیا جا سکتا ہے۔ جہاں حق اور عدل کا گلا بالکل گھونٹ دیا جائے اور صرف اس کا ذکر خیر ہی باقی رہ جائے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے پھر مذہب کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ مذہب کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے ہمیں پھر ولیم ٹیمپل کے الفاظ مستعار لوں گا وہ فرماتے ہیں "مسیحی اخلاقیات اور مسیحی سیاست کا ابتدائی اصول یہ ہے کہ فرد بحیثیت فرد کے انفرادی اعزاز و احترام کا مستحق ہے۔ اگر ہر مرد اور ہر عورت خدا کی مخلوق ہے جس سے خدا محبت کرتا ہے، تو معاشرے کے حق میں ایک فرد کی افادیت سے قطع نظر ہر فرد کی ایک مستقل بالذات شخصی قدر و قیمت ہے۔ فرد کا درجہ اولین ہے اور جماعت کا درجہ ثانوی۔ ریاست شہری کے لیے ہے، نہ کہ شہری ریاست کے لیے)۔ مسیحیت نے ہمیشہ اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ ریاست کو آخری یا مطلق اقتدار حاصل نہیں بلکہ وہ اپنے اقتدار کو اللہ تعالیٰ سے اخذ کرتی ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کو جو مکتوب روانہ کیا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "اقتدار کسی کو حاصل نہیں سوائے اللہ کے، تمام حکمراں خدا کے محکوم ہیں"۔ یہی تو وہ سپر ہے جس سے مسلح ہو کر بہت سے آباؤ اجداد نے ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا تھا۔ سینٹ پال نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ریاست تو نیکی کے قیام میں خدا کی نائب ہے ([illegible])، جب تک ریاست اپنی مقدس امانت کو ادا کر رہی ہے، اس کی مزاحمت جائز نہیں لیکن جب وہ حد سے تجاوز کر کے اقتدار مطلق ([illegible]) کی مدعی بنتی ہے تو اس کی مزاحمت حق بجانب ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جن آدمیوں میں جبلی طور پر جنسی یا بعض دوسرے وحشیانہ جرائم کے ارتکاب کا میلان ہو تو انھیں بانجھ[1] بنا دینا چاہیے۔ یا غیر محدود عرصہ کے لیے انھیں محبوس کر دینا

---

[1] بانجھ کے بجائے "بیکار" کا لفظ شاید مناسب تھا۔ (الفرقان)

چاہیے یا قتل کر دینا چاہیے۔ لیکن ہمارے ملک میں کسی شہری سے یہ سلوک روا رکھنے کی قانوناً کوئی گنجائش نہیں ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مذہبی تعلیمات کا ثمرہ ہو۔ مذہب کی رو سے آزادی، زندگی اور زندگی کو وجود میں لانے والے توالد و تناسل کے ذرائع سب مقدس و محترم ہیں۔ جو خدا کا عطیہ ہیں اور وہی انھیں ہمیشہ کے لیے واپس لے سکتا ہو، اگر ریاست کو ان عطیات پر ہاتھ ڈالنے کی کھلی چھوٹ دے دی جائے تو وہی کچھ ہوگا جو نازی ریاستوں نے کیا یعنی انھوں نے اپنے سیاسی مخالفین پر یہ حربے آزمانے شروع کردیے۔ میرے ذہن میں اس مسئلہ کا کوئی حل سوائے اس کے نہیں ہو کہ ہم مذہب سے رجوع کریں وہی ہمیں بتائے گا کہ شہری اور ریاست کے حقوق میں توازن کی معتدل صورت کون سی ہو۔

جیمز اول (James I) کے عہد میں ایک مشہور و معروف واقعہ پیش آیا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ بھی مطلق العنان بادشاہ کی طرح انگلستان میں حکومت کرسکتا ہو اور عدالتوں میں استغاثہ اور مرافعہ کے بغیر وہ معاملے میں آخری فیصلہ دے سکتا ہو۔ لارڈ بین کرافٹ (Ban croft) نے بھی بادشاہ کی تائید کی، لیکن اس زمانہ میں ایک بہت بڑے لارڈ چیف جسٹس تھے ان کا نام تھا لارڈ کوک (Edward Coke) وہ اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے۔ (اور ان کی کثیر مصروفیتوں کے ساتھ تعجب ہوتا ہو کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کر لیتے تھے۔) انھوں نے بادشاہ سے کہا "آپ کو فیصلے سنانے کا کوئی حق نہیں ہو۔ تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں" بادشاہ نے کہا "میں نے تو یہ سن رکھا ہو کہ تمھارے قوانین کی بنا عقل پر رکھی گئی ہو، تو کیا میں ججوں سے کمتر عقل ہوں" چیف جسٹس نے جواب دیا "آپ بلاشبہ بہت علم و صلاحیت کے مالک ہیں، لیکن قانون کے لیے بڑے تجربے اور مطالعے کی ضرورت ہو۔ یہ تو ایک سنہری پیمانہ ہو جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہو اور خود حضور والا کی حفاظت کی جاتی ہو" بادشاہ نے غضبناک ہوکر کہا کیا "میں بھی قانون کے ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہو" لارڈ کوک نے بریکٹن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا، "بادشاہ کسی آدمی کا محکوم نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا محکوم ہو"

دستور کا سنگِ بنیاد

بریکٹن (Bracton) کے الفاظ جو ہمارے قاضی القضاۃ لارڈ کوک نے نقل کیے تھے یہ درحقیقت ہمارے دستور کا سب سے قیمتی اثاثہ ہیں ـــــ خدا اور قانون سے بادشاہ کے بالاتر نہ

ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ (Executive) قانون کے ماتحت ہے۔ یہاں [illegible] یہ دستوری کلیہ بیان کر رہے تھے تو وہ دراصل اپنا ایک مذہبی عقیدہ دہرا رہے [illegible] عقیدے کو فراموش کر بیٹھیں تو ہمارا انجام کیا ہوگا اور اس خود فراموشی کی زد کہاں کہاں پڑے گی، اس کے دور رس نتائج و عواقب کا مشاہدہ کرنے کے لیے آپ ایک نظر اٹھا کر دنیا کی آمرانہ ریاستوں کو دیکھ لیں، وہاں ریاست کو فرد پر مقدم قرار دے کر فرد کے وجود کو ریاست میں گم کر دیا گیا ہے، وہاں شہری ریاست کے لیے زندہ ہے نہ کہ ریاست شہری کے لیے، وہاں کے حکمراں خدا اور قانون کے تابع نہیں ہیں، وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہیں، تمام قوانین اور تمام عدالتیں انتظامی مشینری کے کل پرزے ہیں۔ ان کا کوئی مستقل اور آزادانہ وجود نہیں ہے، فرد کی آزادی کی حقیقت خواب و خیال سے بھی کمتر ہے۔ ایسی ہولناک مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف اور حیات انسانی پر اس مہیب تسلط کے خلاف ہمارا مذہب پورے زور اور پوری قوت کے ساتھ احتجاج کرتا ہے۔

اب میں اپنی بحث کو ختم کرتا ہوں، آپ خود دیکھ لیجئے کہ بحث کس نتیجہ پر پہونچ کر ختم ہو رہی ہے۔ بلاشبہ آخری نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم حق اور عدل کے متلاشی ہیں تو ہم اسے بحث و مباحثوں اور مناظروں کے ذریعہ سے، منطق اور غور و فکر کے ذریعہ دریافت نہیں کر سکتے ۔۔ صداقت [illegible] تک رسائی نیکوکاری اور دینداری کی وساطت ہی سے ہو سکتی ہے، سچائی [illegible] ہو اور روح کو زندگی اور جلا مذہب کے ذریعہ ہی سے ملتی ہے۔ قانون تو سچائی [illegible] کو [illegible] اور منطبق کرنے کا محض ایک ناقص اور ادھورا وسیلہ ہے جس کا ظہور [illegible] دین اور [illegible] کے معاملات میں ہوتا ہے۔ جس دن روئے زمین پر مذہب کا خاتمہ ہو [illegible] سچائی اور عدل کا بھی جنازہ اٹھ جائے گا۔ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے [illegible] دور رہے ہیں پر منظلے دراز گزر چکی ہیں آ گئے ہیں، اس کی طرف لوٹیں کیونکہ [illegible] ایک شے ہے جو ہمیں بچا سکتی ہے!!۔

(بقیہ ارشادات مجدد الف ثانیؒ صنہ ۲۰)

—— اس آیت میں بھی ملتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صراطِ مستقیم فرمایا گیا ہے اور اس کے علاوہ تمام راستوں کو داخلِ سُبُل کر کے ان پر چلنے سے منع فرما دیا ہے —— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اظہارِ شکر، اطلاعِ خلق اور ہدایتِ خلق کے طور پر خیر الہدی ہدیٔ محمد (بہترین سیرت سیرتِ محمدی ہے صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا ہے۔ نیز ارشاد فرمایا ہے — اَدَّبَنِی رَبِّی فَاَحْسَنَ تَادِیبِی — میرے رب نے براہِ راست میری تربیت کی ہے اور خوب سے خوب تر کی ہے۔

باطن ظاہر کا مکمل کرنے والا ہے ان دونوں میں باہم گر سرِ مو مخالفت نہیں —— مثلاً جھوٹ زبان سے نہ بولنا شریعت ہے اور دل میں کذب کا خطرہ نہ آنے دینا طریقت و حقیقت ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر یہ بات اہتمام سے کرنی پڑتی ہے تو طریقت ہے۔ اور اگر بے اہتمام و تکلف میسر ہے تو حقیقت ہے۔ پس فی الحقیقۃ باطن جو کہ بالفاظ دگر طریقت و حقیقت ہے — ظاہر کی جو کہ شریعت ہے — تکمیل کرنے والا ہے۔ پس سالکانِ راہِ طریقت و حقیقت کو اگر اثنائے سلوک میں ایسے امور ظاہر ہوں جو بظاہر مخالفِ شریعت ہیں تو اس کو غلبۂ حال پر محمول کیا جائے گا..... ہر وہ چیز جس میں اخلاق و شمائلِ محبوب جلوہ گر ہوں بہ تبعیت محبوب، محبوب ہو جاتی ہے۔ آیہ —— فَاتَّبِعُونِی یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ (اے رسول کہہ دیجیے) میری متابعت کرو اللہ تم کو محبوب بنا لے گا) میں اسی رمز کا بیان ہے — پس متابعتِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں کوشش کرنا مقامِ محبوبیت تک پہونچاتا ہے، پس ہر عاقل پر ظاہراً و باطناً کمالِ اتباعِ رسول میں سعی کرنا لازم ہے —— ....

(بقیہ "حدیثِ پرویز" صنہ ۴۶)

اتفاقی اور ہنگامی طور پر اس قسم کا مظاہرہ ہو جانا عمومی شان "رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ" پر ہرگز کوئی دھبہ نہیں لگاتا۔ مگر ہمیں تو یہ ماننے سے بھی انکار ہے کہ یہ تیزی اور سخت کلامی محض نفسِ بشری کا تقاضہ تھی۔ ہم تو سمجھتے ہیں، اور کوئی دلیل اسکے خلاف نہیں ہے، کہ جس طرح وہ شروع کی نرمی دینی احساسات کا نتیجہ تھی، اسی طرح یہ بعد کی گرمی بھی دینی جذبات کی لائی ہوئی تھی۔ جب ان کی نرمی اور شیریں کلامی انصار کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکی (جو اُن کے نزدیک اسلام کے حق میں انتہائی ضرر رساں تھا) اور انھوں نے دیکھا کہ اُن کی نرمی سے کہیں بات قابو سے نکل نہ جائے تو انھوں نے سختی اور گرمی کا رویہ اختیار کیا —— اور اس کا منشا اور محرک دین اور صرف دین تھا۔ اس کے سوا کچھ نہیں! —— اور دین کے لیے آپس میں سختی اور گرمی کو "رُحَمَاءُ

"بینہ" کے خلاف وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے نہ دین کو سمجھا نہ قرآن کو سمجھا۔ (باقی)

حسنی فارمیسی

ہم کو لکھنؤ کے مشہور معالج حکیم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مدظلہ بی ایس سی ایم بی بی ایس کے خاص اور منتخب نسخوں کو تیار کرنے کا فخر حاصل ہو، ڈاکٹر صاحب موصوف کی چند منتخب ترین ادویات آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہے جنہوں نے سینکڑوں مریضوں کو فائدہ پہونچایا ہے۔

سفوف ذیابیطس

سفوف ذیابیطس وہ دوا ہے جسکے استعمال سے [illegible] میں شکر کی کمی شروع ہو جاتی ہے اور قوت واپس آنے لگتی ہے۔ اور رات کو بار بار اٹھنے اور [illegible] ہونے سے نجات [illegible] ہو جاتی ہے۔ [illegible] ذیابیطس کے جن مریضوں کے [illegible] استعمال [illegible] تندرست آدمیوں کے [illegible] میں ہوتی ہے۔ سفوف ذیابیطس کے [illegible] کے استعمال سے [illegible] فائدہ قائم رہتا ہے۔

مقدار خوراک [illegible]

قیمت فی شیشی ... عہ/ ... علاوہ محصول ڈاک

شربت جذام

شربت جذام کا فائدہ بفضل خدا کے [illegible] سے ۹۰ [illegible] کے درمیان [illegible] جذام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ایسی ہے کہ ہر شخص پہچان لیتا ہے دوسری قسم [illegible] شربت [illegible] ڈاکٹر [illegible] اس کی علامت یہ ہے کہ [illegible] دھبے [illegible] اکثر جلد پر [illegible] پڑ جاتے ہیں اگر ایک شیشی میں گرم پانی [illegible] دوسری میں سرد پانی لیکر ان دھبوں پر لگایا جائے تو کوئی فرق محسوس نہ ہوگا۔ شربت جذام کے استعمال سے [illegible] ہوتا ہے [illegible] دوا استعمال کرنی چاہئے۔

مقدار خوراک ۲-۳ چائے کے چمچہ کے برابر صبح دوپہر شام

قیمت فی بوتل ... صہ/ ... علاوہ محصول ڈاک

مرہم سرخ

یہ بھی [illegible] دوا [illegible] ہے۔ پھوڑوں [illegible] کا [illegible] استعمال بیحد مفید ہے۔ [illegible] پر ہوتا ہے [illegible] یا [illegible] جاتا ہے [illegible] چھوٹے چھوٹے سوراخ ہو جاتے ہیں اور شہد کی مکھی کے چھتے کی سی شکل ہو جاتی ہے۔ اگر اس کا آپریشن کر دیا جائے تو بھی تکلیف باقی رہتی ہے [illegible] مدت تک [illegible] اچھا ہوتا ہے۔ سرخ مرہم کا استعمال کرنے سے درد اور جلن کافور ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ پورا چھتہ صاف ہو کر صحت ہو جاتی ہے۔

قیمت فی شیشی ... ... عہ/

علاوہ محصول ڈاک

اکسیر پراسٹیٹ

بڑھاپے میں بعض لوگوں کو یہ شکایت ہو جاتی ہے ابتدا میں پیشاب کی دھار کمزور ہوتی ہے اس کے بعد یہ حال ہوتا ہے کہ پیشاب کھل کر نہیں ہوتا اور بار بار پیشاب کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ پراسٹیٹ غدود جیسا بڑھتا ہے پیشاب کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ آخر نوبت یہاں ہو کہ پیشاب بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں سوا آپریشن کے چارہ نہیں۔ پیشاب بالکل رک جانے سے پہلے دوا سے اس مرض کا علاج ہو سکتا ہے "اکسیر پراسٹیٹ" پینے سے پراسٹیٹ اصلی حالت پر آجاتا ہے اور پیشاب حسب معمول ہونے لگتا ہے۔

قیمت فی شیشی ... ... صہ/

حسنی فارمیسی ۲۷ گوئن روڈ، لکھنؤ

دُنیا میں

سب سے بڑا روحانی انقلاب

پیغمبر خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ برپا ہوا تھا

جو لوگ اردو زبان کے ذریعہ

اُس تعلیم و ہدایت سے واقف ہونا اور فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جس نے یہ انقلاب برپا کیا تھا

ہم انکی خدمت میں مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ کی تالیف

معارف الحدیث

اعتماد اور یقین — کے ساتھ پیش کرتے ہیں

اردو ترجمہ و تشریح کے ساتھ یہ حدیث نبوی کا ایک جدید مجموعہ ہے جو دور حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی و فکری سطح کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ مصنف کی خاص کوشش پوری کتاب میں یہ رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے جو اثرات صحابہ کرام کے قلوب پر پڑتے تھے اِس کتاب کے ناظرین کے دلوں پر بھی وہی اثرات کسی درجہ میں پڑیں — (دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں)

جلد اوّل — جس میں ایمان اور آخرت سے متعلق ۱۳۰ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت مجلد ۴/۸ غیر مجلد ۳/۱۲

جلد دوم — جس میں تزکیہ روح اور اصلاح اخلاق سے متعلق ۲۶۰ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے جنکے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ (قرآن مجید کے بعد) تزکیہ نفس، اصلاح قلب اور تربیت اخلاق کا کوئی موثر ذریعہ ان حدیثوں سے بڑھ کر دنیا کے اصلاحی ادب میں موجود نہیں ہے۔ قیمت مجلد ۵/۸ غیر مجلد ۴/۸

ملنے کا پتہ — کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW.

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ، عہد ہے

اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت و بندگی کریں گے، زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی

اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت و شریعت کی پیروی کریں گے، اسی حال میں جئیں گے اور مریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی

زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں ہم اسی کا

عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ

تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ

ادارۂ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمن سنبھلی

ماهنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

ہندوستان و پاکستان سے	غیر ممالک سے
سالانہ چندہ (سکۂ ہندوستان) ۶	سالانہ چندہ ...... ۱۰ شلنگ
سالانہ چندہ (سکۂ پاکستان) ۷	اعزازی خریداروں سے
[illegible] ۱۲	سالانہ ۲۵

جلد ۲۷	بابتہ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۹ء	شمارہ ۳

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے، براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ وی پی میں آپ کے کچھ آنے زائد صرف ہوں گے اور رسالہ دیر سے پہنچے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں [illegible] تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار — اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں۔

اور منی آرڈر کی رسید ہمارے پاس فوراً بھیج دیں۔

تاریخ اشاعت — رسالہ ہر انگریزی مہینے کی ۱۲ کو روانہ کر دیا جاتا ہے، اگر ۲۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو اطلاع دیں۔ ان کی اطلاع ۲۵ تاریخ تک دفتر میں آجانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

بارہ سال یہ سوچتے سوچتے بیت گیے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مسئلہ کس طرح حل ہو؟ وہ کس طرح باعزت زندگی حاصل کریں؟ کس طرح ان کی نئی نسل کا اپنے دین سے کم از کم اتنا تعلق برقرار رہ سکے جتنا اس وقت مسلمان قوم کا مجموعی طور پر ہے؟ اور کس طرح انکی آئندہ نسلوں کے دین و ایمان کے تحفظ کا اطمینان ہو؟

ان مسائل پر بارہ سال سے غور وخوض ہو رہا ہے بلکہ صحیح الفاظ میں ان امور کے بارے میں ایک عام فکرمندی پائی جاتی ہے۔ مگر فکر ونظر کے دائرہ سے نکل کر مستقل مزاجی کے ساتھ کسی عملی اقدام کی نوبت ابتک نہیں آئی ہے۔ دراصل یہی وجہ ہے کہ مسائل جوں کے توں ہیں۔ اور ڈور سلجھنے کے بجائے روز بروز کچھ زیادہ ہی الجھتی جارہی ہے۔ مسائل تمامتر عملی اور تبدریج حل ہونے والے ہیں۔ نہ محض سوچ بچار ان معاملات میں ہمیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے' اور نہ عمل کے میدان میں پہلا قدم رکھتے ہی ہم منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ ہمیں ایک کسان کی امید' ایک کسان کے صبر' اسکی لگن اور پیہم محنت سے کام لینا ہوگا تب کہیں جاکر ہم کسی خوش آئند حل کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

کسان کو ایک زمین سے فصل لینی ہوتی ہے تو دیکھیے وہ پہلے اس زمین کو توڑتا ہے اس میں بار بار ہل چلاکر اور دوسرے ضروری کام کرکے اسے تخم ریزی کے قابل بناتا ہے۔ پھر بیج چھڑک کر اُسے زمین میں دفن کر دیتا ہے۔ دن پر دن گزرتے ہیں اور اس شدید محنت کا کوئی نتیجہ اس کے سامنے نہیں آتا۔ مگر وہ پوری امید کے ساتھ اسے پانی دیتا ہے حتیٰ کہ مہینوں کی عرق ریزی کا نتیجہ ایک حقیر کونپل کی شکل میں اسکے سامنے آتا ہے۔

کسان کا اصل مقصد اور منتہائے نظر ابھی بہت دور ہوتا ہے مگر وہ گھبراتا نہیں، محنت سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔ برابر اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ یہ مدت مہینوں کی ہوتی ہے جس میں یہ کونپلیں اپنے طبعی ارتقاء کے مدارج طے کرتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ درجہ آجاتا ہے جس میں کسان کے دفن کیے ہوئے دانے خوشہ ہائے گندم بن کر پورے قد سے زمین پر لہلہانے لگتے ہیں۔ کسان کو اب بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا مگر وہ پُر امید رہتا ہے۔ صبر سے حصول مقصد کے قدرتی وقت کا انتظار کرتا ہے۔ اس طرح کچھ اور دن گزر جاتے ہیں، تب کہیں جا کر بالیاں پکتی ہیں اور غلہ کسان کے گھر میں پہنچتا ہے۔

یہ ہے عمل اور اس کے نتائج کا قانون! اگر ہماری نفسیاتی کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ عمل کی ابتدا کے ساتھ ہی ساتھ عمل کے نتائج چاہتے ہیں، لیکن جب غور و فکر کے نتیجہ میں دیکھتے ہیں کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ جس دور تک کا عملی پروگرام ہم پہلے وہلہ میں بناتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ اس پروگرام کے خاتمہ تک بھی بس عمل ہی عمل ہے کوئی خاص نتیجہ نمایاں نہیں ہو سکے گا، تو ہمت چھوٹ جاتی ہے اور سارا جوش و ولولہ سرد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عمل اور نتائج کا سارا سلسلہ پہلے ہی وہلہ میں ہماری نظر میں آجائے کہ ابتدا سے انتہا تک یہ یہ قدم ہم اٹھائیں گے اور اس طرح یہ نتیجہ اس عمل سے نکلتا چلا آئے گا۔ حالانکہ یہ سلسلہ قدرتی مقدمات و نتائج کا نہیں بلکہ عملی مراحل اور محسوس نتائج کا ہے۔ اور کسی عملی نظام میں طبعاً یہ نہیں ہو سکتا کہ ابتداء سے انتہا تک پہلی نظر میں ہمارے سامنے آجائیں۔ عملی جدوجہد کے مراحل میں محض نظر ایک حد تک ہی کام کرتی ہے۔ باقی عملی جدوجہد ہی سے آگے کے راستے فکر و نظر پر کھلتے اور اگلے مراحل کے نقشے طے ہوتے ہیں۔ تو جب ہم سارے عملی مراحل کے نقشے آج طے نہیں کر سکتے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم عمل اور نتائج کا سارا سلسلہ تصور میں لا کر دیکھ لیں کہ یہ یہ کام اس اس طرح ہوتا چلا جائے گا۔ اور اس طرح سب کچھ دیکھ لینے کے بعد ہم راہ عمل میں قدم اٹھائیں۔

اگر ہمیں عمل کے لیے اس کا انتظار ہے کہ عمل کے سارے مراحل تا نتائج پہلے عالم تصور میں ہم دیکھ لیں تو گویا ہم اس طرح کی ایک انہونی شرط لگا رہے ہیں جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا تھا کہ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (ہم تم پر جب ایمان لائیں گے جب اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں)۔

ہم آج قرآن میں بنی اسرائیل کا یہ مطالبہ پڑھتے ہیں تو ان کی حماقت پر ہنسی آتی ہے مگر ہم خود

قریب قریب اسی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ بارہ برس کے اس طویل عرصہ سے فکرمندی کے باوجود عمل سے دوری کا جو ہمارا حال ہے وہ دراصل اسی نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ عمل کے میدان میں گامزن ہونے کے لیے ہم جو شرط ذہن میں لیے ہوئے ہیں وہ دراصل اتنی ہی غلط ہے جتنی ایمان کے لیے بنی اسرائیل کی شرط تھی۔ بنی اسرائیل کے اس طرح کے رویّہ نے انھیں کتنا نقصان پہنچایا، اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں، اور ہمارا یہ رویّہ جو نقصان ہمیں پہنچائے گا، وہ اگر ابتک ہم پر مخفی ہے تو آئندہ یقیناً مخفی نہ رہ سکے گا۔

اس سب کے بعد ہمیں کہنا یہ ہے کہ تصورات اور ذہنی فکرمندی کے چکر سے نکل کر اب ہمیں عمل کی راہ اختیار کرنی چاہیے، ورنہ دن گزرتے چلے جائیں گے اور ہمارے مسائل "روز اوّل" ہی میں رہیں گے۔ بلکہ تدریجی طور پر ان کا حل مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا۔ مختلف انسانوں کی مختلف طبعی مناسبتیں ہوتی ہیں کسی کو کسی کام سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کسی کو کسی کام سے۔ ہمارے مسائل متعدد ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ بچوں کی دینی تعلیم کا ہے۔ دوسرا مسئلہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا ہے جس کی کئی شاخیں ہیں۔ اس طرح کے کئی ایک بڑے بڑے مسئلے ہیں۔ ہمیں اپنی طبعی مناسبتوں کے لحاظ سے ان مسائل میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینا چاہیے اور پھر اس کے لیے ابتدائی درجہ کا کوئی پروگرام سوچ کر بسم اللہ کر دینی چاہیے۔ یہ انتظار کبھی صحیح نہیں ہے کہ ہر کام آل انڈیا پیمانہ پر ہی شروع ہو۔ ہم میں سے بہت سے باصلاحیت اور فکرمند لوگوں کا بہت سا وقت اس انتظار میں بھی ضائع ہوا ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم "آل انڈیا" پیمانہ کو چھوڑ کر محدود پیمانوں پر فی الحال اکتفا کریں۔ بلا انتظار مقامی طور پر کام شروع کر دیے جائیں۔ انہی مقامی کاموں میں سے جس جگہ کے کام میں ابھرنے کی صلاحیت ہوگی وہ نمونہ بن کر ابھر جائے گا اور رفتہ رفتہ پورے ملک کے لیے مشعلِ راہ بن جائے گا اس ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ جلیں گے۔ اور خدا نے چاہا تو پورے ملک کے مسلمانوں کا جمود ٹوٹ جائے گا۔

ماضی میں اس کی کئی ایک مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک مثال دارالعلوم دیوبند کی لے لیجیے۔ یہ ادارہ جو پورے ملک کے لیے دینی رہنما بنا اور قصبے قصبے، قریے قریے اس کی لَو سے چراغ جل اٹھے۔

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معارف الحدیث

[اللہ کی توفیق سے معارف الحدیث کی تیسری جلد "کتاب العبادات" زیر تالیف ہے ـــــ چونکہ بہت سی عبادتوں کے لیے طہارت لازمی یا تکمیلی شرط ہے اسلئے حدیث کی اُن کتابوں میں جو مضامین اور ابواب پر مرتب ہوتی ہیں عبادات سے متعلق حدیثوں سے پہلے طہارت سے متعلق حدیثیں درج کرنے کا دستور ہے۔ اس ناچیز نے بھی اس تیسری جلد میں اس دستور کی پیروی کی ہے ـــــ آج پہلی بار اس کے بالکل ابتدائی چند صفحات ناظرین الفرقان کے لیے یہاں دیے جا رہے ہیں ـــــ یہ سلسلہ ان شاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا ـــــ]

طہارت و پاکیزگی کی حقیقت اور دین میں اس کا مقام

اسلام میں طہارت و پاکیزگی کی حیثیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ نماز، تلاوتِ قرآن اور طوافِ کعبہ جیسی عبادات کے لیے لازمی شرط ہے بلکہ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بجائے خود بھی دین کا ایک اہم شعبہ اور بذاتِ خود بھی مطلوب ہے۔ قرآن مجید کی آیت "اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ۔" (اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور پاک وصاف رہنے والے اپنے بندوں کو محبوب رکھتا ہے)

اور قبا میں رہنے والے اہلِ ایمان کی تعریف میں قرآن مجید کا ارشاد "فِیْہِ رِجَالٌ

سلہ ۔ بقرہ ع ۲۸ -

يُحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ[1] (اس میں ہمارے ایسے بندے ہیں جو بڑے پاکیزگی پسند ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب پاک وصاف رہنے والے بندوں سے محبت کرتا ہے) ـــــ صرف ان ہی دو آیتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں طہارت و پاکیزگی کی بجائے خود کتنی اہمیت ہے۔ اسی طرح آگے پہلے ہی نمبر پہ صحیح مسلم کی جو حدیث درج کی جا رہی ہے اُس کے پہلے فقرے " اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ " کا گویا لفظی ترجمہ ہی یہ ہے کہ طہارت و پاکیزگی اسلام کا صرف ایک حکم ہی نہیں ہے بلکہ وہ دین و ایمان کا اہم جسزو ہے ـــــ

ہمارے استاذ الاساتذہ اور شیخ المشائخ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی ایک نفیس تحقیق یہاں قابل ذکر ہے، اپنی بےنظیر کتاب " حجۃ اللہ البالغۃ " میں فرماتے ہیں کہ

" اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے خاص فضل سے یہ حقیقت سمجھا دی ہے کہ فلاح و سعادت کی جس شاہراہ کی طرف دعوت دینے کے لیے انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی (جس کا نام شریعت ہے) اگرچہ اس کے بہت سے ابواب ہیں اور ہر باب کے تحت سیکڑوں ہزاروں احکام ہیں۔ لیکن اپنی اس بےپناہ کثرت کے باوجود وہ سب بس ان چار اصولی عنوانوں کے تحت آ جاتے ہیں۔ طہارت، اخبات، سماحت، عدالت۔[2]

پھر شاہ صاحبؒ نے ان میں سے ہر ایک کی حقیقت بیان کی ہے جس کے مطالعہ کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ بلاشبہ ساری شریعت بس ان ہی چار اصول میں منقسم ہے۔

یہاں ہم شاہ صاحب کے کلام کے صرف اس حصہ کا خلاصہ درج کرتے ہیں جس میں انھوں نے طہارت کی حقیقت بیان فرمائی ہے۔ ـــــ فرماتے ہیں

ایک سلیم الفطرت اور صحیح المزاج انسان جس کا قلب بہیمیت کے سفلی تقاضوں کے

---

[1] توبہ ع ۱۳۔ [2] باب الاصول التی یرجع الیہا تحصیل الطریقۃ الثانیہ۔ ملخصاً

مغلوب اور اُن میں مشغول نہ ہو، جب وہ کسی نجاست سے آلودہ ہو جاتا ہو، یا اس کو پیشاب یا پاخانہ کا سخت تقاضا ہوتا ہو یا وہ جماع وغیرہ سے فارغ ہوا ہوتا ہو تو وہ اپنے نفس میں ایک خاص قسم کا انقباض و تکدر اور گرانی و بے لطفی اور اپنی طبیعت میں سخت ظلمت کی ایک کیفیت محسوس کرتا ہو پھر جب وہ اس حالت سے نکل جاتا ہو مثلاً پیشاب یا پاخانہ کا جو سخت تقاضا تھا اس سے وہ فارغ ہو جاتا ہو اور اچھی طرح استنجا و طہارت کر لیتا ہو، یا اگر وہ جماع سے فارغ ہوا تھا تو غسل کر لیتا ہو اور اچھے صاف ستھرے کپڑے پہن لیتا ہو اور خوشبو لگا لیتا ہو تو نفس کے انقباض و تکدر اور طبیعت کی ظلمت کی وہ کیفیت جاتی رہتی ہو اور اس کے بجائے اپنی طبیعت میں وہ ایک انشراح و انبساط اور سرور و فرحت کی کیفیت محسوس کرتا ہو۔

—— پس دراصل پہلی کیفیت اور حالت کا نام "حدث" (ناپاکی) اور دوسری کا نام "طہارت" (پاکی و پاکیزگی) ہے۔ اور انسانوں میں سے جن کی فطرت سلیم اور جن کا وجدان صحیح ہو وہ ان دونوں حالتوں اور کیفیتوں کے فرق کو واضح طور سے محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنی طبیعت و فطرت کے تقاضے سے "حدث" کی حالت کو ناپسند اور دوسری کو (یعنی "طہارت" کی حالت کو) پسند کرتے ہیں

اور نفس انسانی کی یہ طہارت کی حالت ملاء اعلیٰ یعنی ملٰئکۃ اللہ کی حالت سے بہت مشابہت و مناسبت رکھتی ہو۔ کیونکہ وہ دائمی طور پر بھی آلودگیوں سے پاک صاف اور اپنی نورانی کیفیات سے شاداں و فرحاں رہتے ہیں۔ اور اسی لیے حسب امکان طہارت و پاکیزگی کا اہتمام و دوام انسانی روح کو ملکوتی کمالات حاصل کرنے اور الہامات و منامات کے ذریعہ ملاء اعلیٰ سے استفادہ کرنے کے قابل بنا دیتا ہو —— اور اس کے برعکس جب آدمی حدث اور ناپاکی کی حالت میں دو چار رہتا ہے تو اس کو شیاطین سے ایک مناسبت و مشابہت حاصل ہو جاتی ہو اور شیطانی وساوس کی قبولیت کی ایک خاص استعداد اور صلاحیت اس میں پیدا ہو جاتی ہو۔ اور اس کی روح کو ظلمت گھیر لیتی ہے"

حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۳۸ ج ۱

شاہ صاحبؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ طہارت اور حدث در اصل انسانی روح اور طبیعت کی مذکورۂ بالا دو حالتوں کا نام ہے اور ہم جن چیزوں کو حدث یا ناپاکی اور طہارت یا پاکیزگی کہتے ہیں وہ در اصل ان کے اسباب و موجبات ہیں اور شریعت ان ہی اسباب پر لفظ جاری کرتی اور انہی سے بحث کرتی ہے۔

امید ہے کہ طہارت کی حقیقت اور روح انسانی کے لیے اس کی ضرورت و اہمیت سمجھنے کے لیے شاہ صاحب کا یہ کلام انشاءاللہ کافی ہوگا۔ نیز اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ طہارت و پاکیزگی شریعت کا پورا چوتھائی (¼) حصہ ہے۔

پھر اسی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کے ایک دوسرے مقام پرؒ جہاں طہارت کے احکام اور اُن کے اسرار ہی کا بیان ہے فرماتے ہیں۔

> طہارت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک حدث سے طہارت۔ (یعنی جن حالتوں میں غسل یا وضو واجب یا مستحب ہے۔ اُن حالتوں میں غسل یا وضو کرکے شرعی طہارت و پاکیزگی حاصل کرنا) دوسرے ظاہری نجاست اور پلیدی سے جسم یا اپنے کپڑوں کو یا اپنی جگہ کو پاک کرنا۔
>
> تیسرے جسم کے مختلف حصوں میں جو گندگیاں اور میل کچیل پیدا ہوتا رہتا ہے اس کی صفائی کرنا (جیسے دانتوں کی صفائی، ناک کے نتھنوں کی صفائی، ناخن اور زیر ناف بالوں کی صفائی۔)

آگے طہارت کے متعلق جو حدیثیں درج ہوں گی اُن میں سے بعض کا تعلق مطلق طہارت سے ہوگا۔ جو ان تینوں قسموں پر حاوی ہے۔ اور بعض کا تعلق کسی ایک خاص قسم سے ہوگا۔۔ اس تمہیدی بیان کے بعد اب طہارت سے متعلق حدیثیں پڑھیے۔

طہارت جزوِ ایمان ہے :۔

(۱) عَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ

لہ حجۃ اللہ البالغہ، ابواب الطہارۃ صفحہ $\frac{۱۷۳}{۱۷}$ -

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَاُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَاٰنِ اَوْ تَمْلَاُ مَا بَيْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ وَّالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ وَّالصَّبْرُ ضِيَاءٌ وَّالْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا ـــــ رواہ مسلم

(ترجمہ) ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا طہارت و پاکیزگی جزوِ ایمان ہے اور کلمۂ الحمد للہ میزانِ اعمال کو بھر دیتا ہے اور سبحان اللہ و الحمد للہ بھر دیتے ہیں آسمانوں کو اور زمین کو، اور نماز نور ہے اور صدقہ دلیل و برہان ہے اور صبر اجالا ہے اور قرآن یا تو حجت ہے تمہارے حق میں یا حجت ہے تمہارے خلاف۔ ہر آدمی صبح کرتا ہے پھر وہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے پھر یا تو اسے نجات دلا دیتا ہے یا اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) جیسا کہ ظاہر ہے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ ہے جس میں آپ نے دین کے بہت سے حقائق بیان فرمائے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا جزو اور پہلا فقرہ (اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ) طہارت سے متعلق ہے اور اسی کی وجہ سے یہ حدیث کتبِ حدیث میں "کتاب الطہارۃ" میں درج کی جاتی ہے ـــــ شَطْرٌ کے معروف معنی تو نصف اور آدھے کے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ کسی چیز کے جزو اور حصہ کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس عاجز کے نزدیک اس حدیث میں وہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس بنا پر اس فقرہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ طہارت و پاکیزگی دین و ایمان کا جزو اور اس کا ایک حصہ اور شعبہ ہے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کا جو کلام اوپر نقل ہوا ہے اس سے یہ حقیقت اتنی واضح اور روشن ہو چکی ہے جس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں۔

طہارت و پاکیزگی کی یہ اہمیت بیان فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کا اجر و ثواب اور اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے، تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنے کا مطلب اپنے اس یقین کا اظہار اور اس کی شہادت ادا کرنا ہوتا ہے کہ اللہ کی مقدس ذات ہر اس بات سے پاک اور برتر ہے جو اس کی شانِ الوہیت کے مناسب نہ ہو ـــــ اور تحمید

یعنی الحمد للہ کہنے کا مطلب اپنے اس یقین کا اظہار اور اس شہادت کا ادا کرنا ہوتا ہے کہ ساری خوبیاں اور سارے کمالات جن کی بنا پر کسی کی حمد و ثنا کی جاسکتی ہے صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ذات میں ہیں اور اسلیے ساری حمد و ستائش بس اسی کے لیے ہے۔ یہی تسبیح و حمد اللہ کی نورانی اور معصوم مخلوق فرشتوں کا خاص وظیفہ ہے۔ قرآن مجید میں خود فرشتوں کا یہ بیان خود اُن ہی کی زبانی نقل کیا گیا ہے۔ "نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ" (خداوندا ہم تیری حمد و تسبیح میں مصروف رہتے ہیں)

پس انسانوں کے لیے بھی بہترین وظیفہ اور مقدس ترین شغل یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اور سارے عالم کے خالق و پروردگار کی حمد و تسبیح کریں۔ —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی ترغیب کے لیے اس حدیث میں فرمایا ہے کہ ایک کلمہ سبحان اللہ میزانِ اعمال کو بھر دیتا ہے۔ اور اس سبحان اللہ کے ساتھ الحمد للہ بھی مل جائے تو ان دونوں کا نور زمین آسمان کی ساری فضاؤں کو معمور و منور کر دیتا ہے۔

سبحان اللہ سے میزانِ اعمال کا بھر جانا اور سبحان اللہ والحمد للہ سے آسمان و زمین کا معمور ہو جانا، یہ اُن حقائق میں سے ہے جن کے ادراک کا حاسہ یہاں ہم سب کو نہیں دیا گیا ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنے بعض خاص بندوں پر اس قسم کی حقیقتوں کو کبھی کبھی یہاں بھی منکشف فرما دیتا ہے، ہم عوام کا حصہ یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمائی ہوئی ان حقیقتوں پر ایمان لائیں، ان کا یقین کریں اور ان سے عمل کا فائدہ اٹھائیں۔
حمد و تسبیح کی اس فضیلت اور ترغیب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بارہ میں فرمایا ہے کہ "وہ نور ہے" اس دنیا میں نماز کی اس خصوصیت کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی برکت سے قلب میں ایک نور پیدا ہوتا ہے، جس کو اللہ کے وہ بندے خود محسوس کرتے ہیں جن کی نمازیں حقیقی نمازیں ہیں، پھر اسی نور کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی فواحش و منکرات سے بچا ہوا چلتا ہے۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔ "إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ۔" (بلاشبہ نماز میں یہ خاصیت ہے کہ وہ آدمی کو فواحش و منکرات سے روکتی ہے) اور آخرت کی منزلوں میں نماز کی اس نورانیت کا ظہور اس طرح ہوگا کہ وہاں

کی اندھیریوں میں نماز نور اور اُجالا بن کر نمازی کے ساتھ ہوگی۔ (نُوۡرُهُمۡ يَسۡعٰى بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَبِاَيۡمَانِهِمۡ)

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ دلیل و برہان ہے۔ اس دنیا میں صدقہ کے بُرہان ہونے کا مطلب بظاہر یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ صدقہ کرنے والا بندہ مومن مسلم ہے۔ اگر دل میں ایمان نہ ہو تو اپنی کمائی کا صدقہ کرنا آسان نہیں ہے۔ "گر نہ زر طلبی سخن درین است" ——— اور آخرت میں صدقہ کی اس خصوصیت کا ظہور اس طرح ہوگا کہ صدقہ کرنے والے مخلص بندے کے صدقہ کو اُس کے ایمان اور اس کی خدا پرستی کی دلیل اور نشانی مان کر اس کو انعامات سے نوازا جائے گا۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کے بارہ میں فرمایا ہے کہ وہ "ضیاء" یعنی روشنی اور اُجالا ہے۔ بعض حضرات نے نماز اور صدقہ کی مناسبت سے یہاں لفظ صبر سے روزہ مراد لیا ہے، لیکن ناچیز کے نزدیک راجح یہ ہے کہ صبر یہاں اپنے اصلی اور وسیع معنیٰ ہی میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن و حدیث کی زبان میں صبر کے اصل معنیٰ ہیں "اللہ کے حکم کے تحت نفس کی خواہشات کو دبانا اور اس راہ میں تلخیاں اور ناگواریاں برداشت کرتے رہنا" ——— اس لحاظ سے صبر گویا پوری دینی زندگی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس میں نماز، صدقہ، روزہ اور حج اور جہاد اور ان کے علاوہ اللہ کے لیے اور دین کے احکام کی پابندی میں ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کرنا اس کے مفہوم میں داخل ہے اور اسی کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ صبر "ضیاء" ہے قرآن مجید میں چاند کی روشنی کو "نور" اور سورج کی روشنی کو "ضیاء" فرمایا گیا ہے۔ (هُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِيَآءً وَّالۡقَمَرَ نُوۡرًا۔ (یونس ع ۱)) اس لحاظ سے صبر اور نماز سے پیدا ہونے والی روشنیوں میں وہ نسبت ہوگی جو سورج اور چاند میں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے بارہ میں فرمایا ہے کہ وہ یا تو تمہارے واسطے اور تمہارے حق میں دلیل و حجت ہے یا تمہارے خلاف!

مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام اور اسی کا ہدایت نامہ ہے۔ اب اگر تمہارا تعلق و رویہ اس کے ساتھ عظمت و احترام اور اتباع کا ہو گا جیسا کہ ایک صاحب ایمان کا ہونا چاہیے، تو وہ تمہارے لیے شاہد و دلیل بنے گا، اور اگر تمہارا رویہ اس کے برخلاف ہو گا تو پھر اس کی شہادت تمہارے خلاف ہوگی۔

ان سب تنبیہات و ترغیبات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس دنیا کا ہر انسان خواہ وہ کسی حال اور کسی شغل میں زندگی گذار رہا ہو وہ روزانہ اپنے نفس اور اپنی جان کا سودا ضرور کرتا ہے، پھر یا تو وہ اس کو نجات دلانے والا ہے یا ہلاک کرنے والا ہے — مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی ایک مسلسل تجارت ہے، اگر وہ اللہ کی بندگی اور رضا طلبی والی زندگی گذار رہا ہے تو اپنی ذات کے لیے بڑی اچھی کمائی کر رہا ہے اور اس کی نجات کا سامان فراہم کر رہا ہے اور اگر اس کے برعکس وہ نفس پرستی اور خدا فراموشی کی زندگی گذار رہا ہے تو وہ اپنی تباہی اور بربادی کما رہا ہے۔ اور اپنی دوزخ تیار کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو ان حقیقتوں کا یقین نصیب فرمائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ترغیبات و تنبیہات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

تجلیاتِ مجدد الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

(ترجمہ و تلخیص از مولانا نسیم احمد فریدی امروہی)

مکتوب (۱۴۴) سیادت پناہ شیخ فرید بخاریؒ[۱] کے نام۔

فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

تصدیقِ شریعتِ محمدی کی اہمیت اور ترغیبِ سنت کے بیان میں

مرحمت نامۂ گرامی عزیز ترین زمانے میں آیا اس کے مطالعے سے مشرف ہوا، اللہ کا شکر ہے کہ فقر محمدیؐ کی میراث آپ کو حاصل ہے۔ درویشوں سے محبت اور ان سے تعلق رکھنا اسی کا نتیجہ ہے ——— سمجھ میں نہیں آتا کہ گرامی نامے کے جواب میں یہ بے سروسامان کوتاہ عمل کیا لکھے، بجز اسکے کہ چند ماثور و منقول فقرے آپکے جد بزرگوار خیر العرب والعجم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و محامد میں رقم کرے اور اس سعادت نامے کو اپنے لیے وسیلۂ نجات دوی بنائے ———

---

[۱] شیخ فرید بخاریؒ ——— آپ کا نسب دو واسطوں سے حضرت سید جلال الدین اعظم حسینی بخاریؒ تک پہونچکر تائیس واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔ (ماخوذ از نسب نامہ سادات بخارا قلمی کتب خانہ دار العلوم ندوہ لکھنؤ)۔

حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے زمانۂ قیام لاہور میں ان کے اخراجات کا ظاہری تکفل شیخ فرید بخاری نے کیا ——— (جامع السلاسل قلمی کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس توصیف و منقبت کی برکت سے خود میرا کلام قابل تعریف بن جائے گا۔

جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے :-

ما اِن مدحتُ محمّداً بمقالتی

لکن مدحتُ مقالتی بمحمّدٍ

(یعنی میں اپنے کلام سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح نہیں کرتا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے درحقیقت اپنے کلام کی تعریف کرتا ہوں ۔)

اب منقبت رسول اکرمؐ لکھتا ہوں ـــــــ اللہ تعالیٰ مجھے لغزش سے محفوظ رکھے اور نیک توفیق عطا فرمائے۔

بیشک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام اولادِ آدم کے سردار ہیں اور قیامت میں تمام

(بقیہ حاشیہ ص۱۳) مکتوبات امام ربانی میں کئی جگہ اشارات ملتے ہیں کہ حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ کی خانقاہ دہلی کے بھی اخراجات اور طالبین و مقیمین کی نگہداشت کا شیخ فرید بخاری سے تعلق تھا ـــــــ

علامہ حکیم سید عبد الحیؒ صاحب حسنی رائے بریلویؒ نے شیخ فرید کے جو حالات تحریر فرمائے ہیں، ان میں سے اکثر حصّے کا ترجمہ بطور خلاصہ حسب ذیل ہے :-

نواب فرید مرتضیٰ خاں ـــ اپنے زمانہ میں سیاست، تدبر، اور سخاوت و کرم میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ اہل فضائل سے محبت رکھتے تھے اور اعلیٰ امور کے انجام دینے کی طرف میلان تھا ـــ اکبر بادشاہ کے دربار میں درجۂ امارت پر پہونچے اور ترقی کرکے میر بخشیگری کا عہدہ پایا ـــ جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے ان کے منصب میں اضافہ کیا۔ صاحب السیف والقلم کا خطاب دیا۔ پھر مرتضیٰ خاں کے لقب سے ملقب کیا ـــ گجرات کا حاکم بنایا وہاں چار سال حکومت کی پھر پنجاب کا حاکم بنایا وہاں مدت العمر حاکم رہے ـــــــ

شیخ فرید بخاری نے شجاعت و سخاوت کو اس طرح جمع کیا تھا کہ اس وقت ان کا اس جامعیت میں کوئی مساوی نہ تھا، خوافی نے مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ ان کے دربار کا سائل کبھی نامراد نہیں گیا۔ اپنے ہاتھ سے فقراء کو درہم و دینا تقسیم فرماتے تھے اور بعض اوقات اپنی قبا، چادر اور جو کچھ پاس ہوتا سب دیدیتے تھے ـــــ ایک مرتبہ ایک سائل سات دفعہ ان کے پاس آیا اور ہر دفعہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انبیاء کرام کے مقابلے میں آپؐ کے متبعین زیادہ تعداد میں ہوں گے ——— آپ اللہ کے نزدیک تمام اولین و آخرین میں مکرم و معظم ہیں ——— قیامت قائم ہونے پر سب سے پہلے آپ ہی اپنے مرقد مبارک سے اٹھیں گے ——— آپ سب سے پہلے شفاعت کرنے والے ہونگے اور آپ کی شفاعت سب سے پہلے قبول کی جائے گی ——— سب سے پہلے آپ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور اللہ تعالیٰ اس کو آپ کے لیے کھولے گا ——— قیامت میں آپ لواء حمد کو اٹھائے ہوئے ہوں گے اور حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے علاوہ سب اس جھنڈے کے نیچے ہوں گے ——— خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہو" کہ ہم (میں او ربیری امت)

(بقیہ حاشیہ صـــــ) اس کو عطا فرمایا ——— بیواؤں، متوکلوں اور اہل حاجت کی یومیہ اور سالانہ ہر طریقے پر امداد کرتے تھے۔ وظائف فقراء کی حاضری اور غیر حاضری ہر دو صورتوں میں پہونچتے تھے ——— یتیموں کی کفالت اور پرورش اس طرح کرتے تھے جس طرح باپ پرورش کرتا ہو ——— یتیموں کے لیے معلمین مقرر کیے تھے جب یتیم بچے شیخ فرید کی گود میں کھیلتے تھے تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ گجرات میں کئی عمارتیں ان کی یادگار ہیں ان میں سے احمد آباد میں ایک جامع مسجد ہے جو شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی کے مقبرے کے پاس ہے اور ایک محلہ ہے جو بخاری محلہ کے نام سے موسوم ہے ——— دہلی کے قریب فرید آباد ان ہی کا بسایا ہوا ہے اس میں بڑی بڑی عماتیں بنوائی تھیں اور سرسبز و شاداب باغات لگوائے تھے ——— لاہور میں بھی ان کا آباد کیا ہوا ایک محلہ ہے اور ایک حمام ——— علاوہ ازیں بے شمار سرائیں مختلف شہروں میں بنوائی تھیں ——— ان کے دسترخوان پر روزانہ پندرہ سو آدمی کھانا کھاتے تھے ——— علاوہ ازیں اپنے سامنے غریبوں کو راشن تقسیم کراتے اور اُن کے شور و غل سے تنگدل نہ ہوتے تھے۔ اور یہ جو کچھ لکھا گیا ان کے فضائل کثیرہ میں سے بہت تھوڑا ہے۔ اگر تفصیل درکار ہو تو ماثر الامراء کا مطالعہ کیا جائے۔

نزہۃ الخواطر جلد خامس ص۲۰۱، ۲۰۲

کتب تاریخ و تذکرہ میں، شیخ فرید، شیخ فرید دہلوی اور شیخ فرید بخاری تینوں طرح سے مشہور رہا۔ اکبرنامہ میں "شیخ فرید بخشی بیگی" بھی ہے ——— حضرت مجدد الف ثانیؒ کے متعدد مکتوبات آپ کے نام ہیں اور سب اہم ہیں۔

(فریدی)

ظہور کے لحاظ سے آخر میں ہیں لیکن قیامت کے دن آگے ہوں گے، یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں کہتا (بلکہ تحدیث نعمت کے طور پر اللہ تعالیٰ کے انعام کا اظہار کرتا ہوں) ــــــ میں اللہ کا حبیب ہوں، میں مرسلین و انبیا، کا قائد ہوں اور یہ بات بھی فخراً نہیں کہہ رہا ــــــ

میں سلسلۂ انبیاء کا ختم کرنے والا آخری نبی ہوں ــ اس پر بھی فخر نہیں ــــــ میں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ہوں ــــــ اللہ نے انسانی مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے ان سب سے بہتر پیدا کیا پھر اس مخلوق کو دو حصوں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اُن میں سے بہتر میں پیدا کیا، پھر قبائل بنائے تو بہترین قبیلے میں مجھے پیدا کیا پھر اس قبیلے کی شاخیں بنائیں تو ان میں سے مجھے بہترین شاخ میں پیدا کیا۔ پس از روئے نفس اور بنظر قبیلہ و بیت میں سب میں بہتر ہوں ــــــ (یہ مجھ پر اللہ کا انعام ہے) ــــــ قیامت میں سب سے پہلے قبر سے برآمد ہونے والا میں ہی ہوں گا ــــــ جب لوگ درگاہ خداوندی میں آئیں گے تو میں اُن کا قائد ہوں گا ــــــ جب وہ کلام نہ کر سکیں گے میں کلام کرنے والا ہوں گا اور جس وقت تمام لوگ میدان محشر میں پریشان و محبوس کھڑے ہوں گے میں ان کی شفاعت (سفارش) کروں گا جب وہ ناامید ہو جائیں گے میں ان کو بشارت دینے والا ہوں گا ــــــ اس روز کرامت و بزرگی اور کلید ہائے جنت میرے ہاتھ میں ہوں گی ــــــ ثناء حق کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا ــــــ نزد خدا میں فرزندانِ آدم میں گرامی ترین ہوں ....

اور جب قیامت کا دن ہوگا تو میں امام انبیاء، خطیب انبیاء اور صاحبِ شفاعت ہوں گا اور ان سب خصوصیات پر مجھے کچھ بھی فخر نہیں ہے۔" (بلکہ یہ صرف اظہارِ نعمت کے لیے کہہ رہا ہوں)

(در اصل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باعث تخلیق عالم ہیں آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا اور نہ اللہ تعالیٰ (مخلوق پیدا کر کے) اپنی ربوبیت کا اظہار کرتا ــــــ آپ اس وقت نبی تھے جب آدم علیہ السلام کا پتلا بھی تیار نہیں ہوا تھا ــــــ

چہ باک از موجِ بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں
چہ غم دیوارِ اُمت را کہ دارد چوں تو پشتیباں

ایسے عظیم الشان پیغمبرؐ کی تصدیق کرنے والے یقیناً خیر الامم ہونے چاہئیں ــــــ چنانچہ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (الآیہ) (تم بہترین امت ہو اے تصدیق کنندگانِ مصطفیٰ!

جس کو لوگوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے) کا امتیاز اُن کے لیے "نقدِ وقت" ہے ——
اس کے مقابلے میں آنحضرتؐ کی تکذیب کرنے والے (ظاہر ہے) بدترین بنی آدم ہیں —— آیہ
اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا —— (منکر بدو سخت ترین ہیں کفر اور نفاق میں) ایسے
لوگوں کی نشاندہی کر رہی ہے —— دیکھا چاہئیے، کس خوش نصیب کو اتباعِ سنت
کی دولت سے نوازتے ہیں اور متابعتِ شریعت سے سرفراز کرتے ہیں —— اس
(پُر آشوب) زمانے میں کیے ہوئے اس "عمل قلیل" کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین
کی تصدیق کے ساتھ انجام دیا جائے "عمل کثیر" کے درجے میں لکھا جائے گا ——

اصحاب کہف نے جو اعلیٰ درجات حاصل کیے وہ صرف ایک نیکی کی بنا پر ہی تو حاصل کیے
تھے (جو بر وقت ہوئی تھی) اور وہ نیکی نورِ ایمان و یقین کے ساتھ ہجرت تھی، ایسے وقت میں
جبکہ معاندین و مخالفین حق کا غلبہ ہو رہا تھا —— مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ سپاہی اگر دشمنوں
کے غلبے کے زمانے میں (وفاداری کے ساتھ) تھوڑی سی جدوجہد بھی کرتے ہیں تو وہ جدوجہد
بہت ہی نمایاں اور قابل قدر ہوتی ہے برخلاف زمانہ امن کے اس زمانے کی جدوجہد اور وفاداری
کا ویسا اعتبار نہیں ہوتا —— علاوہ ازیں چونکہ آنسرورؐ، محبوبِ رب العٰلمین ہیں اس
لیے آپ کے متبعین، متابعت کے طفیل میں محبوبیت کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں —— قاعدہ ہے
کہ محب، جس کسی کو اپنے محبوب کے اخلاق و شمائل پر دیکھتا ہے اس کو محبوب رکھتا ہے ——
مخالفین دین کی بدبختی کا بھی یہیں سے اندازہ کرنا چاہئیے۔

محمد عربی کآبروئے ہر دو سراست　　کسے کہ خاکِ درش نیست خاک بر سرِ او

اگر ہجرت ظاہری میسر نہیں تو "ہجرت باطنی" کو بہت زیادہ ملحوظ رکھا جائے کہ لوگوں
کے ساتھ بظاہر تو رہیں اور درحقیقت اُن کے ساتھ نہ ہوں (اُن کا غلط رنگ قبول نہ کریں)
اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے آبا کرام کے راستے پر ثابت قدم رکھے —— علیہم السلام الی یوم القیامہ۔

مکتوب (۴۵) سیادت پناہ شیخ فرید کے نام

(یہ مکتوب بعد وفات پیر و مرشد جامعیتِ انسان اور فضائل رمضان
کے بیان میں تحریر فرمایا ہے۔)

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے آبائے کرام کے طریقے پر ثابت قدم رکھے اور موجبات تاسف سے محفوظ رکھے ـــــــ "المرءُ مع من احبّ" (انسان اس کے ساتھ ہے جس سے محبت رکھتا ہے) اس حدیث کی رو سے دوستانِ خدا، خدا کے ساتھ ہیں ـــــــ البتہ بدن کا تعلق (دنیاوی زندگی) اس معیت و اتصال کے لیے کچھ مانع ہے ـــــــ اس پیکرِ جسمانی سے جدا ہونے کے بعد (بعدِ موت) تا مترقرب اندر قرب اور وصال در وصال حاصل ہوجاتا ہے۔ الموتُ جِسرٌ یوصِلُ الحبیبَ الی الحبیبِ (موت ایک پل ہے جو حبیب کو حبیب سے ملاتا ہے) ـــــــ یہ مقولہ اسی معنیٰ کا بیان ہے اور آیۂ ـــ مَنْ کَانَ یَرْجُو لِقَاءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَآتٍ ـــــــ (جو اللہ کی ملاقات کی توقع رکھتا ہے پس وعدۂ خدا البتہ آنے والا ہے) ـــــــ جو کہ دراصل مشتاقوں کے لیے پیغامِ تسلی ہے ـــــــ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے ـــــــ لیکن ہم پسماندگان کا حال بزرگوں کی صحبت و حضوری کی دولت حاصل ہوئے بغیر ـــــــ خراب و خستہ ہے ـــــــ رہا روحانیت اکابر سے فائدہ اٹھانے کا معاملہ ـــــــ وہ شرائط کے ساتھ مشروط ہے ہر کسی کو ان شرائط کے پورا کرنے کی طاقت نہیں ہے ـــــــ مگر اللہ کا شکر ہے کہ باوجود اس حادثۂ جانکاہ (وفاتِ حضرت خواجہ باقی باللہؒ) کے ان فقرائے بے سروپا کے ایک مربی و معین (ظاہری اسباب کے لحاظ سے) سرورِ دین و دنیا صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے (شیخ فرید) موجود ہیں جو اس سلسلۂ نقشبندیہ کی جمعیت کا سبب بن گئے ہیں ـــــــ بیشک یہ نسبتِ علیہ اس ملک میں بہت ہی نادر و اجنبی سی ہے اور اسکے حامل اس علاقے میں اقلِ قلیل ہیں مگر چونکہ وہ (بطریقِ اہل بیت حضرت صدیقِ اکبرؓ تک منتہی ہوکر) اہل بیت سے منسوب ہیں اس لیے اس کا مربی ظاہر بھی اہل بیت میں سے ہونا مناسب ہے .... آدمی جس طرح جمعیتِ باطن کا محتاج ہے جمعیتِ ظاہری کا بھی محتاج ہے بلکہ یہ دوسری احتیاج، مقدم ہے (ورنہ ـــ پراگندہ روزی پراگندہ دل) ـــــــ انسان تمام خلائق میں سب سے زیادہ محتاج واقع ہوا ہے اور یہ شدتِ احتیاج اُس کے اندر اسکی جامعیت کی وجہ سے آئی ہے ـــــــ جتنا اور سب مخلوق کو درکار ہے اتنا اس اکیلے انسان کو درکار ہے ـــ اور جس چیز کا وہ محتاج ہے اس سے تعلق بھی رکھتا

اس لحاظ سے اس کے تعلقات سب مخلوق سے زیادہ ہیں اور ہر تعلق، جناب قدس سے روگردانی کو مستلزم ہے — پس اس حیثیت سے جمیع خلائق میں بدترین بھی یہی انسان ہے — اور حال یہ ہے کہ اسکی جامعیت ہی جمیع خلائق سے افضلیت کا باعث بنی ہوئی ہے اس لحاظ سے اس کا آئینہ اتم و اکمل ہے، جو کچھ تمام مخلوقات کے آئینوں میں ظاہر ہوتا ہے اس ایک آئینے میں وہ سب کچھ آسکتا ہے — لہذا ایک حیثیت سے انسان بہترین خلائق ہوا اور دوسری حیثیت سے بدترین موجودات ... اس میں شک نہیں کہ [illegible]

ان فقراء کی جمعیت ظاہری کے کفیل آپ ہیں اور جمعیت باطنی میں بھی [illegible] (بیٹا باپ کا آئینہ دار ہوتا ہے) کی رو سے امیدواری تمام ہے — چونکہ عنایت نامہ گرامی ماہ رمضان میں صادر ہوا ہے اس لیے دل میں آیا کہ رمضان المبارک کے کچھ فضائل بھی لکھ دیے جائیں — رمضان کا مہینہ ایک عظیم الشان مہینہ ہے — اس مہینے میں جو عبادات نافلہ از قسم نماز و ذکر و صدقہ ادا ہوتی ہیں وہ ثواب میں دوسرے ایام کے فرضوں کی برابر ہیں — اور اس ماہ میں ایک فرض ادا کرنا دوسرے مہینے کے ستر فرضوں کے مساوی ہوتا ہے — اس ماہ میں جو کسی روزہ دار کو افطار کراتا ہے اس کی گردن آتش دوزخ سے آزاد کر دی جاتی ہے — اور اس افطار کرانے والے کو اس روزہ دار کے اجر کے مثل عطا فرماتے ہیں بغیر اسکے کہ روزہ دار کے اجر میں کوئی نقصان واقع ہو — جو شخص اس ماہ مبارک میں اپنے نوکر و ملازم کے کاموں میں تخفیف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسکی بخشش فرماتا ہے اور دوزخ سے رہا کرتا ہے — ماہ رمضان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کو رہا فرما دیتے تھے اور جو کوئی جس شے کا سوال کرتا عطا فرماتے — جس شخص کو اس ماہ میں اعمال صالحہ کی توفیق ہو جاتی ہے تمام سال توفیق اسکے شامل حال رہتی ہے — اگر یہ مہینہ کوتاہی میں گذر گیا تو تمام سال [illegible] اس ماہ میں جمعیت قلب کی کوشش کرنا چاہیے اور اس ماہ کو غنیمت سمجھنا چاہیے ... اس ماہ میں دروازے بہشت کو کشادہ کیا جاتا ہے اور دروازے دوزخ [illegible] — شیاطین کو اس ماہ میں مقید کر دیا جاتا ہے — افطار میں بعد غروب جلدی کرنا اور سحری میں

تاخیر کرنا سنت ہے ــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں بہت اہتمام فرماتے تھے، شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ تاخیر سحری اور تعجیل افطار میں بندے کے عجز و احتیاج کا اظہار ہوتا ہے اور یہ امر مقام بندگی کے بہت مناسب ہے ــــ خرما سے افطار کرنا سنت ہے ــــ آنحضرت افطار کے وقت یہ دعا پڑھتے تھے ــــ ذَهَبَ الظَّمَاءُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى ــــ یعنی پیاس بجھ گئی، رگیں تر ہو گئیں اور اجر بھی اللہ نے چاہا تو ثابت و مقرر ہو گیا ــــ اداے تراویح اور ختم قرآن اس ماہ میں سنت موکدہ ہے۔ اس سے عمدہ نتائج پیدا ہوتے ہیں ــــ اللہ تعالےٰ ہم کو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں اِن باتوں کی توفیق دے......... حضرت قبلہ گاہی (حضرت خواجہ باقی باللہؒ) فرمایا کرتے تھے کہ "حقوق شیخ فرید ہم سب پر لازم ہیں (کیونکہ دراصل) اس جمعیت باطنی کے باعث وہی ہیں" ــــ اللہ تعالیٰ ہمیشہ توفیقِ اعمال حسنہ عنایت فرمائے ــــ بحرمةِ النبی وآلہ الامجاد علیہ وعلیہم الصلوات والتسلیمات ــــ

مکتوب (۱۴۶) سیادت پناہ شیخ فرید بخاری کے نام

اس بیان میں کہ وجود باری، توحید باری، رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام وہ احکام جو آنحضرتؐ اللہ کی طرف سے لے کر آئے سب کے سب بدیہی ہیں کسی نظر و دلیل کے محتاج نہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے آباء کرام کے راستے پر ثابت قدم رکھے ــــ وجود باری تعالیٰ اور ایسے ہی توحید باری بلکہ نبوت محمد رسول اللہؐ بھی بلکہ تمام وہ احکام جن کو آنحضرتؐ اللہ کی طرف سے لے کر آئے سب کے سب بدیہی ہیں ــــ اگر قدرت مدرکہ "آفات ردیہ" اور "امراض معنویہ" سے محفوظ ہے تو ان امور بالا کے اثبات کے لیے کسی فکر اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

نظر و فکر کی ضرورت تو اس وقت تک ہے جب تک علت و آفت کا وجود ہے ــــ مرض قلبی سے نجات ملنے کے بعد اور آنکھوں سے پردہ اٹھنے کے بعد یہ امور سب کے سب

ہا ہیں ـــــ مثال کے طور پر اس شخص کو پیش کیا جا سکتا ہے جس پر صفرا کا غلبہ ہے وہ جبتک
ی صفرا میں گرفتار ہے، قند و نبات کی شیرینی اسکے نزدیک محتاجِ دلیل ہے لیکن جوں ہی
سے نجات مل گئی اس کو کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی ...... یہ بات مسلّم ہو کہ استدلال
یدان بہت تنگ ہے اور دلیل کے راستے سے یقین حاصل ہونا بہت مشکل ہے ـــــ
ایمان یقینی حاصل کرنے کے لیے مرض قلبی کا دور کرنا لازمی ہے ـــــ صفرا کے ایک
ریض کے لیے، مرض صفرا کا دور کرنا ـــــ شیرینیٔ قند کا یقین حاصل کرنے کے لیے زیادہ
روری ہے بمقابلہ اسکے کہ شیرینیٔ قند کے یقین کے لیے دلیل قائم کرے ـــــ بھلا اس
لو دلیل کے ذریعے کس طرح یقین حاصل ہو گا اس کا ذائقہ تو مرض صفرا کی بنا پر قند و شکر کی
لخی کا حکم لگا رہا ہے ـــــ اسی طرح اس مسئلے کو جس کا ذکر کیا جا رہا ہے سمجھئے ـــــ
نفس امّارہ بالذات احکامِ شرعیہ کا منکر ہے پس ان احکام صادقہ کے یقین کو حاصل کرنا
باوجود انکار و جدال بہت ہی دشوار ہے ـــــ لہٰذا نفس کا تزکیہ ضرور ہوا ـــــ
یقین بغیر تزکیہ کے حاصل کرنا مشکل ہے ـــ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا
یعنی فلاح یاب اور کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور ٹوٹے میں رہا وہ جس نے
اس کو پستی میں ڈالا ـــــ پس ثابت ہوا کہ اس شریعت ظاہرہ و طاہرہ کا منکر ایسا ہی
ہے جیسا کہ حلاوتِ نبات و قند کا منکر ـــــ

خورشید نہ مجرم ار کسے بینا نیست

اگر کوئی نابینا ہے تو آفتاب کا کیا قصور؟ ـــــ سیر و سلوک، تزکیۂ نفس اور
تصفیۂ قلب سے مقصود آفاتِ معنویہ اور امراض قلبیہ کا ازالہ ہے تاکہ حقیقتِ ایمان حاصل
ہو جائے ــ آیت کریمہ ـــ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ (یعنی ان منافقین کے دلوں میں مرض
ہے) اس مرض قلبی کا پتہ دے رہی ہے ـــ آفات معنویہ کی موجودگی میں اگر ایمان
ہے بھی تو ظاہری ایمان ہے اور بس ـــ اس لیے کہ نفس امّارہ ایمان کے خلاف حکم لگا رہا
ہے ـــ اور اپنے کفر کی حقیقت پر اصرار کر رہا ہو ـــــ اس ایمان ظاہری اور
تصدیق صوری کی مثال ایسی ہے جیسا کہ صفرا والے کو حلاوتِ قند و نبات کا ظاہری

یقین ہوجائے درآنحالیکہ خود اُس کا ذوق و وجدان اس کے یقین کے خلاف گواہی نے رہا ہے ـــــ اُس کو تو شیرینی کا یقینِ حقیقی اسی وقت حاصل ہوگا جب مرضِ صفرا کی جڑ کٹ جائے گی ـــــ اسی طرح تزکیۂ نفس اور اطمینانِ نفس کے بعد حقیقتِ ایمان ظہور پذیر ہوتی ہے اور وجدانی بنتی ہے ـــــ ایسا ایمان زوال سے محفوظ رہتا ہے ـــ آیۃ ـــ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ـــ (آگاہ ہو بیشک اللہ کے دوستوں پر خوف وحزن نہیں ہوگا) ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہے ـــ اللہ تعالیٰ ہم کو ایسے ہی ایمانِ کامل سے مشرف فرمائے بحرمتہ النبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم

مکتوب (۴۷) سیادت پناہ شیخ فرید بخاری کے نام

عہد اکبری کی شکایت میں اور اس بارے میں کہ بادشاہت کے اس نئے دور (عہد جہانگیری) میں شریعت کی ترویج کی جدوجہد میں دیر نہ کیجائے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جادۂ آباء کرام پر ثابت قدم رکھے ـــــ بادشاہ کی مثال عالم کے اندر ایسی ہے جیسا کہ دل، بدن کے اندر ہے اگر دل صحیح ہے، بدن صحیح ہے اور دل فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہے ـــــ درستی بادشاہ دراصل درستی عالم ہے اور بادشاہ کا بگڑنا عالم کا بگڑنا ہے ـــــ آپ واقف ہیں کہ دورِ ماضی (عہد اکبری) میں اہل اسلام پر کیا کچھ گذری ہے ـــ اہل اسلام کی خرابی ابتدائے اسلام میں باوجود انتہائی کس مپرسی کے اس سے آگے نہ بڑھی تھی کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور غیر مسلم اپنے دین پر لکم دینکم ولی دین ـــــ سے یہ بات ظاہر ہے ـــــ مگر دورِ گذشتہ (عہد اکبری) میں مخالفین اسلام کھلم کھلا بطور غلبہ دار اسلام میں احکام کفر جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام کے اظہار سے عاجز تھے اگر اظہار کی جرأت کرتے تھے قتل ہوجاتے تھے ـــ واویلاہ، وامصیبتاہ واحسرتاہ، واحزناہ ـــــ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ محبوب رب العالمین ہیں ان کی تصدیق کرنے والے ذلیل وخوار تھے اور اُن کے منکر درجۂ عزت واعتبار پر فائز تھے ـــ مسلمان اپنے زخمی دلوں کے ساتھ غمگساری اسلام میں تھے اور معاندین مذاق اور تمسخر سے اُن کے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے ـــ آفتابِ ہدایت، ضلالت کے پردے میں چھپ گیا تھا

نورِ حق، باطل کے حجاب میں مکدر ہو گیا تھا ـــــ اس زمانے میں کہ جب مانع دولت اسلام کے زائل ہونے کی خوشخبری اور بادشاہ اسلام کے جلوس کا مژدہ ہر خاص و عام کے کان میں پہونچا ہے۔ اہل اسلام لازم جانتے ہیں کہ بادشاہ کے مدد و معاون ہوں اور ترویج شریعت اور تقویتِ ملت کی راہ دکھائیں ـــــ یہ امداد و تقویت خواہ زبان سے ہو یا ہاتھ سے ـــــ سب سے بڑی مدد مسائل شرعیہ کی وضاحت اور اظہارِ عقائد کلامیہ "بطورِ کتاب وسنت و اجماع" ہے۔ تاکہ کوئی بدعتی اور گمراہ درمیان میں آکر دین کا راستہ نہ لوٹ سکے اور کام نہ بگڑے ـــــ یہ امداد ان علماء حق کے ساتھ مخصوص ہے جو کہ آخرت کی طرف رُخ رکھتے ہیں ـــ ـــ علماء دنیا جو کہ اپنا نصب العین صرف دنیا کو بنائے ہوئے ہیں ان کی تو صحبت بھی زہر قاتل ہے، اور ان کا فساد، فساد متعدی ہے۔

عالم کہ کامرانی وتن پروری کند ـــ او خویشتن گم است کرا رہبری کند

زمانۂ گزشتہ میں جو مصیبت اہل اسلام کے سر پر آئی وہ ان علماء سوء کی نحوست ہی کا کرشمہ تھا بادشاہوں کو یہی علماء سوء راہ حق سے ہٹا دیتے ہیں ـــــ بہتّر فرقے جنھوں نے راہ ضلالت اختیار کی ان کے سربراہ اور سرغنہ یہی علماء سوء تھے ـــــ علماء سوء کے علاوہ جو بھی راہِ ضلالت پر چلا اس کا بگاڑ بہت کم دوسروں تک متعدی ہوا ہے۔ اس زمانے کے اکثر "جہلائے صوفی نما" بھی علماء سوء کے حکم میں ہیں ان کا بگاڑ بھی متعدی ہے ـــ اگر کوئی شخص باوجود ہر قسم کی مدد کی استطاعت وطاقت کے امداد دین میں کوتاہی کرے گا اور اس کوتاہی کے نتیجے میں کارخانۂ اسلام میں خلل واقع ہوگا تو وہ کوتاہی کرنے والا اللہ کے عتاب میں مبتلا ہوگا اس بنا پر یہ قلیل البضاعۃ بھی چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو دولتِ اسلام کے معاونین کی جماعت میں رکھے اور اس بارے میں کچھ ہاتھ پاؤں مارے ـــــ من کثّر سواد قوم فھو منھم (جو جس جماعت کی تعداد میں اضافہ کرے وہ اسی میں سے ہے) اس حدیث کی رو سے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ اس بے استطاعت کو بھی جماعت کرام (معاونین اسلام) میں داخل کر دیں ـــــ اپنی مثال اس بڑھیا کی سی سمجھتا ہوں جس نے ایک سوت کی انٹیا کے ذریعہ خود کو حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیا تھا ـــــ امید ہو کہ عنقریب انشاء اللہ العزیز آپ سے ملاقات کا

شرف حاصل کروں گا ـــــ آپ کی بلند مرتبہ سے امید ہے کہ جب کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے پوری طاقت دی ہے اور بادشاہ کا قرب نصیب فرمایا ہے تو خلوت و جلوت میں برابر ترویج شریعت محمدی کے سلسلہ میں کوشاں رہیں گے اور مسلمانوں کو ذلت و خواری اور پستی سے نکالیں

مکتوب (۴۸) بیادت دستگاہ شیخ فرید بخاری کے نام

(علماء و طلباء علوم دین کی قدر و منزلت میں)

اللہ تعالیٰ دشمنوں کے مقابلے میں آپ کی مدد کرے بحرمت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ـــ مرحمت نامہ گرامی جو فقیر کو بھیجا گیا تھا اس کے مطالعہ سے مشرف ہوا ـــ مولانا محمد قلیچ کے خط میں آپ نے لکھا تھا۔ "کچھ خرچ طالب علموں اور صوفیوں کے لئے بھیجا گیا" ـــــ

اس عبارت میں طالب علموں کی تقدیم، صوفیوں پر بہت زیبا معلوم ہوئی ـــ الظاہر عنوان الباطن (ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے) کے اعتبار سے امید ہے کہ آپ کے باطن میں بھی طلباء علم دین کی جماعت کی تقدیم رکھتی ہوگی۔ کوزے سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے۔

از کوزہ ہروں ہماں تراود کہ درو ست

طالب علموں کے مقدم رکھنے میں شریعت کی ترویج پوشیدہ ہے۔ حاملان شریعت یہی لوگ ہیں ـــ ملت مصطفویہ اسی جماعت کے ذریعے قائم ہے ـــ قیامت میں شریعت کے متعلق سوال کیا جائے گا تصوف کے متعلق نہیں ـــــ جنت کا داخلہ اور آتش دوزخ سے نجات، شریعت ہی کی پابندی سے وابستہ ہے ـــــ انبیاء علیہم السلام جو کہ بہترین کائنات ہیں انھوں نے شرائع کی دعوت دی ہے اور مدار نجات اسی پر ہے اور انبیاء کی بعثت کا مقصد بھی تبلیغ شرائع ہی ہے۔ پس سب سے بڑی نیکی، ترویج شریعت میں سعی کرنا اور اس کے احکام میں سے کسی حکم کا زندہ کرنا ہے بالخصوص ایسے زمانے میں کہ شعائر اسلام منہدم ہوگئے ہوں۔ ـــ راہ خدا میں کروڑوں روپیہ خرچ کرنا بھی مسائل شرعیہ میں سے کسی ایک مسئلہ کو رواج دینے کے برابر نہیں ہے۔ ـ ـ اس لئے کہ مسئلہ شرعی کے رواج دینے میں انبیاء کی اقتداء اور پیروی اور ان کے کار تبلیغ میں شارکت ہے ـــ ظاہر ہو کہ وہ مخلوقات میں بزرگ ترین ہیں اور کاملترین حسنات انھیں کے لیے ثابت و مسلم ہیں ـــ کروڑوں روپیہ

خرچ کرنا تو انبیاء کے علاوہ دوسروں کو بھی میسر ہوسکتا ہے ۔۔ علاوہ ازیں ادائیگی شریعت میں نفس کی پوری پوری مخالفت ہوتی ہے اسلئے کہ شریعت برخلاف نفس واقع ہوئی ہے۔ لیکن مال کے خرچ کرنے میں کبھی نفس، موافقت بھی کرلیتا ہے ۔۔۔۔۔ اِن تائید شریعت اور ترویج ملت کے لیے مال خرچ کرنا بہت بلند مرتبہ رکھتا ہے ایک حبیل (پیسہ) کو ترویج واشاعت دین کی نیت سے خرچ کرنا بغیر نیت کے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے برابر ہے ۔۔ وہ شخص جس سے بہت سوں کی نجات وابستہ ہو ظاہر ہے کہ اس شخص سے بہتر ہوگا جو اپنی نجات ہی کی فکر رکھتا ہو ۔۔۔۔۔ البتہ وہ صوفی جو " فنا وبقا " کے بعد اور سیر عن اللہ اور سیر باللہ کے مقام طے کرنے کے بعد عالم میں گشت لگائے اور دعوت خلق کی طرف متوجہ ہو کر مقام نبوت سے حصہ رکھتا ہو ۔۔۔۔ داخل مبلغان شریعت ہے اور وہ حکم علماء شریعت رکھتا ہے ۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم۔

(یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے)

مکتوب (۵۰) شیخ فرید بخاری کے نام۔

(مذمتِ دُنیا میں)

حق سبحانہ وتعالیٰ ماسوا کی غلامی سے آزادی عطا فرما کر بس اپنا ہی پابند بنالے۔ بحرمۃ سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔۔ دنیا بظاہر شیریں ہے، اور صورۃً تازگی رکھتی ہے لیکن فی الحقیقت ایک زہر ہے قاتل ۔۔۔۔ اور ایک متاع ہے باطل ۔۔۔ اور ایک گرفتاری ہے بے سود ۔۔۔۔ اس کا مقبول خوار ہے اور اس کا فریفتہ مجنون ۔۔۔ یہ سونے کے ورق سے لپٹی ہوئی نجاست کے مانند ہے اور ایسے زہر کی مثل ہے جس میں شکر آمیختہ ہو ۔۔۔۔ عاقل وہ ہے جو اس کھوٹی پونجی پر نہ ریجھے اور خراب مال میں گرفتار نہ ہو فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کرے کہ میرا مال عاقل زمانہ کو دیا جائے۔ تو ایسے شخص کو وہ مال دیا جائے جو دنیا کی طرف راغب نہ ہو اور یہ بے رغبتی اس کی انتہائی عقلمندی کی دلیل ہے ۔۔

بقیہ نگاہ اولیں

ابتدا میں ایک مقامی پیمانہ کی کوشش تھی۔ دیوبند کے ایک مکتب کی حیثیت سے اسکی ابتدا ہوئی تھی۔ اس ابتدا کی انتہا آج ہمارے سامنے ہے۔

بعض مقامات پر بعض مخلصین نے بنام خدا کام شروع کر دیے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ان کے کام کی اطلاع ہمیں پہنچے تو ان سے رابطہ قائم کریں۔ ان کے کام کے ڈھنگ کو دیکھیں۔ اور پھر ممکن ہو تو رابطہ رکھتے ہوئے ورنہ بغیر رابطہ رکھے ہوئے ہی ہم اپنے مقام پر کام کا آغاز کریں۔ ہر مخلصانہ کام خدا چاہتا ہے تو کسان کے عمل کی طرح اپنے نتیجہ پر پہنچ کر رہتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اخلاص قائم رہے، لگن ہو، اور اپنی جیسی پوری دانائی اور بینائی سے کام کیا جائے۔

کوئی دو ماہ ہوئے ایک معاصر نے الفرقان پر ایک صحافتی خیانت کا الزام لگایا تھا۔ بعض لوگ حقیقت حال سے واقف ہونے کے لیے ہم سے رجوع کر رہے ہیں۔ ایسے حضرات کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس الزام پر ہم نے اپنی گزارشات معاصر موصوف کو اسی وقت بھیج دی تھیں جب اس کا متعلقہ شمارہ شائع ہوا تھا۔ یہ گزارشات اپنے اختصار کی بنا پر معاصر کے ستمبر کے شمارہ میں شائع ہو سکتی تھیں مگر بعض وجوہ سے انھوں نے عذر کرتے ہوئے ستمبر کے بعد کی اشاعت میں شائع کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے جن حضرات کو اس سے زیادہ دلچسپی ہے وہ یا تو معاصر کے آنے والے شمارہ کا انتظار فرمائیں یا خط لکھ کر دریافت فرمائیں کہ وہ کب ہماری اس تحریر کو شائع کر رہا ہے۔

قسط سوم

حدیثِ پرویز

عتیق الرحمٰن سنبھلی

اب اصل نقطۂ بحث تو ہمارے سامنے صرف یہ رہ گیا ہے کہ کیا "تاریخ" (حدیث) یہ بتاتی ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلافتِ ابی بکرؓ کا فیصلہ بجائے مشورہ کے استبداد سے کام لیکر اور حسب و نسب کو معیار بنا کر کیا گیا؟ ــــــ یہ نقطہ اور اسکے متعلقات ہیں جن پر اب گفتگو ہونی ہے ــــــ لیکن پہلے ذرا ایک ضمنی اعتراض سے فارغ ہو لیجئے جو پرویز صاحب نے بطور "جملۂ معترضہ" "تاریخ" پر ایک بڑا کامیاب وار سمجھ کر چسپت فرمایا ہے، اور جس کا تعلق گفتگو کی اسی شق سے ہے جس پر ما قبل میں گفتگو ہوئی ہے، یعنی سقیفۂ بنی ساعدہ میں حضراتِ صحابہؓ کے باہمی نزاع کا انداز!۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں :-

"ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعے[1] میں، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی تھی تاریخ طبری ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اسی کتاب میں ... ... لکھا ہے کہ جب حضرت اسامہؓ کی امارتِ عسکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ میں اختلافِ[2] رائے ہوا تو ــــ ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے غصّے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انھوں نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی، اور کہا :- اے ابن الخطاب! اللہ تیری[3] ماں کا برا کرے کہ تم مر جاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہ صلعم نے اس پر فائز کیا ہے، تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اُسے علاحدہ کر دوں"

[1] تنازعے نہیں تنازع۔ [2] یہ واقعہ کی غلط تعبیر ہے حضرت عمرؓ نے صرف بعض حضرات کا پیغام حضرت ابوبکرؓ کو پہنچایا تھا۔
[3] یہ ترجمہ بالکل غلط ہے طبری کے الفاظ "ثکلتک امک وعدمتک" ہیں جس کا ترجمہ ہوتا ہے، تمہاری ماں تمہیں روئے اور معدوم پائے!۔ (ع)

یہ اپنے خیال میں پرویز صاحب نے تاریخ کا دبا ہوا پردہ فاش کیا ہے کہ لوگ پڑھتے ہی تاریخ پر یکلخت نفریں بھیجنے لگیں گے، مگر اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک یہ باتیں کتب حدیث کے حوالہ سے نہ پیش کی جائیں اس وقت تک ان کا اثر اس تاریخ پر مطلق نہیں پڑتا "جو دین بنالی گئی ہے"، اور اسی لئے اس اعتراض کا جواب ہمارے ذمّے نہیں، لیکن اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم پرویز صاحب کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ بالکل اسی طرح کا واقعہ قرآن میں ایک جگہ نہیں دو جگہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السّلام کے متعلق بیان ہوا ہے ـــ فرمایا گیا ہے :ـ

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِن بَعْدِي أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ -	اور جب لوٹ آیا موسیٰ اپنی قوم کی طرف غم و غصّہ میں بھرا ہوا، بولا کیا بُری نیابت کی تم نے میرے بعد، کیا کچھ جلدی پڑی تم کو اپنے رب کے عذاب کی ؟ اور ڈالدیں تختیاں (تورات کی) اور پکڑا سر اپنے بھائی کا کھینچتے ہوئے اس کو اپنی طرف ـ
(الاعراف ، ع ۱۸)	

یہاں صرف سر کے بال پکڑنے کا ذکر ہے، دوسری جگہ سے معلوم ہوتا ہے داڑھی بھی پکڑ لی تھی ـــ فرمایا :ـ

قَالَ يَا هَارُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۝ أَلَّا تَتَّبِعَنِ ۖ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي ۝ قَالَ يَا ابْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي ـ الآیۃ	کہا موسیٰ نے : کہ اے ہارون ! کس چیز نے روکا تم کو جب دیکھا تھا تم نے کہ یہ گمراہ ہوگئے، کہ تم نہ چلے آئے میرے پیچھے ؟ کیا تم نے نافرمانی کی میرے حکم کی، کہا ہارون نے کہ اے میرے ماں جائے ! نہ پکڑ میری داڑھی اور میرا سر
(طٰہٰ ، ع ۵)	

پرویز صاحب خیر سے قرآن کے علمبردار اور اسکے مفسّر و ترجمان بھی ہیں، تو یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کی یہ کھلی آیات اُن کی نظر سے مستور رہی ہوں گی، مگر اس کے باوجود یہ عجیب ماجرا ہے کہ جہاں ایک طرف انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ جو باتیں وہ خالص کتب تاریخ کے حوالہ سے پیش کر رہے ہیں، اُن کا الزام کتب حدیث کو کس طرح دے سکتے ہیں، وہاں یہ بھی نہیں سوچا کہ جو بات قرآن میں قابلِ اعتراض نہیں وہ تاریخ میں آکر کیسے قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے ـــ درحقیقت یہی وہ باتیں ہیں جو اس بدگمانی کا جواز پیدا کرتی ہیں کہ ان لوگوں کو حدیث کے

بارے میں دیانت داری کے ساتھ کوئی غلط فہمی نہیں ہے، بلکہ ایک سوچی سمجھی بات ہے جس کے ماتحت حدیث کو ہدف بنایا جارہا ہے، ورنہ بفرضِ غلط، تاریخی روایات کی بنیاد پر حدیث کے ذخیرے کو کوئی الزام دینا صحیح بھی ہو تب بھی یہ تو عجیب بات ہے کہ جو چیز قرآن میں باعثِ وحشت نہ ہو وہ حدیث میں باعثِ وحشت ہونے لگے۔

خیر اچھا ہوا کہ پرویز صاحب نے بزعم خود یہ زبردست وار کرکے، قرآن کی یہ آیات یاد دلادیں، قرآن کی یہ آیات جن میں حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا یہ واقعہ بلا کسی نکیر کے بیان ہوا ہے اس بات کی محکم دلیل ہیں کہ حق کے لئے غصہ میں ایسی باتوں کا ہو جانا قطعاً قابلِ نکیر بات نہیں ہے ـــــــ اور اسلئے اگر کسی حدیثی روایت میں بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق ایسے واقعات نظر آئیں تو ان کی بنیاد پر حدیث کو مطعون کرنے کی جرأت وہی شخص کرسکتا ہے جو (خاک بدہن گستاخ) قرآن پر بھی لب کشائی کو تیار ہو۔

اچھا اب آیئے، اصل نقطۂ بحث کو لیجئے، جہاں سے بات دراصل شروع کی گئی تھی، یعنی پرویز صاحب کا یہ اعتراض کہ "تاریخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا فیصلہ بجائے مشورہ کے استبداد سے کام لیکر اور حسب ونسب کو معیار بناکر کیا گیا۔ حالانکہ ایسا کرنا صحابہ رضی اللہ عنہم سے بعید تھا۔"

ہم ناظرین کو ایک بار پھر یہ یاد دلانے پر مجبور ہیں کہ پرویز صاحب کا اصل ہدف تو حدیث ہے (کیونکہ یہی وہ "تاریخ" ہے جسے "دین بنا لیا گیا ہے") لیکن جیسا کہ وہ کرتے آرہے ہیں، یہ اعتراض بھی انھوں نے حدیث کی کسی روایت کی بنیاد پر نہیں کیا ہے، بلکہ اُن تاریخی روایات کی بنیاد پر کیا ہے جنھیں ہرگز "دین" نہیں بنایا گیا ہے۔ چنانچہ اس اعتراض کے لئے وہ محمد حسین ہیکل کی کتاب "ابوبکر صدیقؓ" کے حوالہ سے (تاریخ طبری کی ایک روایت سے) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حسب ذیل تقریر پیش فرماتے ہیں، جو روایت کے بیان کے مطابق انصار کے جواب میں کی گئی تھی کہ

"... ... ... اللہ کی قسم! عرب تمھیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے نہ تھے، ہاں اگر امارت اُن لوگوں کے ہاتھ میں آئے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے تو انھیں کوئی اعتراض نہ ہوگا ... ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کرسکتا ہے، جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ ہیں، اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیرو کار گناہوں سے آلودہ، اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کیلئے تیار ہو۔"

یہ روایت ہے جس کو بنیاد بناکر حدیث کو مجروح کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، حالانکہ تاریخ کی اس روایت میں یکے بعد دیگرے دو راوی ایسے ہیں جن کی روایات محدّثین قطعًا قبول نہیں کرتے، اور یہ راوی ہیں ہشام[1] بن محمد کلبی اور ابو[2] مخنف، یہ دونوں راوی محدّثین کے یہاں کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیجئے، کہ :—

ہشام بن محمّد :—

قال احمد بن حنبل انّما کان صاحب سمرٍ ونسب ماظننت انّ احدًا یحدث عنه۔ وقال الدارقطنی وغیرہ متروك وقال ابن عساکر رافضی لیس بثقۃٍ وقال یحیٰی بن معین غیر ثقۃٍ ولیس عن مثله یروی الحدیث۔ (لسان المیزان لابن الحجرؒ جلد ۶ صفحہ ۱۹۶،۱۹۷ مطبوعہ حیدرآباد)۔

امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ "یہ شخص صرف ایک قصہ گو اور نسّاب تھا، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اس سے حدیث کی روایت کرتا ہوگا" دارقطنی وغیرہ کا قول ہے کہ "یہ متروک ہے" ابن عساکر کہتے ہیں کہ رافضی ہے قطعًا قابلِ اعتماد نہیں یحیٰی بن معین کہتے ہیں کہ غیر ثقہ ہے، اور اس جیسوں سے حدیث کی روایت نہیں کی جاتی ہے۔

ابو مخنف :—

لا یوثق به۔ ترکه ابوحاتم وغیرہ۔ وقال الدارقطنی ضعیف۔ وقال یحیٰی بن معین لیس بثقۃٍ۔ وقال مُرَّۃ لیس بشیءٍ و قال ابن عدی شیعیٌ محترقٌ صاحبُ اخبارھم۔ (ایضًا، ج ۴، ص ۴۹۲)—

اعتماد کے قابل نہیں ہے، ابوحاتم وغیرہ (ائمہ جرح وتعدیل) نے اس کو متروک قرار دیا ہے، دارقطنی کا قول ہے کہ "ضعیف ہے" یحیٰی بن معین کہتے ہیں کہ "لائقِ اعتماد نہیں ہے" مُرّۃ کا کہنا ہے کہ "کچھ نہیں" ابن عدی کہتے ہیں، کہ کٹّر شیعی، اور شیعوں کی اخبار کا راوی ہے

پس یہ کس درجہ بد دیانتی ہے کہ ایسے لوگوں کی روایات جنھیں محدّثین خود رَد کرتے ہیں محدّثین کے سر تھوپی جائیں یقینًا اس طرز کی روایات اِن شیعی راویوں نے اسی غرض سے وضع کی ہیں (جو پرویز صاحب کا بھی خیال ہے) کہ اس سے اہلِ سنت کے مقابلہ میں، حضرت علیؓ کے احق بالخلافۃ ہونے پر حجّت قائم کی جائے، لیکن یہ پرویز صاحب کی نری خوش فہمی ہے کہ "(حضرت عمرؓ کی) اس دلیل[1] کے بعد سنّی حضرات کا موقف اس قدر کمزور ہوجاتا ہے کہ اُن سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑسکتا" اِسلئے کہ حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ کسی ایسے ذریعہ سے ثابت ہی نہیں ہیں جو اہلِ سنّت پر حجّت ہوں۔

---

[1] یعنی جو دلیل انھوں نے اپنی مبیّنہ تقریر میں قریش کی خلافت کیلئے دی تھی۔ (ع)

حضرت عمرؓ کی یہ تقریر پیش کرنے کے بعد "تاریخ" (حدیث) کے خلاف اپنے دعوے کی دلیل میں پرویز صاحب یوں ایک قیمتی اضافہ فرماتے ہیں :-

"لیکن تاریخ یہیں تک نہیں رہتی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے، اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا، تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے، رسول اللہؐ نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ الائمۃ من قریش خلافت قریش ہی میں رہے گی، اس پر انصار خاموش ہو گئے، اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔"

پھر اس پر تبصرہ فرماتے ہیں :-

"یہ حدیث متفق علیہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے، لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآن مسلسل اور متواتر نسل اور خون کے تمام امتیازات مٹا کر مساواتِ انسانیہ اور تکریم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا، حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی، آپ اس امر کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسول یہ فیصلہ کریگا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہیگی۔ یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو باطل قرار دینے کیلئے کافی ہے، لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتی ہے۔ اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار و مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حقِ خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا، اور اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری تاریخ ایک ہی واقعہ میں خدا کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابۂ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔"

ابتک بحث پیشِ نظر یہ تھی کہ کیا سقیفۂ بنی ساعدہ میں خلیفہ کا انتخاب بجائے شوریٰ کے استبداد سے کام لیکر اور حسب و نسب کو معیار بنا کر کیا گیا؟ لیکن اب اسی کے ذیل میں پرویز صاحب نے ایک بحث یہ پیدا کر دی کہ کیا "الائمۃ من قریش" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ اور اس میں اور آپ کے زندگی بھر کے اسوۂ حسنہ میں کوئی تضاد نہیں ہے؟ ——— ہم اس سوال سے بھی تعرض کرینگے لیکن پہلے پہلی والی بحث کو نمٹا لیجئے!۔

اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جب پرویز صاحب "تاریخ" کا یہ بیان بتاتے ہیں کہ انصار "الائمۃ

من قریش ستمشن کر حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنانے پر راضی ہو گئے، تو "تاریخ" پر یہ الزام تو باقی نہیں رہتا کہ وہ صحابہ کرامؓ کو شوریٰ کے بجائے استبداد سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے، ہاں حسب و نسب کو معیار بنانے والا قصہ باقی رہ جاتا ہے!۔

لیکن ہم پرویز صاحب کی اس دانستہ یا نادانستہ غلطی سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے، جس کی بناء پر انکے الزام کا ایک حصہ از خود منہدم ہو گیا ہے، بلکہ ہم انھیں بتائیں گے کہ خود تاریخ طبری میں بھی ایک روایت صحیح (اور اوّلین روایت وہی ہے) اور وہی روایت بخاری میں بھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کی صورت وہ نہیں تھی جو انھوں نے تاریخ کے حوالہ سے بیان کی ہے[1]، بلکہ یہ تھی کہ جب انصار کسی طرح رضامند نہیں ہو۔ اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ اختلاف کوئی بری صورت نہ اختیار کر جائے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا :-

ابسط يدك يا ابا بكر فبسط يده	ابوبکرؓ اپنا ہاتھ بڑھاؤ، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا
فبايعته وبايعه المهاجرون ثم	ہاتھ بڑھا دیا، اور میں نے (حضرت عمرؓ نے) اُن سے
بايعته الانصار ـــــ (بخاری	بیعت کی، اور دیگر مہاجرین نے بیعت کی، اور پھر
باب رجم الحبلیٰ من الزنیٰ اذا احصنت)	انصار نے بھی بیعت کر لی۔

ہم پرویز صاحب کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بخاری کی اس روایت سے پورا فائدہ اٹھائیں، اور اپنے اس الزام کو خو مدلل فرمائیں کہ "تاریخ" (حدیث) صحابہ کرامؓ کو شوریٰ کے بجائے استبداد سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے، ہم نہیں چاہتے دعوے کا کوئی نہایت اہم ثبوت اگر پیش ہونے سے رہ گیا ہے تو ان کی اس چوک سے فائدہ اٹھا کر خیر منائیں ہم چاہتے کہ وہ تمام بہترین ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر حدیث پر مشق ستم فرمائیں، اور پھر لوگ دیکھیں کہ وہ کہاں تک کامیاب ہ

حقیقت یہ ہے کہ صرف بخاری ہی کی یہ روایت ہے جس کی بنیاد پر کوئی شخص "تاریخ" کو الزام دے سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو انتخاب صدیقی کے معاملے میں مشورہ کے بجائے "استبداد" سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے، لیکن پرویز صاحب اس سے کیوں چوک گئے اور بخاری پر ہاتھ صاف کرنے کا یہ موقع انھوں نے کیوں ہاتھ سے جانے دیا؟ بخاری میں روایت ان کی نظر سے نہ بھی گزری ہو تو تاریخ کی کتابوں میں (مثلاً طبری ہی میں) تو یہ روایت سب سے پہلے موجود ہے پھر یہ کیا قصہ ہے کہ طبری کی بعد والی روایتیں تو وہ پیش کرتے ہیں، مگر یہ اوّلین روایت چھوڑ جاتے ہیں جو اُن

---

[1] اس پر اگر تفصیلی کلام دیکھنا ہو، تو راقم کے مضمون "دین میں حکمت عملی کا مقام" شائع شدہ الفرقان بابتہ محرم ۷۹ھ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

...ام کا کھلا ثبوت نہیں؟ ــــــــ قصہ یہ ہے کہ اسی روایت میں اس اعتراض کا جواب بھی موجود ہے، اور یہ جو حضرت عمرؓ کی زبان سے واقعہ کا بیان اس روایت میں ہوا ہے، درحقیقت اس اعتراض کا جواب دینے ہی کیلئے ہوا ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کسی کے متعلق سنا کہ فلاں شخص یوں کہتا ہے کہ :ـــ

لو قد مات عمر لقد بايعت فلانا فواللہ ما كانت بيعة ابی بكر الا فلتة فتمت ـ

عمرؓ کے انتقال کے بعد میں فلاں شخص سے بیعت کرلونگا (اور اس کا مجھے کیوں حق نہ ہوگا؟) اسلئے کہ بخدا ابوبکرؓ کی بیعت کی نوعیت بھی اسکے سوا کچھ نہیں تھی کہ یکایک (ایک شخص کی سبقت سے) ہو گئی تھی، اور بعد میں (سب لوگوں کی رضامندی اور توثیق سے) اس کی تکمیل ہوئی ۔

اس پر حضرت عمرؓ نے ایک جمعہ میں وہ تقریر فرمائی جو بخاری وغیرہ کی مذکورہ روایت میں آتی ہے، اور اسی ذیل میں بیعت ابی بکرؓ کا واقعہ بیان فرمایا ـــــــ آپ نے فرمایا :ـ مجھے ایسی ایسی بات پہنچی ہے تو میں آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ :ـ

"کوئی شخص اس خیال سے دھوکے میں نہ پڑے کہ ابوبکرؓ کی بیعت یکایک (بلا مشورہ کے) عمل میں آگئی تھی، اور بعد میں (سب کی رضامندی اور توثیق سے) اس کی تکمیل ہوئی، بیشک ابوبکرؓ کی بیعت کی نوعیت یہی تھی لیکن ایسی نوعیت میں جو خطرہ کا پہلو ہوتا ہے اللہ نے ہم لوگوں کو اس سے محفوظ رکھا۔ آج تم میں سے کوئی نہیں ہے جس کا فضل اور جس کی بزرگی ابوبکرؓ کی طرح مسلّم ہو۔ جو شخص بھی بلا مسلمانوں کے مشورہ کے کسی شخص سے بیعت کرے گا اُسے سمجھ لینا چاہئے کہ جس شخص کی بیعت کی جائے گی اور جو بیعت کریگا، وہ دونوں اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالیں گے، اور گویا از خود قتل کے لئے پیش کرینگے ۔" (ایضاً)

بعد حضرت عمرؓ نے پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کیا صورتِ حال تھی جس میں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کو گوارا کیا گیا ہے، اس پہلو سے آپ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انتخاب کی کارروائی ہم لوگوں نے اپنی ... نہیں کی تھی، بلکہ ہمیں یکایک معلوم ہوا کہ ہمارے بھائی انصار ایک جگہ جمع ہو کر کسی شخص کو امارت کیلئے ... ہیں، یہ خبر اتنی پریشان کن تھی کہ ہم جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی یہ خبر سُن کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور سقیفے کی ... اور زبیرؓ وغیرہ جیسے اہم لوگ بھی چونکہ اُس وقت ہمارے پاس نہ تھے اسلئے ہم ان کو بھی اپنے ساتھ ... سقیفے میں پہنچ کر انصار کی اور ہماری بات چیت ہوئی (اس کی تفصیل اس سے پہلے قسط میں گذر چکی ہے) لیکن ... وہ ماننے والے نہیں ہیں، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ اختلاف کوئی سنگین شکل اختیار کر جائے گا۔

واقعہ کی یہ نوعیت بیان کرنے کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :-

انا واللہ ما وجدنا فیما حضرنا	ہم جس صورت حال سے دوچار ہو گئے تھے، خدا
من امرٍ اقویٰ من مبایعۃ ابی بکر	جانتا ہے کہ اس میں ابوبکرؓ کی بیعت سے زیادہ
خشینا ان فارقنا القوم ولم	بہتر اور مامون راستہ ہمارے سامنے کوئی
تکن بیعۃ ان یبایعوا رجلا	دوسرا نہیں تھا، اگر ہم بیعت کا معاملہ طے
منھم فاما تابعناھم علیٰ مالا	کئے بغیر انصار سے جدا ہو جاتے (کہ دوسرا ہم
نرضیٰ واما نخالفھم فیکون	لوگوں کو جمع کرکے مشورہ کیا جائے) تو پورا خطرہ تھا
فسادًا فمن بایع رجلا علیٰ	کہ انصار اپنے میں سے کسی شخص کی بیعت کرلیں، اور
غیر مشورۃ من المسلمین فلا	یہ بات اگر ہو جاتی تو پھر ہمارے سامنے دو ہی
یتابع ھو ولا الذی تابعہ	راستے تھے، یا تو ہم اپنی مرضی کے خلاف اُن کا
تغرۃ ان یقتلا ۔	اتباع کرتے، یا ہم مخالفت کرتے، تو پھر فساد برپا ہوتا۔

پس (میں آگاہ کرتا ہوں کہ) جو شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی شخص کے ہاتھ پر بیعت کریگا تو یہ متبوع اور تابع دونوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالیں گے۔

ہم پوچھتے ہیں، کون ہے جو اس کے بعد بھی حدیث پر یہ طعن کر سکے کہ وہ صحابہ کرامؓ کو استبداد سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے؟ کتب حدیث کی یہی وہ واحد روایت تھی جو اس طعن کی بنیاد بنائی جا سکتی تھی، مگر یہ روایت اس طعن کا ایسا جواب اپنے اندر خود رکھتی ہو کہ پرویز صاحب باوجود ضرورت کے اس کو پیش کرنے کی جرأت نہ کر سکے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الزامات کی فہرست میں تو انھوں نے دکھایا تھا کہ "تاریخ" انتخاب صدیقیؓ کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ کو شوریٰ کے بجائے استبداد سے کام لیتا ہوا دکھاتی ہے، مگر جب ثبوت کا موقع آیا تو ان کا ہاتھ اسکے ثبوت سے خالی تھا۔

انتخاب صدیقیؓ کے سلسلہ میں "استبداد" کا ذکر چھڑا ہے تو استبداد کے اُس الزام پر بھی لگے ہاتھوں غور کرتے جائیے جو اسی واقعہ کے سلسلہ میں حضرت علیؓ اور دیگر بنو ہاشم کی نسبت سے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر لگایا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی تقریر کے انھیں آخری فقروں میں جو ابھی ہم نے نقل کئے، اس کا بھی بھرپور جواب

موجود ہے حضرت عمرؓ نے پوری جرأت کے ساتھ اس امر کا اعتراف فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت فَلْتَۃً اور بَغْتَۃً (بلا کسی شورائی قرارداد کے) ہوئی تھی، مگر وہ فرماتے ہیں کہ بتاؤ جو صورتِ حال درپیش تھی اس میں ہمیں اس کے سوا کیا کرنا چاہئے تھا، جو ہم نے کیا؟ ہمارا کوئی ارادہ اُس وقت انتخاب کا نہیں تھا، ہمیں یکایک اطلاع ملی کہ انصار انتخاب کی کارروائی کے لئے جمع ہو گئے ہیں، علیؓ وغیرہ اُس وقت ہمارے پاس نہیں تھے، اور موقع کی نزاکت متقاضی تھی کہ فوراً انصار کے مجمع میں پہنچا جائے، کہیں وہ کارروائی کر نہ گزریں، اسلئے ہم علیؓ وغیرہ کو اپنے ساتھ نہ لے سکے[۱]۔ ہم پہنچے تو یہ صورت بنی کہ انتخاب ٹل نہیں سکتا تھا، کچھ نہ کچھ ہو جاتا تھا، ایسی صورت میں اگر ہم تمام اہلِ مشورہ کے مشورہ کے خیال سے انصار کو اُن کے حال پر چھوڑ دیتے اور اس کارروائی میں کوئی حصہ نہ لیتے، تو اُن کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنے میں سے کسی آدمی کا انتخاب کئے بغیر نہ رہتے، اور پھر دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو ہم اس غلط انتخاب پر راضی ہو جاتے یا فتنہ و فساد ہوتا، بتاؤ ایسے وقت میں ہمارا فرض اس کے سوا کیا تھا کہ مسلّمہ طور پر پوری امت کا بزرگ ترین فرد جو اُس وقت خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ اُس مجمع میں موجود تھا، ہم اُس کا انتخاب کرالیں، جس کی طرف ایک بار کچھ لوگوں کے ہاتھ بڑھ جانے کے بعد کسی طرف سے کسی بڑے اختلاف کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

کیا اس کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ انتخاب امارت کے معاملہ میں حضرت علیؓ وغیرہ کو نظر انداز کر دیا گیا، اور اُن سے مشورہ تک نہیں لیا گیا؟ مشورہ کا وقت کہاں تھا؟ اگر ان سے مشورے کی فکر کی جاتی، تو وہ ہوتا، جو حضرت علیؓ کو کسی طرح بھی پسند نہ ہوتا، ورنہ حضرت عمرؓ وغیرہ تو خود سمجھتے تھے کہ اس طرح کسی کی بیعت نہیں ہونی چاہئے، اسی لئے تو وہ فرماتے ہیں، کہ خشینا ان فارقنا القوم ولم تکن بیعۃ الخ اگر وہ چاہتے ہوتے کہ اسی طرح ابوبکرؓ کی بیعت کر لی جائے، تو اُن کے سامنے یہ سوال ہی کیوں آتا کہ اس وقت یہ مسئلہ مؤخر ہونا چاہئے، جس پر وہ عمل اس خطرہ سے نہ کر سکے کہ انصار انتخاب کی کارروائی کر نہ گزریں۔ ایک طرف اُنکا یہ کہنا

---

[۱] اور یوں بھی حضرت علیؓ کی جو قرابت حضورؐ سے تھی اس کے پیش نظر یہی بات مناسب تھی کہ اس صدمۂ جانکاہ کے وقت میں انہیں کسی نو خیشی کیلئے زحمت نہ دیجاتی، جبکہ ابوبکرؓ و عمرؓ کے پیش نظر خلافت کا کوئی فیصلہ کرنا اُس وقت نہیں تھا، بلکہ اُس اجتماع کی کارروائی کو روکنا تھا۔ اگرچہ وہ روک نہ سکے۔

کہ خشینا ان فارقنا القوم الخ دوسری طرف حضرت علیؓ وغیرہ کی غیر موجودگی کا خاص طور پر ذکر کرنا اِس بات کی کُھلی شہادت ہے کہ وہ محسوس فرماتے تھے کہ حضرت علیؓ وغیرہ کی غیر موجودگی بہت بڑی کمی ہو، مگر حالات نے اس کا موقع نہ دیا کہ وہ ان کو خصوصًا اور ایسے دوسرے حضرات کو عمومًا کسی پرسکون ماحول میں جمع کرکے باقاعدہ مشورے سے کوئی فیصلہ کرسکیں۔

ٹھیک ہے کہ بخاری کی روایت میں (جس کو ایک دوسرے مقصد سے پرویز صاحب نے بھی اپنے مضمون میں پیش کیا ہے) حضرت علیؓ کی زبانِ مبارک سے بھی یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں، کہ :-

ولکنّك استبددت علینا بالامر (بخاری کتاب المغازی، باب غزوۂ خیبر)

لیکن ظاہر ہے کہ یہ استبداد کی شکایت اُس بھیانک معنیٰ میں نہیں ہے، جو ایک سیاسی اصطلاح کے طور پر "استبداد" سے سمجھے جاتے ہیں، یا جو پرویز صاحب نے "غصب" کو اس لفظ کے مترادف کے طور پر استعمال کرکے سمجھانے کی کوشش کی ہے، بلکہ اسکے معنیٰ صرف یہ ہیں، کہ :-

"آپ نے خلافت کے معاملہ میں ہم سے مشورہ نہیں لیا، اور اس معاملہ کو طے کرنے کیلئے اپنے آپ کو کافی سمجھ لیا"[1]

اور یہ وہ بات ہے جس سے کسی کو انکار کرنے کی ضرورت نہیں، حضرت عمرؓ نے خود صراحت کیساتھ تسلیم کیا ہے کہ ہاں ایسا ہوا، لیکن اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ حضرت علیؓ سے بالا ہی بالا یہ کام کرلینا منظور تھا: تاہم حضرت علیؓ نے چونکہ اُس ماحول کی مجبوریوں کا بچشم خود مشاہدہ نہیں فرمایا تھا جس میں اُن کے مشورہ کو چھوڑنا گوارا کیا گیا، اس لئے انھیں شکایت ہوسکتی تھی، اور انھوں نے بس اسی درجہ کی شکایت فرمائی، ورنہ انھیں یہ اعتراف تھا (اور نہ ہونے

---

[1] حضرت علیؓ نے استبددت بالامر نہیں فرمایا، بلکہ "استبددت علینا بالامر" فرمایا، اور اسکے یہی معنی ہوتے ہیں جو ہم نے کئے، پرویز صاحب نے چونکہ محض مطالعہ سے عربی سمجھنے کی مشق بہم پہنچائی ہے، اور انھوں نے دیکھا ہوگا کہ "علی" کہیں "خلاف" کیلئے آتا ہے، اسلئے انھوں نے اِس جملہ کا ترجمہ فرمادیا ہے "لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے" حالانکہ وہ اگر سوچتے تو اسی قرینہ سے صحیح مطلب سمجھ لیتے کہ حضرت علیؓ کہیں مقابل اُمیدوار بنے کھڑے تھے کہ اُنکے خلاف استبداد سے کام لیا گیا، مقابلہ اگر تھا بھی تو دوسروں سے تھا، حضرت علیؓ کے خلاف استبداد کا کیا سوال ؟

کے کوئی معنی نہ تھے) کہ حضرت ابوبکرؓ اس منصب کیلئے احق تھے، چنانچہ وہ اسی شکایت کیساتھ فرماتے ہیں :-

انا قد عرفنا فضلك وما اعطاك	ہم آپ کا فضل اور اللہ نے آپ کو جو مقام دیا ہے
الله ولم ننفس عليك خيرًا	اُسکو پہچانتے ہیں، اور اللہ نے جو خیر (منصب خلافت)
ساقه الله اليك ۔	آپ کو بخشا ہے اُس میں ہم آپ سے منافست
(ایضاً)	نہیں کرتے۔

بہرحال سقیفہ کے اجتماع کا نقشہ سامنے آجانے کے بعد کسی پہلو سے بھی نہیں کہا جاسکتا کہ صحابۂ کرامؓ نے مشورہ کے اصول کو نظر انداز کیا، انصار اس معاملے میں مشورے کا جو دائرہ سمجھ رہے تھے، انھوں نے اُس دائرے میں کھلا مشاورتی اجتماع منعقد کیا، مہاجرین کے نمائندے (ابوبکر و عمرؓ) اس معاملے میں جو رائے رکھتے تھے انھوں نے انصار کو اپنے نقطۂ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کی، لیکن جب دیکھا کہ نہ اس اجتماع کی کارروائی ٹل سکتی ہے اور نہ مشاورتی اتفاق سے کوئی بات طے ہوسکتی ہے، تو حضرت عمرؓ کی فراستِ ایمانی نے وہ اقدام کیا جسے بجز الہام کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا، انھوں نے نہ انصار کے خلاف کوئی طاقت کا مظاہرہ کیا، نہ مخالف نمائندوں اور "ووٹروں" کو لیجا کر کہیں بند کر دیا، نہ ڈرانے دھمکانے کی پالیسی اختیار کی۔ بلکہ صرف یہ کیا کہ اپنا ہاتھ ابوبکرؓ کے ہاتھ میں رکھ دیا، اور اس طرح زبانی اختلاف کے ماحول کو عملی اتفاق میں تبدیل کرنے کی ایک تدبیر کی، جس کی کامیابی اسی دم روشن ہو کر سامنے آگئی، اور موافق و مخالف سب اسی مجلس میں اُس ایک ہاتھ پر جمع ہو گئے ـــــــــ رہی حضرت علیؓ وغیرہ سے عدمِ مشاورت تو وہ اسی صورتِ حال کی پیدا کردہ ایک غیر اختیاری بات تھی، جس سے اکابر مہاجرین غیر متوقع طور پر دوچار ہو گئے تھے، ورنہ وہ چاہتے تھے کہ مجلس ملتوی کی جائے، اور حضرت علیؓ جیسے حضرات جو مشورہ سے رہ گئے ہیں، اُن سے بھی مشورہ لیا جاسکے ـــــــــ پس کون ہے جو کہہ سکے کہ حضرت ابوبکر و عمرؓ وغیرہ نے مشورہ کا اصول چھوڑ کر استبداد سے کام لیا، یا "حدیث" کو بدنام کرنے کی جرأت کر سکے کہ وہ اصحابِ کرامؓ کو اس غیر قرآنی رنگ میں دکھاتی ہے؟

اب آیئے، یہ بھی دیکھئے کہ کیا حدیث اس واقعہ میں صحابۂ کرامؓ کے متعلق یہ بتاتی ہے کہ انھوں نے قرآن کے دیئے ہوئے معیارِ انتخاب کے بجائے، حسب و نسب کو معیارِ انتخاب بنایا؟

ہم کہہ چکے ہیں کہ اپنے دعوؤں کے ثبوت میں جو روایتیں پرویز صاحب تاریخی کتابوں سے پیش کرتے ہیں اُن کے جواب کی ذمہ داری ہم پر قطعاً نہیں ہے، ہم اسی "تاریخ" (حدیث) کی روایتوں کے جوابدہ ہیں جنھیں بقول پرویز صاحب "دین بنا لیا گیا ہے"۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم دیکھتے ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں کوئی روایت ہم نہیں پاتے جو پرویز صاحب نے حدیث سے پیش کی ہو، البتہ ایک بات انھوں نے بے حوالہ کہی ہے، کہ:-

"جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کرگیا، تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے، رسول اللہؐ نے فیصلہ کر دیا ہے، کہ الائمۃ من قریش خلافت قریش میں رہے گی، اس پر انصار خاموش ہوگئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے"۔

یہ بات کُلّاً اور لفظاً تو نہیں البتہ جزءاً اور معناً حدیث کی ایک روایت سے ثابت ہے۔ اور وہ مسند احمد کی یہ روایت ہے کہ انصار کے فضائل و مناقب پر ایک زبردست تقریر فرمانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے قائد انصار حضرت سعد بن عبادہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:-

ولقد علمت یا سعد ان رسول اللہ	سعد! تم جانتے ہو، تمھاری موجودگی ہی میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم قال وانت	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اچھے برے
قاعدٌ قریش ولاۃ ھذا الامر	دونوں طرح کے لوگوں کی سرداری قریش میں ہے
فبرالناس تبع لبرھم وفاجرھم	بھلے لوگ اُن کے بھلوں کے تابع ہیں، اور برے
تبع لفاجرھم۔	اُن کے بُروں کے۔

اس پر حضرت سعدؓ نے فرمایا:-

صدقت نحن الوزراء وانتم	آپ سچ فرماتے ہیں (ہمیں منظور ہے کہ) امارت آپکی
الامراء۔ (مسند احمد۔ مرویات ابی بکرؓ)۔	وزارت ہماری۔

لیکن ہم پرویز صاحب کو ایک اس سے بھی زیادہ مفید مطلب روایت کی نشاندہی کرتے ہیں، اور وہ بخاری کی وہی روایت ہے جس کا ہم نے بار بار حوالہ دیا ہے (اور مورخین بھی اس واقعہ میں اولاً اسی روایت کو درج کرتے ہیں) ہم اسکے یہ الفاظ پہلے بھی نقل کر چکے ہیں کہ انصار کے فضائل کا اعتراف کرنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا:-

ولن یعرف ھذا الامر الا ۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اہلِ عرب اس

لهذا الحي من قريش هم اوسط العرب نسبًا ودارًا۔ قبیلۂ قریش کے سوا کسی کی سرداری کو جانتے ہی نہیں، یہ اپنے نسب اور گھرانے (یا مقام[1]) کے اعتبار سے سارے عرب میں فائق ہیں۔

تو کیا فرماتے ہیں پرویز صاحب۔ ان الفاظ میں یا وہ جو مسند احمد کی روایت میں حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے بطور حدیث مرفوع ادا ہوئے نسل پرستی کا تصور ملتا ہے؟ ——— پرویز صاحب تو جو چاہیں فرما دیں، لیکن دوسرا آدمی تو ان کے ارشادات جبھی تسلیم کر سکتا ہے جب ان میں معقولیت ہو، نسل و نسب پرستی کا مطلب کون نہیں جانتا، کہ اس میں صرف فلاں نسل اور فلاں خاندان سے ہونا دیکھا جاتا ہے، اور محض یہی چیز وجہ ترجیح و وجہ تکریم بنتی ہے، لیکن یہاں خواہ بخاری کی روایت لے لیجئے یا مسند احمد کی روایت، دونوں میں سے کسی کے بھی الفاظ میں یہ بات برائے نام بھی نہیں پائی جاتی، حضرت ابوبکرؓ نے نہیں فرمایا کہ قریش اپنے نسب کی بناء پر سرداری کے حقدار ہیں حضرت ابوبکرؓ کی پوری تقریر پڑھئے، وہ انصار سے صاف فرماتے معلوم ہوتے ہیں کہ اپنی ذاتی خوبیوں کی بناء پر بیشک تم خلافت کے اہل ہو، مگر ایک نہایت قابل لحاظ بات یہ ہے کہ پوری عرب قوم اگر کسی کی امارت پر متفق ہو سکتی ہے تو وہ قریش ہیں، اسلئے کہ عرب مدتوں سے قریش ہی کی سرداری مانتے آرہے ہیں۔

بخاری کی روایت کی رو سے حضرت ابوبکرؓ نے یہ ضرور فرمایا کہ "یہ اپنے نسب اور گھرانے (یا مقام) کے لحاظ سے سارے عرب میں فائق ہیں" مگر یہ اس بات کی دلیل کے طور پر نہیں کہ قریش ہی منصب خلافت کے حقدار ہیں۔ اسلئے کہ یہ بات تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمائی ہی نہیں، بلکہ انھوں نے یہ بات اس بات کی وجہ کے طور پر فرمائی کہ اہل عرب قریش ہی کی سرداری کو کیوں مانتے ہیں، کیونکہ یہی بات ہے جو حضرت ابوبکرؓ نے فرمائی تھی (کہ اہل عرب قریش کے سوا کسی اور کی سرداری سے آشنا ہی نہیں) پس اسکے بعد "هم اوسط العرب نسبًا ودارًا" کہنا صرف یہی معنیٰ رکھتا ہے کہ یہ لوگوں کی نظر میں قریش کے مقام کی وجہ بیان کی جارہی ہے، پس اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ قریش کے احق بالخلافت ہونے کی دلیل دی جارہی ہے، تو اس کو جہالت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے، اسلئے کہ قریش کا احق بالخلافۃ ہونا حضرت ابوبکرؓ کی تقریر میں کہیں مذکور ہی نہیں۔

---

[1] یعنی خانۂ کعبہ کا جوار۔

تو سیدھی اور صاف بات ہے کہ جن صحابہ کرامؓ نے قریش کی امارت پر اصرار کیا، انھوں نے اس بنیاد پر نہیں کیا کہ قریش اپنے نسب کی بناء پر اس منصب کے حقدار ہیں، بلکہ اس بنیاد پر کیا کہ عرب مجموعی طور پر (کسی بھی وجہ سے) انھیں کو اپنا سردار مانتے ہیں، پس کیوں بلاوجہ مرکزِ قیادت تبدیل کیا جائے، اور جبکہ اتحاد و اتفاق اور اسلامی قوت کے استحکام کی شدید ضرورت ہے، کیوں ایک انتشار کا خطرہ مول لیا جائے؟ کیوں نہ انھیں میں سے کسی آدمی کو منصبِ خلافت دیا جائے، جبکہ اسلامی نقطۂ نظر اور قرآنی معیار سے بھی اس منصب کا ایک سے ایک اہل اِن کے اندر موجود ہے! ——— بیشک اگر ایسا ہوتا کہ اس حقیقی معیار کی رو سے کوئی اہل آدمی قریش کے اندر نہ ہوتا اور صرف اس بناء پر انھیں خلافت کے لئے ترجیح دی جاتی کہ قدیم سے انھیں کی سیادت چلی آرہی ہے، تو بھی یہ بات قابلِ اعتراض ہو سکتی تھی، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ قریش اس معیار کے اعتبار سے اس منصب کے اہل نہ تھے؟ انھیں میں سے تو ابوبکر و عمرؓ تھے جو اس معیار سے بھی اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے، اور انھیں میں سے تو مہاجرین اوّلین تھے، جنھیں قرآن پوری امت پر فضیلت دیتا ہے اور انصار تک پر اُن کا ذکر مقدم کرتا ہے، ہاں یہ بیشک نہیں ہوا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ اس پہلو سے بھی قریش کی اہلیت جتاتے، مگر اس سے کسی کو یہ دھوکا تو نہیں ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا، اور صرف مسلّمہ سیادت کی بناء پر وہ قریش کی امارت کے حق میں تھے۔

پرویز صاحب کا ایک مغالطہ حسب و نسب کو معیار بنانے کے الزام پر جب ہم پرویز صاحب کی تقریر پڑھتے ہیں تو وہاں ایک بڑا عجیب مغالطہ سامنے آتا ہے، جس میں یا تو پرویز صاحب خود مبتلا ہیں، یا انھوں نے دوسروں کو مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے، پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ عزت و تکریم کا قرآنی معیار صرف تقویٰ اور حسنِ عمل ہے، رنگ و نسل اور ذات و قبیلہ کے امتیازات کو اس میں کوئی دخل نہیں، اور اس کے بعد "تاریخ" پر اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ دیکھو تاریخ کی رو سے، پہلے اسلامی خلیفہ کے انتخاب کے موقع پر صحابہ کرامؓ نے اِس اہم اصول کو توڑ دیا تھا ——— حالانکہ اسلامی خلافت کا منصب اصلاً کوئی عزت و تکریم کا منصب نہیں ہے، اور کسی کو خلیفہ بنانے کا بذاتہ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اُسے دوسروں کے مقابلہ میں کوئی خاص عزت و عظمت دی جا رہی ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے یہ منصب اصلاً اور بالذّات محض خدمت اور ایک خاص ذمہ داری کا منصب ہے، اس میں اگر کوئی عزت ہے تو صرف اس معنیٰ میں کہ ایک بارِ عظیم کے لئے ایک شخص پر اعتماد کا اظہار کیا جاتا ہے، نہ کہ اس کو زندگی اور معاملات میں کوئی امتیاز دیدینے کے معنیٰ میں۔ چنانچہ

یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت ایک عام مسلمان اور ایک خلیفہ میں کوئی فرق نہیں کرتی، علیٰ ہذا وہ اسلامی معاشرہ جو اصلی اسلامی شعور اور اسلامی ذہن کا حامل ہو قطعاً کوئی فرق ایک عام مسلمان اور ایک خلیفہ میں روا نہیں رکھتا، ایسے اسلامی معاشرہ میں برسرِ منبر خلیفہ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہم تمہاری بات اس وقت تک نہیں سنیں گے جب تک یہ نہ بتا دو کہ تمہارے جسم پر فلاں کپڑے کی دو چادریں کہاں سے آگئیں، جب کہ تمام مسلمانوں کے پاس اس کپڑے کی ایک ہی ایک چادر ہے! اور خلیفہ کو بلا ناگواری کے سننا پڑتا ہے، اور ایک عام آدمی کی طرح صفائی دینا پڑتی ہے۔ ایسے اسلامی معاشرہ میں برسرِ منبر ہی خلیفہ سے تلوار دکھا کر کہا جا سکتا ہے کہ اگر تم ٹیڑھے چلو گے تو ہم اس سے تمھیں سیدھا کر دینگے، اور ایک صحیح اسلامی اسپرٹ رکھنے والا خلیفہ اس پر جز بز ہونے کے بجائے مسرور ہوتا ہے، کہ امت کا ذہن ٹھیٹ اسلامی ہے۔ خلیفہ کو بیشک ایک عزت حاصل ہوتی ہے، مگر اپنی خدمات اور عظیم ذمہ داریوں کے تحمل کی بناء پر۔ رہا نفس خلیفہ بنایا جانا، تو یہ قطعاً کوئی اعزاز و تکریم کا عمل نہیں ہوتا، یہ کوئی قیصریت اور کسرویت تھوڑے ہی ہے کہ مجرد تختِ سلطنت پر بٹھا دیئے جانے سے ایک شخص دوسروں سے ممتاز ہو جاتا ہے، اسکے حقوق الگ ہو جاتے ہیں، اس کا پیمانۂ حقوق جدا ہو جاتا ہے، وہ دوسروں کو سلام نہیں کرتا، اسے سلام کیا جاتا ہے، وہ دوسروں کے لئے نہیں اٹھتا، اس کے لئے اٹھا جاتا ہے، اسکے برابر بیٹھنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کی موجودگی میں سرے سے بیٹھنا ہی اس کی اذن خاص پر موقوف ہوتا ہے وہ گرجتا ہے، جبکہ دوسروں کی عاجزانہ لب کشائی تک اس کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے۔

غرض جب استخلاف (خلیفہ بنائے جانے کا عمل) اپنی ذات سے کوئی اعزاز و تکریم کا عمل ہی نہیں، تو یہاں یہ سوال اٹھانا ہی بے محل ہے کہ قرآن نے عزت و تکریم کا کیا معیار مقرر کیا ہے یہاں تو یہ دیکھا جائے گا، کہ جو خدمات اور جو ذمہ داریاں کسی کے سپرد کرنے کا نام "استخلاف" ہے، اس کیلئے اللہ کا کیا حکم ہے؟ تو قرآن نے ہر قسم کی ذمہ داریوں کے لئے عمومی طور پر بتایا ہے، کہ:۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔ — اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے کہ جملہ قسم کی امانتیں انکے اہل کے حوالے کرو!۔

اس قرآنی حکم کے بموجب امر و اقتدار کی امانت اور خلافت کی ذمہ داریاں انھیں لوگوں کے سپرد کی جائیں گی جو اس کے اہل ہوں گے، اور اہلیت کا معیار، نصب خلافت کا مقصد، کارِ خلافت کی نوعیت اور اس کی تمام ہمتوں کو سامنے رکھنے سے خود بخود واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ جس طرح نصب خلافت کے بنیادی مقصد کو

دیکھتے ہوئے یہ بالکل واضح بات ہے، کہ خلیفہ کی زندگی سرتاسر اسلامی ہونی چاہئے اور جس طرح اسکی ذمہ داری کی مختلف جہتوں کو دیکھتے ہوئے کسی جہت کی رو سے ضروری قرار پاتا ہے کہ اس کو دین و شریعت کے علم میں راسخ ہونا چاہئے کسی جہت کی رو سے ضروری قرار پاتا ہے کہ اس میں اجتہاد کی صلاحیت ہونی چاہئے، کسی جہت کی رو سے لازم ہوتا ہے کہ اس میں تدبّر اور جہاں بانی کی استعداد ہونی چاہئے، اسی طرح کارِ خلافت کی نوعیت پر نگاہ کرنے سے یہ بات اشد ضروری نظر آتی ہے کہ خلافت کے منصب پر ایسے شخص کو بٹھایا جائے جس پر اُمت کا زیادہ سے زیادہ حصہ متفق ہو سکے۔ یہی صورت ہے جس میں خلیفہ اپنی ذمہ داریاں بہتر طریقے پر ادا کر سکتا ہے ورنہ یا تو وہ ناکام ہو جائے گا، یا اُسے لوگوں کو تابع فرماں بنانے میں سخت جدوجہد کرنی پڑے گی۔

ظاہر ہے کہ جب ایسے اشخاص موجود ہوں جو دوسرے تمام شرائط کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیت بھی رکھتے ہوں، تو عام عقل و دانش کا فیصلہ بھی یہی ہوگا، اور دینی تفقّہ کا بھی یہی تقاضہ ہوگا کہ ایسے ہی اشخاص کو اس منصب کیلئے ترجیح دی جائے ——— خواہ ایسا بھی کیوں نہ ہو کہ نفس تقویٰ میں کوئی دوسرا شخص اور دوسرے اشخاص بڑھے ہوئے ہوں! اسلئے کہ مجرد تقویٰ سے خلافت کی تمام ذمہ داریاں پوری نہیں ہو سکتیں۔

پس جن صحابۂ کرام نے "تاریخ" کے بیان کی رو سے، قریش کی ترجیح کا سوال اٹھایا انھوں نے اسی اصول پر اُٹھایا تھا ——— قطعاً غلط ہے یہ خیال کہ انھوں نے عزت و تکریم کے قرآنی معیار کو نظر انداز کر دیا۔ یہاں قطعاً کسی کو کوئی عزت نہیں دی جا رہی تھی، کسی کو تاج نہیں پہنایا جا رہا تھا، کسی کو تخت پر نہیں بٹھایا جا رہا تھا کسی کو "ظل اللہ" نہیں بنایا جا رہا تھا! یہاں ایک بارِ خدمت تھا جو کسی کے سپرد کرنے کا سوال تھا، اور اس کیلئے یہ دیکھنا ضروری تھا، کہ کون اس بار کو بہتر طریقے پر اُٹھا سکتا ہے۔

لوگ خلافت کی حقیقت کو سمجھتے نہیں، یا اس کا صحیح تصوّر ذہن میں رکھتے نہیں، خلافت کا لفظ بولتے ہیں، اور تصور میں لے آتے ہیں سلطنت و بادشاہت اور اسکے لوازم کو، اور پھر پریشان ہونے لگتے ہیں۔ یا پرویز صاحب جیسے لوگ، لوگوں کی اس کم نظری سے فائدہ اٹھا کر انھیں ورغلانے لگتے ہیں کہ تمھاری "تاریخ" تو خلافت کے معاملہ میں صحابۂ کرامؓ کو قبائلی تفریق کے نظریہ پر عمل پیرا دکھاتی ہے، یا وہ دیکھو "تاریخ کے فلاں جھروکے سے نظر آتا ہے کہ فلاں بلند مرتبہ صحابی خود سے خلافت چاہتے تھے۔ حالانکہ خلافت کے اسلامی تصور میں نہ کوئی جاہ و عزت ہے، نہ تاج و اورنگ ہے، نہ دوسرے مسلمانوں پر خلیفہ کی کوئی برتری، بلکہ صرف اور صرف وہ ایک

بارِ خدمت ہے، جو اس لفظ کے مثالی تصور کے اعتبار سے اس طرح اٹھایا جاتا ہے کہ خلیفہ مسجد کے بوریہ پر بیٹھتا ہے، دوسرے مسلمان اسکے پاس بیٹھے ہوں تو کوئی ظاہری امتیاز نہیں نظر آتا، کوئی اجنبی آئے تو قیاس سے خلیفہ کو متعین نہیں کرسکتا، بیت المال کا کوئی جانور گم جائے تو وہ تپتی دھوپ میں اسکے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے، جانوروں کو خارش ہوجائے تو اپنے ہاتھ سے دوا لگاتا ہے، کسی غریب کی فاقہ مستی کی خبر ہو جائے تو اپنی پیٹھ پر آٹے کی بوری لاد کر پہنچاتا ہے، اسکے بچے منہ میٹھا کرنے کو ترستے رہتے ہیں، اور عید کے دن تک انھیں نئے کپڑے پہننے کو نہیں ملتے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً مہاجرین وانصار میں سے السابقون الاولون خلافت کا یہی تصور رکھتے تھے، اور وہ سب خلافت کو اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ اس میں بجز اخروی سعادت کے اور کوئی منفعت نہیں، جیسا کہ خلفائے راشدین کے عہدِ خلافت کا ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ اس پر شاہد ہے، پس ایسے ماحول میں اگر کہا جاتا ہے کہ خلافت فلاں قبیلہ میں ہوتی بہتر ہے تو کسی معقول آدمی کے ذہن میں یہ وسوسہ تک نہیں آنا چاہئے کہ کسی قبیلہ کو دوسرے مسلمانوں پر کوئی برتری دی جارہی تھی، یا ایسے ہی اگر کسی بلند مرتبہ صحابی کے متعلق نظر آتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ خلافت انھیں ملے، تو ایسے ماحول میں اور ایسے افراد کے بارے میں اس کی کوئی توجیہ بجز اسکے معقول نہیں ہوسکتی کہ وہ اس کام کیلئے دوسرے کسی متوقع شخص کے مقابلہ میں خود کو زیادہ اہل سمجھتے تھے ——— ایسی صورت میں (کہ اُن کا یہ احساس تھا) اگر خلافت کے ساتھ کسی قسم کا دنیوی اعزاز، کوئی برتری، کوئی مظاہرۂ شان وشوکت وابستہ ہوتا تب بیشک ایک رائے یہ ہوسکتی تھی کہ وہ تنزّہ برتتے تو زیادہ اچھا ہوتا، لیکن جب خلافت کے لوازم کا تخیل اسکے برعکس یہ ہو کہ آدمی خود کو مٹا دے، موٹا جھوٹا کھائے، موٹا پہنے، برتری کے بجائے فروتنی اُس کا شیوہ ہو، اور عزت مآبی کے بجائے خاکساری اس کی زندگی کا عنوان ہو، تب تو اللہ کی، اسکے رسول کی اور امتِ مسلمہ کی خیر خواہی، جو ایک مسلمان کا فرض ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے کہ ایسے موقع پر (کہ آدمی دیکھتا ہے کہ دوسرا شخص جس کو خلیفہ بنایا جانا متوقع ہے وہ فلاں وجہ سے بارِ خلافت کو اٹھانے کا کماحقہٗ اہل نہیں ہے، اور اسکے برعکس اُسے اپنے اوپر اعتماد ہے) اگرچہ کھل کر تو اپنے آپ کو پیش نہ کرے کہ یہ ہدایتِ نبویؐ کے خلاف ہے[1] البتہ اگر لوگوں کی طرف سے اس کو موقع دیا جارہا ہے تو خود کو ہرگز پیچھے

---

[1] حدیث میں آتا ہے، کہ "لا تسئل الامارۃ" (المحدیث) "امارت خود سے طلب نہ کرو۔ الخ (رواہ البخاری ومسلم، عن عبدالرحمٰن بن سمرۃ رضی اللہ عنہ)

نہ ہٹائے، اسلئے کہ ایک طرف یہاں اسلام اُور مسلمانوں کی خیر اندیشی کا سوال ہے، اُور دوسری طرف تنزّہ برتنے کا کوئی موقع نہیں۔

ہم صاف ہی صاف کیوں نہ کہدیں کہ مثلاً حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ان کے نامزد کئے ہوئے چھ حضرات میں سے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمان اُور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما دو ایسے اصحاب رہ جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے حق میں دستبردار نہیں ہوتے، تو جو لوگ اس ماحول سے آنکھیں بند کرکے اپنے ماحول میں رکھ کر اس واقعہ کو دیکھنے لگتے ہیں، اُور خلافت کے اُس وقت کے تصور کے بجائے آج کل کے مسخ شدہ تصوّر کو ذہن میں لئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ پریشان ہونے لگتے ہیں کہ ایسے عالی مرتبہ اصحاب کیسے "حبِ جاہ" کی کیفیت میں مبتلا ہوگئے! یا پرویز صاحب جیسے لوگ ہوں تو وہ جھٹ سے تاریخ کی گردن مارنے پر تُل جاتے ہیں کہ یہ تو بڑا غلط تاثر صحابۂ کرامؓ کے متعلق دیتی ہے، مگر جو لوگ اس واقعہ کو اپنے ماحول کے بجائے اسکے اصلی ماحول میں رکھ کر دیکھتے ہوں، اُور خلافت کا وہ تصوّر ذہن میں رکھتے ہوں جو اُس ماحول میں تھا، اُنھیں ایک لمحہ کیلئے بھی کوئی پریشانی پیش نہیں آسکتی!۔

پس تاریخی روایات کی چھان پھٹک ضرور کیجئے، مگر اس سے پہلے اپنے تصورات اُور زاویۂ نظر کی بھی اصلاح کیجئے، کہ تاریخی الجھنوں میں بہت کچھ دخل اس کا بھی ہوتا ہے۔ (باقی آئندہ)

تعارف و تبصرہ

درسِ قرآن

مرتبہ درسِ قرآن بورڈ، صفحات ۶۴۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت طباعت اور کاغذ بہتر، ——— مجلد قیمت -/۱۰

شائع کردہ :——— ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ، لاہور

ناظرینِ الفرقان واقف ہیں کہ ادارۂ اصلاح و تبلیغ لاہور سے درسِ قرآن کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ شائع ہوتا ہے جس میں پورے قرآن مجید کی مسلسل تشریح و تفسیر اس انداز سے کیجا رہی ہے کہ ایک ایک دو دو آیتوں کو ایک سبق کی حیثیت دے دی جاتی ہے، اس سبق کا ایک عنوان مقرر کیا جاتا ہے اور اس عنوان کے محور پر ایک صفحے میں ان آیات کی تشریح کی جاتی ہے، تشریح و تفسیر سے پہلے ان آیات کا ترجمہ بھی اس طریقے سے درج کیا جاتا ہے کہ آدمی کو ہر ہر لفظ کے معنی الگ الگ معلوم ہو جائیں، اس طرح ہر شمارہ میں پندرہ سبق ہوتے ہیں، یہ سلسلہ مفید ثابت ہوا ہے اور لوگوں نے اسے کافی پسند کیا ہے۔ اس طرح جب قرآن کی پہلی منزل (سوا پانچ پاروں) کے اسباق مکمل ہو گئے تو ادارۂ اصلاح و تبلیغ نے ان سب کو یکجا کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ یہی مجموعہ اس وقت زیرِ تبصرہ ہے ان قرآنی اسباق کی ترتیب کا کام ایک بورڈ نے انجام دیا ہے جو ان حضرات پر مشتمل ہے۔

مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی، مولانا حافظ مرغوب احمد صاحب توفیق

حاجی عبدالواحد صاحب ایم اے اور حافظ نذر احمد صاحب۔

ہمارے نزدیک یہ تجویز بہت اچھی ہوئی کہ درسِ قرآن کے اس سلسلہ کو اس طرح چند جلدوں میں مدوّن کر دیا جائے۔ اب ایک طرف یہ چیز زیادہ وقیع بھی ہو گئی اور دوسری طرف اس کا افادہ مستقل بھی ہو گیا۔ ہمیں امید ہے کہ لوگ اس تحفہ کی قدر کریں گے، ہر مسلمان گھر میں عموماً اور مساجد

میں خصوصاً اس کا ایک نسخہ ضرور رہنا چاہیے۔ بلکہ لڑکیوں کو جہیز میں دینے کے لیے بھی اس تحفہ کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ

از جناب خلیق احمد صاحب نظامی استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ کتابت طباعت اور کاغذ بہتر

صفحات ۲۱۲، سائز ۲۰×۲۶/۸، مجلد قیمت ۴/۵۰ غیر مجلد ۳/۵۰۔ ناشر:- ندوۃ المصنفین، دہلی

۱۹۵۷ء میں جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے صد سالہ جشن کا غلغلہ آزاد ہندوستان میں بلند ہوا تو جب سے اب تک کتنی ہی چیزیں اس یادگار تاریخی واقعہ سے متعلق نکل چکی ہیں۔ شاید اسی تحریک کا نتیجہ یہ تاریخی روزنامچہ ہے جو خلیق صاحب نے ایڈیٹ کر کے پیش کیا ہے ۔

خلیق صاحب نے اپنی محنت، اپنے فن (تاریخ) سے ذوقی مناسبت اور گہری دلچسپی کی بنا پر ادھر چند ہی سال میں اس موضوع پر تصنیف و تالیف میں اچھی شہرت حاصل کر لی ہے، اور یہ ان کا تازہ کارنامہ ان کی اس شہرت کے عین مطابق ہے، یہ عبد اللطیف نام ایک شخص کے قلم کا روزنامچہ ہے جو قلعۂ دہلی کے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء تک کے روزمرہ واقعات اور ہنگامہ کارزار سے متعلق موصولہ اطلاعات پر مشتمل ہے، اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب (پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کے خیال کے مطابق اس دور کے روزنامچوں میں سب سے زیادہ مستند روزنامچہ ہے ــــ (پیش لفظ)

اصل روزنامچہ فارسی میں ہے، اور یہ کتاب کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے حصہ میں اس کا سلیس ترجمہ ہے۔ آخری حصہ میں خلیق صاحب نے ان اشخاص کا تعارف دیا ہے جن کے نام روزنامچہ میں آئے ہیں ــــ روزنامچہ سے پہلے مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے جو افادیت میں ہمارے نزدیک اصل کتاب سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے اس یادگار واقعہ پر مختلف پہلوؤں سے اتنی جچی تلی بحث پر موصوف کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

عبد اللطیف بہادر شاہ کا ذکر انتہائی احترام کے ساتھ کرتا ہے، مگر مجاہدین آزادی کی جانب رویہ انتہائی حقارت اور مذمت آمیز ہے۔ خلیق صاحب کا خیال ہے کہ اس درجہ مذمت اور تحقیر تقاضائے ماحول کی رعایت سے مصنوعیت ہے اور در اصل اس کے جذبات اس کا عکس ہیں جنھیں سیدھے طور ظاہر کرنے سے وہ مجبور رہا ہے ــــ اور یہ بات کسی حد تک دل کو لگتی ہے۔

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

از جناب خلیق احمد صاحب نظامی

ضخامت ۸۰+۴۵ صفحات، سائز متوسط (۲۰×۲۶/۱۶)

کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر۔ قیمت مجلد -/۹، غیر مجلد -/۸

ناشر: ـــــــــ ندوۃ المصنفین۔ اردو بازار، جامع مسجد دہلی

اس کتاب میں سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر سلطان ابراہیم لودی تک تمام سلاطین دہلی کے مذہبی افکار وعقائد کا اس انداز سے جائزہ لیا گیا ہے کہ ایک طرف ان سلاطین کی شخصی زندگی میں اسکے اثرات واضح ہوجائیں تو دوسری طرف نظام حکومت پر بھی اس کے اثرات کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہوسکے۔

مصنف نے اس کام کے لیے پچاسوں قلمی اور مطبوعہ ماخذوں کو کھنگال کر مواد فراہم کیا ہے اور پھر بڑے سلیقے سے اُسے کتاب میں پھیلایا ہے۔ اس کاوش میں اُن کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ سلاطین کی جو تصویر بنائی جائے، اس کے رنگ صرف سیاسی مورخوں ہی سے حاصل نہ کیے جائیں۔ بلکہ سماج کے جس جس طبقہ کی رائے ان کے متعلق حاصل ہوسکے اس کا پتہ لگایا جائے" اور اس ضمن میں انھوں نے اس دور کے مشائخ کے ملفوظات اور مکتوبات کی طرف خاص طور سے توجہ کی ہے ـــــ شروع میں ایک مبسوط مقدمہ مصنف ہی کے قلم سے ہے جو کئی کارآمد مباحث پر مشتمل ہے۔ خصوصاً "سلاطین کے مذہبی افکار وعقائد کے نشوونما کی بحث (جس میں ان حکمراں خاندانوں کے ہندوستان آنے سے قبل اور ہندوستان آنے کے بعد کا وہ نسلی، تمدنی، معاشرتی اور دینی ماحول دکھایا گیا ہے جس میں ان کے افکار وعقائد کا نشوونما ہوا) ان سلاطین کے بارے میں بہت سی ذہنی گرہوں کو کھولتی ہے۔ "تاریخ اسلام میں سلطنت دہلی کا مقام" اور "سلطنت دہلی میں مذہب کی حیثیت" بھی مفید بحثیں ہیں۔ گو کہ اول کے متعلق ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کسی پختہ فکر عالم دین کی نظر سے گزر جاتی۔

کتاب میں سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان محمد بن تغلق کا تذکرہ دوسرے سلاطین کے تذکروں کی نسبت اس حیثیت سے ممتاز نظر آتا ہے کہ اس میں بحث ونظر کا عنصر زیادہ ہے۔ یہ دونوں سلطان اپنی کاسہ لیسیوں اور بعض اطوار کی بنا پر مذہبی طبقوں میں بدنام ہیں۔ مصنف نے کافی کوشش

ان کی صفائی کی گئی ہے۔

کتاب کی ایک خصوصیت اور قابلِ ذکر ہے کہ اس میں مشائخ و صوفیا سے ان سلاطین کے تعلقات کا بیان کافی تفصیل سے کیا گیا ہے ——— ہماری رائے ہے کہ اس کتاب سے لوگ مختلف پہلوؤں سے استفادہ کرسکیں گے۔

کتاب کا تعارف پروفیسر محمد حبیب صاحب کے قلم سے ہے۔ ہمیں اس کے متعلق بھی دو باتیں کہنی ہیں۔

۱۔ حبیب صاحب نے لکھا ہے کہ "رسول اکرمؐ نے وسیع و عریض ریاستوں کی تنظیم کے بارے میں چونکہ کوئی ہدایت نہیں چھوڑی تھی اس لیے بقول خلیق صاحب موضوع احادیث کے ذریعہ اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی۔" (صفحہ ۲) ہماری دانست میں خلیق صاحب نے "اس خلا" کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا اور اگر کہیں سے اُن کا یہ خیال ظاہر ہوتا ہے تو یقیناً صحیح نہیں ہے۔ جہاں تک تنظیمی جزئیات کا تعلق ہے؟ تو ان کا استقصاء تو کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ رہے اُصول تو ان کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خلاء نہیں چھوڑا، اور پھر آپ کے خلفاء راشدین نے اِن کے عملی انطباق سے اس کی گنجائش بھی ختم کردی کہ کسی شخص کو بادی النظر میں رسول اکرم کی ہدایات میں یہ خلاء نظر آئے۔ ہمارے خیال میں خلیق صاحب نے موضوع احادیث کے ذریعہ جس خلاء کو پُر کرنے کا ذکر کیا ہے وہ "اس دَور کے علماء میں اجتہادی صلاحیت کا خلاء" ہے نہ کہ کتاب و سنت کی تعلیمات میں وسیع و عریض سلطنتوں کی تنظیم کے متعلق ہدایات کا خلاء!

۲۔ ایک طرف تو حبیب صاحب کا ارشاد ہے کہ "اس زمانہ کی فضاء کچھ اس انداز سے ترتیب پا چکی تھی کہ مذہبی رسوم کی ادائیگی اگر ترکِ دُنیا اور خدمتِ خلق کے (ایک خاص) تصور سے عاری ہوتی تھی ...... تو ایسی مذہبیت بے اثر ہوتی تھی اور عوام اس کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے" دوسری طرف ... جیسے سلاطین کے متعلق جن کی زندگی میں مذہبیت زیادہ نظر آتی ہے، فرماتے ہیں کہ ان کا یہ مذہبی رنگ نمائشی تھا، حالانکہ ان کو وہ "گرگ باراں دیدہ" کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے "گرگ باراں دیدہ" تھے کہ زمانے کی فضا کو بھی نہ پہچانتے اور

نمائش کی ایک عبث ریاضت کرتے رہے؟

اس تضاد کے علاوہ ایک دوسرا تضاد حبیب صاحب کے فکر میں یہ ہو کہ جب وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہوئے ہیں کہ "لوگ ہمیشہ اپنی رائے دنیاوی تقاضوں کی بنیاد پر قائم کرتے رہے۔ انھوں نے (ان تقاضوں کی بنیاد پر) بادشاہ کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئے بغیر اپنی وفاداری کو برقرار رکھا" تو بلبن کے متعلق مذہبی نمائش کے اس فعل عبث کی ضرورت انھیں کیونکر محسوس ہوئی ہو؟ جبکہ یہ حقیقت ہو کہ اس نے "نہایت ہی پُرفتن دور میں لوگوں کو آرام و آسائش کی زندگی بہم پہونچائی تھی۔" (زیر تبصرہ کتاب ص۱۵۳)

ریا و نمائش کا مجرد امکان تو اپنی جگہ پر، مگر یہ حقیقت ہو کہ بلبن کی مذہبیت کی تفصیلات پر نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بہت مشکل ہو کہ یہ ایک نمائشی روپ اور "سیاسی حکمت عملی" کا ایک حصہ تھا، اگر اس کی مذہبیت اس کی زندگی تک محدود ہوتی تو یہ بات سوچی جا سکتی تھی۔ اور خاص "سیاسی حالات" کے پس منظر میں اس کی "توجیہ" کی جا سکتی تھی۔ مگر اس کے اس طرز عمل کی توجیہ نمائش سے کیسے کی جائے کہ

(۱) "اگر کبھی یہ سُن پاتا کہ شہزادہ محمد یا شہزادہ محمود سے ایک وقت کی نماز بھی فوت ہو گئی ہو یا نماز فجر کے وقت سوتے رہ گئے اور جماعت سے نماز ادا نہ کر پائے تو ایک مہینے تک اُن سے بات نہیں کرتا تھا۔"

(زیر تبصرہ کتاب ص ۱۵۰)

(۲) "اگر کسی شخص میں زہد و صلاح کی خوبیاں نہیں ہوتی تھیں تو کوئی اہم کام اسکے سپرد نہیں کرتا تھا۔"

(ایضاً ص۱۵۶)

اور کیونکر ایک نمائشی انسان سے اس اصلاحی جد و جہد کی توقع کی جا سکتی ہو کہ

"اُس نے شراب نوشی اور غیر مشروع حرکات کو اپنے ملک سے اُکھاڑ پھینکا۔" (ایضاً)

"اُس کے ڈر سے لہو و لعب کی تمنا لوگوں کے دل سے نکل گئی اور شراب و

شاہ کا نام تک بھی خانان و ملوک کی زبان پر آنا بند ہو گیا۔" (ص ۱۸۵)

اور مختصر یہ کہ

"اُس کے زمانہ میں تقویٰ اور پاکیزگی کو رواج ہوا" (ص ۱۵۶)

درحقیقت اگر ہم بلبن کی فواحش و منکرات میں ڈوبی ہوئی سابقہ زندگی اور سلطنت کے بعد بھی مصالح سیاسیہ میں اس کی سلط کارانہ روش کے درمیان اس کی زندگی کے اس مذہبی پہلو کی کوئی معقول توجیہ کر سکتے ہیں تو وہ صرف یہ ہو کہ یہ رسالت محمدی کا اعجاز تھا کہ جب الغ خاں جیسے افراد سلطان بلبن بن کر اُس مقام پر آئے جہاں سے ان کی زندگی کا اثر اُمت کے اخلاق و کردار پر پڑتا تو اُن کی "اَن مِنَ النّاس علیٰ دین ملوکھم" کے پیش نظر انھیں اپنی ذمہ داریوں کا اس طرح احساس ہو گیا کہ خود بھی بہی کیا اور اولاد کو بھی اسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی کہ

(۱) "ہر معاملہ کہ در امور جہانداری با بندگان خدا ورزد، چناں ورزد کہ بندگان خدا، از امر و امارت و قول و فعل و اوصاف و اخلاق او بر جادۂ شریعت و معاملت زندگانی ورزند و از فسق و فجور و معاصی و مآثم بطاعت و عبادات و حسنات و مبرات گرداتید و در دنیا سزاوار احسان و در عقبیٰ مستحق نجات گردند۔"

(کتاب ہذا ص ۱۵۵ بحوالہ تاریخ فیروز شاہی)

(۲) "فسق و فجور را در کام فاسقان و فاجران و عاصی و مذنباں تلخ تر از زہر سازد۔" (ص ۱۹۱)

لیکن جو لوگ تاریخ کی مادی توجیہہ ہی کے قائل ہیں، وہ شاید اس غیر مادی عامل کی کار فرمائیوں کو سمجھ نہیں سکتے، خواہ مادی توجیہہ پر انحصار کرنے سے کیسے ہی چند در چند تضاد اُن کی رائے میں نمایاں ہو جائیں۔

۲۔ بُستان المحدّثین

تالیف حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ ترجمہ مولانا عبدالسمیع دیوبندی
صفحات ۲۲۶ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ مجلد قیمت -/۵ روپے

ناشر:- نور محمد اصح المطابع و کارخانۂ تجارت کتب۔ آرام باغ۔ کراچی

مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی ایک صاحب نظر عالم دین ہیں۔ لغات القرآن (شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی) کے ۳ یا ۴ حصے جو انھوں نے تالیف کیے ہیں، اُن کے علم و نظر کی اچھی شہادت ہیں ــــ حدیث خاص طور پر ان کا فن ہو۔ اس فن شریف سے تعلق بھی ان کی ایک تصنیفی خدمت "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجۃ" کے نام سے اہل علم کی نظر میں تحسین پا چکی ہے۔ ابن ماجہ پر ان کا یہ دوسرا کام ہو جو بظاہر تو ابن ماجہؒ کی سوانح عمری اور حدیث سے متعلق اُن کی خدمات کا تفصیلی تعارف ہو مگر اس انداز سے ترتیب دی گئی ہو کہ ضمن میں تدوین حدیث کی پوری تاریخ مدوّن ہو گئی ہے۔

ابن ماجہ، ان کا وطن اور ماحول، ان کے معاصرین، اس زمانہ کے مراکز علوم دینیہ اور شیوخ و ائمہ حدیث۔ طلب علم میں ابن ماجہؒ کے اسفار، وہ شیوخ جن سے امام موصوف نے استفادہ کیا۔ اور ابن ماجہ کی تصنیفات و تالیفات ــــ یہ تقریباً سوا سو صفحے کے مباحث کا خلاصہ ہو جن کا خاتمہ سُنن ابن ماجہؒ کے تذکرہ پر ہوا ہے۔ یہاں سے فاضل مؤلف نے سُنن ابن ماجہ کے مقام پر روشنی ڈالنے کے لیے حدیث کی دینی حیثیت، اس کی کتابت اور اس کی تدوین کے مختلف مراحل و ادوار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور اس طرح کتاب سو صفحے اور آگے بڑھ گئی ہے۔ اس بیان میں عہد رسالت کے نوشتوں سے لے کر تیسری صدی ہجری کے مؤلفات حدیث سے گزرتے ہوئے، مؤلف پھر سنن ابن ماجہ پر پہونچ جاتے ہیں اور یہاں سے سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں شمار۔ ان صحاح میں اُس کا درجہ، اُس کی احادیث کی صحت کی بحث اور اس کی شروح تعلیقات وغیرہ کے بیان پر دس پندرہ صفحے ہیں۔

اخیر میں کتاب کا ایک نہایت جامع اشاریہ (انڈکس) ہو جو کچھ نہیں سو صفحات کی ضخامت کا ہو۔

امید ہو کہ اہل علم میں مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی یہ خدمت قدر کی نگاہ سے

دیکھی جائے گی اور منکرین حدیث کے بہت سے اعتراضات کی لغویت اس کتاب کے مباحث سے خود بخود ظاہر ہو جائے گی۔

۲۔ یہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی فارسی تالیف (بستان المحدثین) کا ترجمہ ہے جو آج سے ۲۵ سال قبل کا کیا ہوا ہے۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے یہ کتاب اس ضرورت کے پیش نظر مرتب فرمائی تھی کہ دینی لٹریچر میں کتب احادیث کے حوالے چونکہ بکثرت آتے ہیں اور عوام ان کتابوں سے کم آشنا ہوتے ہیں۔ اس لیے تمام ضروری کتابوں کا مختصر تعارف ہو جائے ـــــــ اس نقطۂ نظر سے یہ بڑی مفید اور کامیاب کتاب ہے۔ کتابوں کے ساتھ ان کے مؤلفین کا تعارف بھی قدرتی طور پر آگیا ہے ـــ جن لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے ان کی رعایت سے اس کا بھی پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ کتابوں اور ناموں کا صحیح تلفظ ظاہر کیا جائے۔

حیات امام احمد بن حنبلؒ

تالیف پروفیسر محمد ابوزہرہ (مصری) ترجمہ رئیس احمد جعفری۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۸۰۰ مجلد قیمت دس روپے۔

شائع کردہ :- المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی دو حیثیتوں سے مسلمانوں میں عام طور پر معروف ہیں، ایک یہ کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں، دوسرے یہ کہ حق کے لیے انھوں نے تعذیب و عقوبت کے ایک طویل اور زہرہ گداز ابتلار کا ایسی پامردی سے مقابلہ کیا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

انہی امام احمد بن حنبلؒ کی مفصل سوانحعمری ہے جو مصر کے مشہور فاضل اور مصنف پروفیسر محمد ابوزہرہ نے ترتیب دی ہے اور اردو میں اسے جناب رئیس احمد جعفری نے منتقل کیا ہے۔ مولانا محمد حنیف بھوجیانی مالک مکتبۂ سلفیہ لاہور نے اسے بڑی آن بان کے ساتھ اپنے مکتبہ سے شائع کیا ہے، کاغذ سفید چکنا اور کتابت و طباعت کا معیار اعلیٰ ہے۔

کتاب بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں امام صاحب کی زندگی اور حالات و سوانح ہیں۔ فتنۂ "خلق قرآن" کے سلسلے میں آپکے ابتلاء کی تفصیلات ہیں۔ آپ کی معیشت اور

ذرائع معیشت کا بیان ہے۔ آپ کے علمی اور اخلاقی صفات ہیں، آپ کے خاص خاص شیوخ و اساتذہ کا تذکرہ ہے۔ آپ کے معاصرین اور فکری ماحول کا بیان ہے ــــ دوسرا حصہ امام صاحب کے علمی کاموں اور اس کام کی خصوصیات پر مشتمل ہے۔ اس ذیل میں آپ کے بعض افکار و آرا، حدیث اور فقہ کی خدمت۔ پھر آپ کی فقہ کی نقل و اشاعت اور اس کے ناقلین و ناشرین، آپ کی فقہ میں مختلف اقوال و روایات کی کثرت کے اسباب و وجوہ، آپ کی فقہ کے عمومی اوصاف۔ آپ کے اصول استنباط، ادلّہ اربعہ کے باب میں آپ کا مسلک اور اسی ذیل کے دیگر مباحث ہیں۔

اُردو میں امام احمد کی مفصل اور جامع سوانح عمری کی جو کمی تھی وہ اس ترجمے سے پوری ہو جاتی ہے۔ ترجمہ اردو کے ایک خاصے مشاق مصنف کے قلم سے ہے بڑی جلدی میں کیا گیا ہے خصوصیت کے متعدد مقامات پر الفاظ اور جملے نظر ثانی کے محتاج رہ گئے ہیں۔ مثلاً ص۱۵ پر

"والد کی وفات ان کی ولادت کے بعد ہی واقع ہوگئی تھی جبکہ وہ تیس سال کے ابھی جوان عمر تھے۔"

ان خط کشیدہ الفاظ نے عبارت کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ یوں بھی ان الفاظ کی ترتیب میں کھلا ہوا جھول ہے۔ صفحہ ۱۶۵ پر ــ

"ایک مرتبہ امام احمد نے کسی موقع پر امام ابوحنیفہ کی فقہ سے اختلاف منہاج کے باعث عدم توافق کا اظہار کیا۔" ــــــ کس قدر ثقیل اردو ہے۔

ص۹۶ پر ــ "بہت زیادہ نکتہ آفرینیاں پیدا کیں" ــــ "پیدا" بالکل زائد ہے۔ اسی طرح اور بھی بعض الفاظ اور جملے ایسے نظر میں آتے ہیں اور کھٹکتے ہیں۔ ص۱۲۳ پر ایک جملہ نقطے دے کر نامکمل چھوڑ دیا گیا ہے۔

پروفیسر ابوزہرہ نے ہمارے علم کی حد تک ایک نئی بات امام احمدؒ کے ابتلاء کے باب میں پیش کی ہے کہ یہ (خلق قرآن کے مسئلہ میں) امام صاحب کی تعذیب و اذیت کی تمام تر ذمہ داری قاضی احمد بن ابی داؤد (معتزلی) پر عائد ہوتی ہے۔ مامون بالکل بری الذمہ ہے۔ انھوں نے اس بات کو متعدد دلائل و قرائن سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ــــ مصنف نے یہ بھی رائے

ظاہر کی ہو کہ مسئلہ میں معتزلہ کا موقف ہی صحیح تھا اور اس پر بھی انھوں نے بحث کی ہو ــــــ یہ مسئلہ پیدا کیونکر ہوا؟ اس کا پس منظر بھی مصنف نے تفصیل کے ساتھ دکھایا ہو۔

معتزلہ کے وجود اور حکومت میں ان کے اثر و نفوذ کے بارے میں مصنف کا خیال عام خیال کے برعکس یہ ہے کہ

"اس دور میں معتزلہ کا وجود ایک ناگزیر اور لابدی چیز تھی، یہی زمانہ تھا جب زندیق (گمراہ) لوگ پیدا ہوئے اور اُبھرے، یہ لوگ ایسے افکار و آرا کا اظہار کرتے تھے جو اسلامی سوسائٹی کے لیے فتنہ و فساد کے موجب تھے۔ یہ ایسی سازشیں کرتے تھے جو اسلام کے لیے تباہ کن تھیں اور جن کی بنیاد مسلمانوں کے لیے کید و فریب اور اسلام کے لیے استخفاف پر تھی۔ .... یہ رنگ دیکھ کر خلفاء عباسیہ نے ایک طرف تو تلوار میان سے نکالی اور زنادقہ پر پل پڑے، اور دوسری طرف علماء کو اس طرف آمادہ کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ زیادہ تر معتزلہ ہی اس کے لیے میدان میں اُترے۔ اور انھوں نے ان کے دلائل کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ..... اُن کے یہ کارنامے دیکھ کر خلفاء نے بھی انھیں اپنا مقرب بارگاہ بنایا ...." الخ ص ۱۹۴

لیکن اس کے ساتھ ہی مصنف نے اس آغاز کا جو انجام بتایا ہو وہ بڑا سبق آموز ہو اور ہمیشہ کے لیے ایک آگاہی ہو ــــــ لکھا ہو کہ

"زنادقہ اور مجوس وغیرہ کا ردّ و مقابلہ جب اس امر کا موجب ہوا کہ معتزلہ بزعم خویش اسلام کی طرف سے دفاع اور اس کے اسلامی (؟) عقائد ثابت کرنے کے لیے استدلال کا ایسا طریقہ اختیار کریں جو بالکل نیا ہو، اس کا نشان سلف صالح، صحابہ اور تابعین کے یہاں کہیں نہیں ملتا تھا، انھوں نے فلسفہ کے اسلحہ سے اپنے آپ کو مسلح کیا اور ہجوم و دفاع کے سلسلہ میں ان اسلحہ کا بے محابا استعمال شروع کر دیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ حریف مقابل کے افکار و خیالات خود ان میں سرایت کر گئے" ص ۱۹۴-۱۹۵

اس کتاب کا دوسرا حصہ خاص طور پر قابل استفادہ ہو۔ ہم اپنے عربی مدارس کے منتہ

طلباء اور نئے فضلاء سے خاص طور پر اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

رہبر کامل

از مولانا عبدالمجید اصلاحی، ۱۰۴ صفحات، چھوٹا کتابی سائز، قیمت ۱۵ آنے
پتہ:۔ مکتبۃ الاسرار، کوئرہ گھنی۔ سورہن۔ اعظم گڈھ

یہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر ہے۔ اسلامی مکاتب[1] کے طلبہ درجہ چہارم کے لیے لکھی گئی ہے، انداز بھی ریڈروں کا سا ہے، ہمارے خیال میں اس کے ذریعہ طلبہ کو سیرت پاک سے اچھی خاصی واقفیت پیدا ہو سکے گی۔

طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۴۸ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ بہتر۔
پتہ:۔ مکتبہ دارالعلوم، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

یہ مولانا موصوف کا ایک مقالہ ہے جو پانچ برس پیشتر دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا، اس وقت یہ الفرقان میں شائع بھی ہوا تھا، مکتبہ ندوۃ العلماء نے اس کو اب الگ سے شائع کیا ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ اسے ہم آج کے دور میں طلبائے علم دین کے لیے ایک بہترین پیغام سمجھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ طلباء کے ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ پہنچایا جائے۔

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، صفحات ۴۰
پتہ:۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

یہ مولانا کا ایک عربی مضمون کا ترجمہ ہے جو حال ہی میں الفرقان میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کی تاثیر اس سے ظاہر ہے کہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کی تاسیس کا یہی محرک ہوا۔ مجلس کی طرف سے یہ الگ شائع کیا گیا ہے۔ آخر میں مجلس کا دستور العمل بھی دیا گیا ہے۔

---

[1] کتاب کی لوح پر مکاتیب لکھا ہوا ہے جو غلط ہے۔

ماہنامہ نقش دیوبند زیر ادارت مولانا انظر شاہ کشمیری۔ صفحات ۴۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ گلیز۔ سالانہ چندہ ۵/- ۔ فی پرچہ -/۱۰/-

پتہ:- دفتر نقش، دیوبند

اس ماہنامہ کے مدیر حضرت مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند ارجمند اور دارالعلوم دیوبند کے ایک نوجوان فاضل اور استاذ ہیں۔ چار شمارے آچکے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ نقش کے فاضل مدیر اپنے اس نقش کو چمکانے کے پوری طرح اہل ہیں۔ اور خوش قسمتی سے انھوں نے شروع ہی سے چند اچھے لکھنے والوں کا تعاون بھی حاصل کر لیا ہے۔ پیش نظر چوتھے شمارے میں مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کے "جہنم کے دو سانس" کی تیسری اور آخری قسط ہے۔ باقی عزام پاشا مرحوم کے ایک مضمون کا ترجمہ۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا مضمون "اسلام اور اخلاق" خود مدیر رسالہ کا مضمون "آخرت کی پہلی منزل" اور دوسرے مضامین۔

"آخرت کی پہلی منزل" مولانا گیلانی کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس سے جہاں بہت سے لوگ لطف اندوز بھی ہوں گے وہاں بہت سے الجھیں گے بھی۔ خود مولانا گیلانی کے ساتھ بھی لوگوں کا معاملہ یہی تھا۔ اس لیے شاید یہ بہتر ہوگا کہ طرز تحریر میں ان کی تقلید کی کوشش نہ کی جائے۔ بہرحال ہم نقش کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس سے ملت اسلامیہ کو نفع پہنچے گا۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اسی کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے
لیکن یہ صرف ایک بول ہی نہیں ہے، بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، یعنی اس
اس بات کا عہد ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی
اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال پر جئیں گے اور مریں گے
جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی
زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا
عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

فاطر السماوات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ
توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارہ الفرقان

مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

کتب خانہ الفرقان کی مطبوعات

اسلام کیا ہے؟

تالیف مولانا نعمانی

اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

اس کتاب کے دیکھنے والوں کا عام احساس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو [illegible] مقبولیت عطا فرمائی ہے پچھلے چند سالوں میں تقریباً تیس ہزار اردو میں اور کئی ہزار ہندی میں شائع ہو چکے ہیں

اسلام کے متعلق بنیادی واقفیت حاصل کرنے کے لیے نہ صرف عام مسلمان اور [illegible] کافی ہے بلکہ اس کا مطالعہ [illegible] ان شاء اللہ کافی ہے زبان نہایت آسان ہونے کے ساتھ نہایت شیریں اور دلنشین ہے کتابت طباعت اعلیٰ اور معیاری قسم اول کاغذ [illegible] مجلد [illegible] قسم دوم کاغذ [illegible] غیر مجلد [illegible]

ہندی اڈیشن کاغذ اعلیٰ مجلد قیمت تین روپے [illegible]

آپ حج کیسے کریں؟

حج و زیارت کے متعلق اردو زبان میں بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب جو مولانا نعمانی اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی گویا مشترک [illegible] ہے اپنی [illegible] ہے کہ اس کے مطالعہ سے حج کا شوق اور ذوق [illegible] اور دل میں [illegible] جذبہ اور ذوق و شوق [illegible] وہ [illegible] ہیں جو دراصل حج کی روح اور جان ہیں۔

کاغذ مجلد ... قیمت مجلد .... [illegible]

آسان حج | یہ آسان زبان میں "آپ حج کیسے کریں" کا خلاصہ ہے جسے کم تعلیم والے حضرات جو صرف آسان اردو پڑھ سکتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں

طباعت معیاری .... قیمت ... صرف [illegible]

برکاتِ رمضان

از افادات مولانا نعمانی

اسلام کے اہم رکن صوم یعنی روزہ اور ماہ رمضان اور اس کے خاص اعمال و وظائف تراویح و اعتکاف وغیرہ کے فضائل و برکات اور ان کی روحانی تاثیرات کا نہایت مؤثر اور دلنشین انداز بیان اور حکیم اُمت حضرت شاہ ولی اللہ کے طرز پر اس سلسلہ کی احادیث کی ایسی تشریح جس سے دل بھی متاثر ہو اور دماغ بھی مطمئن قیمت [illegible]

نماز کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ نماز کے مقام اور اس کی روح و حقیقت سے واقف ہونے کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ ضرور فرمائیں "کلمہ طیبہ کی حقیقت" کی طرح یہ بھی عقل و دل اور دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتا ہے

قیمت .... [illegible]

کلمہ طیبہ کی حقیقت

از افادات مولانا نعمانی

اس میں دین اسلام کے کلمۂ دعوت "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ ایسے مؤثر انداز میں کی گئی ہے کہ مطالعہ سے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور دماغ کے ساتھ دل بھی متاثر ہوتا ہے۔

قیمت ... [illegible]

قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ

قیمت [illegible]

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین کے الزامات

قیمت [illegible]

معرکۃ القلم

اکابر دیوبند کی طرف سے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے سنگین تکفیری الزامات کا آخری تحقیقی جواب .... قیمت [illegible]

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

حضرت سید سلیمان ندوی کے قلم سے [illegible] اور مبسوط مقدمہ .... [illegible]

ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ

مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی قیمت [illegible]

امام ولی اللہ دہلویؒ

از مولانا عبید اللہ سندھیؒ .... قیمت [illegible]

انیسِ نسواں

از محترمہ بیگم سید [illegible] صاحب

مسلمان خواتین خاص کر تعلیم یافتہ بہنوں میں دین کی طرف سے جو بے فکری اور آخرت کی طرف سے جو غفلت تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کی اصلاح اور انسداد کے لیے ایک محترم بہن نے یہ رسالہ لکھا ہے۔ شروع میں مولانا نعمانی کے قلم سے پیش لفظ ہے .... قیمت [illegible]

ہندستان و پاکستان سے		غیر ممالک سے
سالانہ چندہ (سکۂ ہندستان) ۔۔ صہ ر	ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ	سالانہ چندہ ۔۔۔ ۱۰ شلنگ
سالانہ چندہ (سکۂ پاکستان) ۔۔ ئے ر		اعزازی خریداروں سے
ششماہی ۔۔۔ ۔۔۔ سے	(فی کاپی آٹھ آنے)	سالانہ ۔۔۔ ۔۔۔ ۱۵ شلنگ

جلد ۲۷ | بابتہ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق نومبر ۱۹۵۹ء | شمارہ ۴

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہے تو

اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہو۔ براہ کرم آئندہ کیلئے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ اگلا رسالہ بصیغۂ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ وی پی میں آپکے کچھ آنے زائد صرف ہونگے۔

اور رسالہ دیر سے بھی پہونچے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۲۵ نومبر تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستان کے خریدار:۔ اپنا چندہ سکریٹری ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں، اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں

تاریخ اشاعت:۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی یکم کو روانہ کر دیا جاتا ہو۔ اگر ۱۵ تک بھی کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں۔ ان کی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے اسکے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں —

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:۔

دفتر الفرقان، کچہری روڈ، لکھنؤ

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگاہِ اولیں

قوموں کے اچھے مستقبل کی سب سے پہلی شرط ان میں اجتماعی نفع و ضرر کا شعور ہے۔ اس پیمانے سے جب ہم ہندوستانی مسلمانوں کی روش کو ناپتے ہیں، تو سچ یہ ہے کہ بڑی یاس طاری ہو جاتی ہے۔ ہم برسوں سے اس گھٹن میں مبتلا ہیں اور اس کے اثرات گاہے گاہے قلم کی زبان پر بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں کہ آخر کب تک ہندوستان کی اُمتِ مسلمہ اس شعور سے بے بہرہ رہے گی اور کیونکر یہ شب و روز بدلیں گے جن میں اچھے بُرے کی تمیز کے چند لمحات تک میسر نہیں آتے؟۔

ایک تازہ واقعہ جس نے اس درد میں ایک نئی ٹیس پیدا کر دی ہے، یو۔پی کے حالیہ کارپوریشن الکشن ہیں۔ یہ الکشن یوں تو ریاست کے پانچ بڑے شہروں میں ہوئے، مگر ہمارے سامنے مخصوص لکھنؤ کا الکشن ہے۔ اسی کی تفصیلات سے ہمیں اتنی واقفیت حاصل ہو سکی ہے جس سے ہمارے سامنے اس الکشن میں مقامی مسلم آبادی کے رویہ کی تصویر واضح ہو سکے، اور ہم کوئی تبصرہ کر سکیں ــــ اس الکشن میں مسلمانوں میں اجتماعی شعور و کردار کے فقدان نے بالکل غیر متوقع طور پر کامیابی کا سہرا جن سنگھ کے سر باندھ دیا، انتخابی نامزدگیوں سے پہلے اس بات کے دور دور تک بھی امکانات نہیں تھے کہ لکھنؤ میں جن سنگھ کو اکثریت حاصل ہو گی۔ لیکن نامزدگیوں کا اعلان ہونے پر پہلی بار یہ خطرہ سامنے آیا کہ جن سنگھ کو اکثریت حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ بیشتر انتخابی حلقوں سے کئی کئی مسلمان امیدواروں کے نام سامنے آئے، یہ خطرے کی پہلی گھنٹی تھی لیکن اتنی صاف تھی کہ ہر شخص جو کان رکھتا ہو اس کی آواز سن سکتا تھا اور مسلمانوں کی عقل و بصیرت کے آنکھ کان اگر کھلے ہوئے ہوتے تو وہ اس خطرے کا سدباب کر سکتے تھے، لیکن خطرہ جن دماغوں میں پیدا ہوا تھا اسی بنیاد پر پیدا ہوا تھا کہ عام مسلمانوں میں اجتماعی فہم و شعور بالکل ناپید ہے اور اسی حقیقت نے اس خطرہ کو اس دن واقعہ بنا کر سامنے کھڑا کر دیا جس دن بیلٹ بکس

کھول کر ووٹ شمار کیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شمالی ہند کی ہندو آبادی کی غالب اکثریت اس وقت دو کیمپوں میں تقسیم ہے ایک کانگریس۔ دوسرا جن سنگھ۔ اس مقابلہ میں اگرچہ دیہاتوں میں جن سنگھ کا اثر کانگریس کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور اسی لیے مجموعی لحاظ سے کانگریس کا پلہ بہت بھاری ہے۔ مگر شہروں میں جن سنگھ کا اثر اچھا خاصا ہے۔ پھر خاص لکھنؤ کے بارے میں تو مسلمانانِ لکھنؤ اس حقیقتِ حال سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جن سنگھ یہاں اتنا اثر پیدا کر سکی ہے کہ پچھلے دنوں بیچ شہر میں واقع ہونے والے ایک مسلم ادارے کے خلاف بالکل بے سر پیر کے چند الزامات گھڑ کرکے وہ ایک عام ہڑتال کرانے میں کامیاب ہو گئی، درانحالیکہ اہلِ شہر پر یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ یہ الزامات من گھڑت ہیں۔ ایسی صورت میں یہ بات دو اور دو چار کی طرح واضح تھی کہ اس کارپوریشن الکشن میں ہندو ووٹروں کی ایک بڑی تعداد جن سنگھی امیدواروں کو سپورٹ کرے گی۔ اور یہ بھی معلوم تھا۔ اور اخباری نمائندوں کے بیانات سے انتخابی جدوجہد کے دوران میں بھی برابر معلوم ہوتا رہا تھا کہ اس معرکے میں سب سے زیادہ منظم طاقت جن سنگھ کی ہے۔ گویا حالات بھی جن سنگھ کے موافق تھے اور اس میں موافق حالات سے فائدہ اٹھانے کی (بھی) پوری پوری اہلیت تھی۔

اب وہ کون طاقت ہو سکتی تھی جو جن سنگھ کو اکثریت میں آنے سے روک سکے؟ صرف مسلمان ووٹروں کی یکجہتی کی طاقت! لیکن یا تو لکھنؤ کے مسلمان اس فکر سے بے نیاز رہے کہ جن سنگھ کی کامیابی کو روکنا اُن کا اولین ہدف ہونا چاہیے، یا اگر اُن کو اس چیز سے دلچسپی تھی بھی تو اتنی بات تو یقینی ہے کہ انھوں نے اس غور و فکر کی زحمت بالکل گوارا نہیں کی کہ جن سنگھ کی کامیابی کے امکانات ختم کرنے کا واحد راستہ کون ہو سکتا ہے؟ اس کا واحد راستہ صرف اور صرف یہ تھا کہ مسلمان جن سنگھ کے مقابلہ کی کسی ایک غیر فرقہ پرست پارٹی کو جس کو ہندوؤں کی بھی ہر وارڈ میں کچھ حمایت حاصل ہو سکتی، اپنی حمایت کے لیے منتخب کر لیتے، سارے شہر کے مسلمان اور اگر ایک رائے نہیں ہو سکتے تھے تو ہر وارڈ کے مسلمان ہی ایک رائے ہو کر کسی ایسی پارٹی کے امیدواروں کی حمایت کا فیصلہ کر لیتے، حتیٰ کہ اگر یہ بھی ممکن نہیں تھا اور وہ کسی پارٹی کے کنڈیڈیٹوں سے دلچسپی لینے کے بجائے صرف مسلم کنڈیڈیٹوں سے دلچسپی رکھتے تھے تو آخری درجہ کی بات یہ تھی کہ کوئی سے بھی دو مسلمان کنڈیڈیٹ طے کرکے متفقہ طور پر انھیں کو ووٹ دیتے۔ بہرحال

یکجہتی شرط تھی۔ جن سنگھ کی کامیابی کے خطرناک سدباب کا واحد راستہ تھی اور اس کی درجہ بدرجہ یہ تین صورتیں ہو سکتی تھیں۔ مگر سر پکڑ کر رونے کو جی چاہتا ہو فہم و شعور سے دشمنی کا یہ تماشہ دیکھ کر کہ جس طرح ہر ہر وارڈ میں کھڑے ہونے والے مسلمانوں نے کئی کئی کی تعداد میں کھڑے ہو کر اعزاز اور کرسی کے شوق میں مسلمانوں کے مفاد کو داؤں پر لگا دیا تھا، ٹھیک اسی طرح مسلم ووٹروں نے بھی ان میں سے ہر ایک کے شوق ممبری کو لبیک کہتے ہوئے اپنے ووٹوں کی طاقت کو پارہ پارہ کر لیا۔ جتنے بھی مسلمان امیدوار کسی حلقے سے کھڑے ہو گئے اُن میں سے ہر ایک کو تھوڑے تھوڑے بہت ووٹ دینے والے مل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ مسلمان امیدوار ہی جتنے جیت سکتے تھے جیت سکے اور نہ کانگرس اور پرجا سوشلسٹ پارٹی میں سے کوئی پارٹی ہی اکثریت حاصل کر سکی جسے مسلمان جن سنگھ کے مقابلے میں اپنڈ کر سکتے تھے ــــــ پھر غضب پر غضب یہ ہوا کہ ہر حلقے سے دو نمائندے منتخب کرنے کے لیے ہر ووٹر کو جو دو ووٹوں کا حق ملا تھا بہت سے مسلم امیدواروں نے اس کے بجائے اگر خود غرضی اور حرص میں آ کر اپنے ووٹروں سے یہ خواہش کی کہ وہ تنہا انہی کے حق میں ووٹ ڈال کر اپنا دوسرا ووٹ بیکار کر دیں تو ووٹران باشعور نے اُن کی اس احمقانہ فرمائش پر بھی لبیک کہا اور یہی کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتنے ہی کانگرسی غیر کانگرسی، مسلم یا غیر مسلم امیدوار جو ان دو ووٹوں کو پا لینے کی صورت میں قطعی طور پر کامیاب ہو سکتے تھے جن سنگھ کے مقابلہ میں ناکام ہو کر رہ گئے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ اب کی خالص الکشن اور وہ بھی مقامی سیاست کی کیا ام کہانی الفرقان نے خلاف عادت اور خلاف موضوع سنانی شروع کر دی ہو! ــــ جی نہیں، الفرقان کو نہ الکشن بازی سے کوئی دلچسپی پیدا ہوئی ہو اور نہ مقامی سیاست کو اس کے دائرۂ فکر و نظر کو کوئی تعلق، ہمارا موضوع فکر اس وقت بھی صرف مسلمانانِ ہند کے فہم و شعور کا مسئلہ ہو۔ مسائل کی واقعی اہمیت اور ان کے طول و عرض کو سمجھنے کے لیے جزئی واقعات و مشاہدات بہت مفید ثابت ہوا کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے شہر کے اس الکشنی واقعہ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا اور آپ کے سامنے بھی محض اسی طور سے پیش کیا ہو۔ یہ واقعہ اپنی ظاہری تفصیلات اور اپنے عواقب و نتائج کی حد تک بیشک ایک مقامی واقعہ ہو، مگر جب ہم اس کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں کہ اس میں متعلقہ مسلمانوں کے فہم و شعور کی کیا کیفیت

نظر آتی ہو؟ تو اس آئینہ میں ہمارے سامنے صرف ایک مقام کے مسلمانوں کے نہیں، قریب قریب پورے ملک کے مسلمانوں کے فہم وشعور کی تصویر واضح ہوجاتی ہو، یہ ایک ایسے مقام کا واقعہ ہو جہاں کے مسلمان نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے، زیادہ باخبر اور زیادہ باشعور ہیں۔ ان کا جب یہ حال ہو تو از خود دوسرے مقامات کے مسلمانوں کے حال کا اندازہ کیا جاسکتا ہو ــــــ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ یہ ایک مقامی واقعہ عمومی طور پر پورے ملک کے مسلمانوں کی شعوری کیفیت کا آئینہ دار ہو۔

اگر ہمارا یہ قیاس صحیح ہو تو پھر ہم اس سے آگے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے مستقبل کی خاطر لکھنؤ کی اس مثال سے سبق لینا چاہیے۔ انھیں دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ ملک میں اس وقت فرقہ پرست اور غیر فرقہ پرست پارٹیوں کی طاقت کا توازن کیا ہو؟ فرقہ پرست پارٹیاں اگر کامیاب ہوسکتی ہیں تو کیونکر کامیاب ہوسکتی ہیں؟ وہ کون سی غیر فرقہ پرست پارٹی ہو جو اٹھتی ہوئی فرقہ پرست طاقتوں کے مقابلہ میں سنگ گراں ثابت ہوسکے اور اس سے اگر اگر فرقہ پرست طاقتیں چکناچور بھی نہ ہوسکیں تو کم از کم ایک عرصہ تک ان کے لیے کامیابی کی راہ تو نہ کھل سکے، نیز یہ کہ ان کی (مسلمانوں کی) جو کچھ عددی طاقت ہو وہ کس طرح استعمال ہوکر فرقہ پرست محاذ کے خلاف زیادہ سے زیادہ کارآمد ہوسکتی ہو؟ ــــ یہ سب باتیں آج ہی سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرلینے کی ہیں، کیونکہ ان کا ہمارے مستقبل سے براہ راست تعلق ہو۔ فرقہ پرست طاقتوں کے برسراقتدار آنے سے جو زد ہم مسلمانوں پر پڑے گی، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کسی دوسرے پر نہیں پڑے گی!

پورے ملک کے کردار کی تصویر!

ہم نے اوپر لکھنؤ کے کارپوریشن الکشن کا جائزہ اس حیثیت سے لیا تھا کہ اس آئینہ میں مسلمانوں کی شعوری کیفیت کی کیا تصویر دکھائی دیتی ہو۔ لیکن اس چھوٹے سے آئینہ کو جب ہم دوسرے پہلو سے دیکھتے ہیں تو ایک اور تصویر اس میں روشن ہوجاتی ہو۔ اور وہ ہے ــــــ پورے ملک کے کردار کی تصویر!۔

اپنے نزدیک بہت کچھ اندازہ تھا مگر اس حد تک اندازہ اپنے ذاتی اندازہ میں کافی مبالغہ کرنے کے بعد بھی ہم نہیں کرسکتے تھے کہ پورا ملک نفاق کے حمام میں بالکل ننگا ہے، اس الکشن کے بارے

میں ایک تاثر جو متفقہ طور پر سننے میں آیا یہ تھا کہ (شاید جن سنگھ کے لوگ تو بڑی حد تک مستثنیٰ رہے ہوں اور ان کی ووٹ شماری سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے) باقی عام حال یہ تھا کہ ایک ہی پارٹی کے دو امیدوار ہیں لیکن ہر ایک کو بس اپنی فکر ہو، ظاہر میں وہ دونوں ساتھی ہیں اور ہر ایک اپنے ساتھ دوسرے کے لیے بھی کوشاں ہو، مگر اندر اندر اعیار سے مجبوتے اور خوشامدیں ہو رہی ہیں کہ اپنوں کا ایک ووٹ مجھے دلوا دو، دوسرا تم لو' اور اس کے بدلے میں اسی طرح کی پیش کش اپنی طرف سے ہو رہی ہو. جن لوگوں کے دونوں ووٹ اپنی پارٹی کے لیے نہیں مل سکتے اُن کی منتیں کی جا رہی ہیں کہ بس دوسرا ووٹ مجھے دے دو —— یہ نفاق کی ایسی فضا چند دن چاروں طرف رہی کہ ہر صاحبِ ضمیر کا دم گھٹ گھٹ کر رہ گیا ہوگا! —— برسوں کے دیکھے بھالے اور برتے ہوئے بعض لوگ بڑی بڑی اچھی شہرتوں والے (اور صحیح شہرتوں والے) بعض لوگ جنھیں بہت سوں نے بلا کسی رشتہ ناتے کے صرف حسنِ ظن ہی کی بنا پر ووٹ دیا. اُن کے متعلق اسی دن شام کو کھلا اور اگلے دن ووٹ شماری سے بھی معلوم ہو گیا کہ انھوں نے اپنے ساتھی کے ساتھ دغا کی. اور دوسری ساری شہرتیں ان کی برحق، مگر نفاق کے حمام میں وہ بھی ننگے ہی دیکھے گئے.

اللہ اکبر! کیا اخلاقی حال ہو ملک کا —— مگر ملک کے ناخداؤں کے نزدیک کسی سوسائٹی کا یہ اولین اور بنیادی مسئلہ اس سے زیادہ کا ہرگز مستحق نہیں کہ بس دو چار آنسو اس پر بہا دیے جائیں اور کچھ مذمت اور کچھ نصیحت کر دی جائے.

الکشن کے موجودہ طریقہ پر ایک تنقیدی آواز

سروودے لیڈر شری جے پرکاش نرائن نے الکشن کے موجودہ طریقہ پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"الکشن کا موجودہ طریقہ لوگوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنے اور آپس میں نفرت پھیلانے کا ذمہ دار ہے. اگر ہم ایک ایسی سوسائٹی بنانا چاہتے ہیں جس کی بنیاد آپس میں اشتراک، محبت اور مفاہمت ہو تو الکشن کے موجودہ طریقہ کو بدلنا ضروری ہے."

حقیقت یہ ہے کہ الکشن کا موجودہ طریقہ ہماری بگڑی ہوئی سوسائٹی کو اور زیادہ بگاڑنے

کا ذمہ دار ثابت ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو یہ منافرت اور افتراق پھیلاتا ہو، جس کا ذکر جے پرکاش جی نے کیا ہے، دوسری طرف یہ سوسائٹی میں نفاق کی پرورش کرتا اور کیرکٹر کی جڑیں ہلا دیتا ہو تیسری طرف شرافت وقار اور شہری آداب کی اس بری طرح پامالی اس کے طفیل میں ہوتی ہے کہ الامان الحفیظ!

اگر کوئی بڑی اصلاح اس طریقے میں ممکن نہ ہو تو ہماری سوسائٹی کے موجودہ حالات میں کم از کم یہ تو ضروری ہو کہ کچھ مؤثر اصلاحی قوانین اس بارے میں نہایت سختی کے ساتھ نافذ کیے جائیں۔ اس طریقہ میں ایک لحاظ سے بڑی جمہوریت پروری ہے۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ بعض لحاظ سے یہ جمہور کے لیے کتنا زہر ثابت ہو رہا ہے۔ آخر کچھ تدارک تو اس کا ہونا چاہیے!

آج کی دُنیا کے حقائق

شریمتی اندرا گاندھی کی ایک روایت:-

"صبح جب میں ڈالٹن گنج کے ہوائی اڈہ پر اتری تو عوام میں سے کچھ لوگ ہوائی جہاز کو کوئی دیوتا ایسی چیز سمجھ کر جیسے اس کی پوجا کرنے لگے۔"

اس کے بعد وہ فرماتی ہیں کہ

"اگر ہندوستان کو ترقی کرنا ہے تو اس کے باشندوں کو ایسا غیر سائنسی اور توہم پرستانہ رویہ ترک کرنا پڑے گا، اور آج کی دنیا کے حقائق کو سمجھنا ہوگا۔"

لوگوں کی نظر میں یہ آج کے حقائق ہیں مگر ذرا یاد کیجئے، قرآن آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے کس انداز میں اس "غیر سائنسی" اور "توہم پرستانہ" رویہ کی مذمت کر چکا ہے:-

أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ!

کیا توہین ہے، انسانیت کی۔ کہ جو چیز تم خود اپنے ہاتھ سے تراشتے ہو اسی کو معبود بنا لیتے ہو۔

لوگ کہتے ہیں کہ قرآن بھی ایک فرسودہ کتاب ہے جس کی تعلیمات آج کی دنیا سے جوڑ نہیں کھاتیں۔ مگر یہ وہی قرآن ہو کہ جن چیزوں کو آج کے لوگ "آج کے حقائق" سمجھ رہے ہیں قرآن انھیں ڈیڑھ ہزار برس پہلے دنیا پر منکشف کر چکا ہے۔

معذرت

اس شمارہ میں "حدیث پرویز" کی چوتھی قسط جانا چاہیے تھی، مگر بعض اعذار کی وجہ سے تیار نہیں ہو سکی۔ انشاء اللہ آئندہ شمارہ میں اس کی اشاعت ہو سکے گی۔

جن عوارض کی وجہ سے مذکورہ مضمون کی قسط تیار نہیں ہو سکی، وہی اس شمارے کی اشاعت میں تاخیر کا بھی باعث ہوئے ہیں ہم اپنے ناظرین سے اس طول زحمت انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں ساتھ ہی یہ درخواست بھی ہے کہ جو حضرات شکایتی خط روانہ فرما چکے ہوں وہ رسالہ ملنے پر ایک کارڈ لکھنے کی زحمت اور گوارا فرمائیں، تاکہ دفتر سے بے ضرورت دوسرا پرچہ روانہ نہ ہو جائے۔

ضروری بات - اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا پرچہ شکایتی خط ملنے پر فوراً بھیج دیا جائے تو ضروری ہوگا کہ شکایت کے ساتھ ۱۲ آنے پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھی ارسال فرمایا کریں اس کے بغیر رسالہ کی روانگی صرف مقررہ تاریخ اشاعت ہی پر ہو سکتی ہے ——— ادارہ

معارف الحدیث

(مسلسل)

ناپاکی سے عذابِ قبر:-

(۲) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ (وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ لَا يَسْتَنْزِهُ) مِنَ الْبَوْلِ وَأَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ ثُمَّ أَخَذَ جَرِيدَةً رَطْبَةً فَشَقَّهَا بِنِصْفَيْنِ ثُمَّ غَرَزَ فِي كُلِّ قَبْرٍ وَاحِدَةً قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا فَقَالَ لَعَلَّهُ أَنْ يُخَفَّفَ عَنْهُمَا مَا لَمْ يَيْبَسَا ——

—————— رواہ البخاری ومسلم

(ترجمہ) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر دو قبروں پر ہوا. تو آپ نے فرمایا کہ جو دو آدمی ان قبروں میں مدفون ہیں اُن پر عذاب ہو رہا ہے، اور کسی ایسے گناہ کی وجہ سے یہ عذاب نہیں ہو رہا ہے جس کا معاملہ بہت مشکل ہوتا (یعنی جس سے بچنا بہت دشوار ہوتا، بلکہ یہ دونوں اپنے ایسے گناہ کی پاداش میں عذاب دیے جا رہے ہیں جس سے بچنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا) ان میں سے ایک کا گناہ تو یہ تھا کہ وہ پیشاب کی گندگی سے بچاؤ کی یا پاک صاف رہنے کی کوشش اور فکر نہیں کرتا تھا، اور دوسرے کا گناہ یہ تھا کہ وہ چغلیاں لگاتا پھرا کرتا تھا پھر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی ایک تر شاخ لی اور اس کو بیچ میں سے چیر کے دو ٹکڑے کیا۔ پھر ہر ایک قبر پر ایک ایک ٹکڑا گاڑھ دیا صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ یہ آپ نے کس مقصد سے کیا؟ آپ نے فرمایا، امید ہو کہ جس وقت تک شاخ کے یہ ٹکڑے بالکل خشک نہ ہو جائیں ان دونوں کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے۔

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

(تشریح) عذاب قبر کے بارہ میں اُصولی بحث اس سلسلہ کی پہلی جلد میں کی جا چکی ہے۔ اور وہیں وہ حدیثیں بھی ذکر کی جا چکی ہیں جن میں صراحۃً فرمایا گیا ہو کہ عذاب قبر کی چیخ پکار کو اس پاس کی دوسری سب مخلوق سنتی ہو لیکن جن و انس عام طور سے نہیں سنتے، اور وہیں اس کی حکمت بھی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہو۔ نیز وہیں صحیح مسلم کی ایک حدیث نقل کی جا چکی ہے جس میں بعض قبروں کے عذاب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطلع ہونے کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے ــــــ پس یہ واقعہ جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے یہ بھی اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے ــــــ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو عالم غیب کی بہت سی ایسی چیزوں کا مشاہدہ کراتا اور بہت سی ایسی آوازیں سنوا دیتا ہو جن کو عام انسانوں کی آنکھیں اس عالم میں نہیں دیکھتیں اور ان کے کان نہیں سُنتے ــــــ بہرحال یہ بھی اسی قبیل کی ایک چیز ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں صاحبوں کے عذاب کا سبب ان کے دو خاص گناہوں کو بتایا ہو۔ ایک کے متعلق بتایا کہ وہ چغلی کرتا پھرتا تھا جو ایک سنگین اخلاقی جرم ہو اور قرآن مجید میں بھی ایک جگہ اس کا ذکر ایک کافرانہ خصلت یا منافقانہ عادت کے طور پر کیا گیا ہو۔ فرمایا گیا ہے" وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ (قلم)[1] اور کعب احبار سے مروی ہو کہ تورات میں چغلخوری کو سب سے بڑا گناہ بتایا گیا ہے[2]۔

اور دوسرے کے عذاب کا سبب آپ نے یہ بتایا کہ وہ پیشاب کی گندگی سے بچاؤ اور پاک صاف رہنے میں بے احتیاطی کرتا تھا (لا یستتر اور لا یستنزہ دونوں کا حاصل مطلب یہی

---

[1] اور مت مان اس شخص کی بات جو (جھوٹ بولنے میں بے باک اور) بے تحاشا قسمیں کھانے کا عادی ہو اور عیب چینی اور چغلخوری جس کا مشغلہ ہو۔ [2] ذکرہ الشیخ عبدالحق فی شرح المشکوٰۃ۔

ہو، اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں اس موقع پر "لَا یَسْتَبْرِئُ" بھی آیا ہے اور حاصل اس کا بھی یہی ہے)
بہرحال اس سے معلوم ہوا کہ پیشاب کی گندگی سے (اور اسی طرح دوسری ناپاکیوں سے بچنا یعنی اپنے جسم اور اپنے کپڑوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا اللہ تعالیٰ کے اہم احکامات میں سے ہے اور اس میں کوتاہی اور بے احتیاطی ایسی معصیت ہے جس کی سزا آدمی کو قبر میں بھی بھگتنی پڑے گی۔ آگے حدیث میں جو یہ ذکر ہے کہ آپ نے کھجور کی ایک تر شاخ منگوائی اور بیچ میں سے اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک ایک ٹکڑا اُن دونوں قبروں پر گاڑ دیا۔ اور بعض صحابہ نے جب اس کی بابت دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ "مجھے امید ہے کہ جب تک ان ٹکڑوں میں کچھ تری رہے گی اور یہ بالکل خشک نہ ہو جائیں گے اُس وقت تک کے لیے ان کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے گی۔" ـــــ اس کی ایک توجیہ بعض شارحین نے یہ ذکر کی ہے کہ کسی درخت کی شاخ میں جب تک کچھ تری یا نمی رہتی ہے اس وقت تک وہ زندہ رہتی ہے۔ اور اس وقت تک وہ اللہ کی تسبیح و حمد کرتی رہتی ہے ـــــ گویا قرآن مجید کی آیت "وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ" کا مطلب ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ ہر چیز اس وقت تک جب تک کہ اس میں کچھ زندگی ہو اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرتی رہتی ہو، اور جب اس چیز کی زندگی ختم ہو جاتی ہے تو اس کی حمد و تسبیح بھی ختم ہو جاتی ہے ـــــ بہرحال اسی بنا پر ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل اور آپ کے اس ارشاد کی توجیہ یہ کی ہے کہ آپ نے کھجور کی شاخ کے یہ ٹکڑے ان قبروں پر اس لیے گاڑے تھے کہ ان کی تسبیح و حمد کی برکت سے عذاب میں تخفیف ہو جائے اور آپ نے ان ٹکڑوں کے خشک ہونے تک تخفیف عذاب کی جو امید ظاہر فرمائی اس کی بنیاد بھی بس یہی تھی　　لیکن اکثر شارحین نے اس توجیہ کو غلط قرار دیا ہے، اور ہمارے نزدیک بھی یہ توجیہ بالکل غلط بلکہ مہمل ہے۔ ذرا غور کرنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر آپ نے یہ کام اس نقطۂ نظر سے کیا ہوتا تو کھجور کی شاخ چیر کے آپ اس کے ٹکڑے قبروں پر نصب نہ کرتے کیونکہ وہ تو دو چار دن میں خشک ہو جاتے ہیں بلکہ اس صورت میں آپ ان قبروں پر کوئی پودا نصب کرا دیتے جو برہا برس تک ہرا رہتا ـــــ دوسری واضح دلیل اس توجیہ کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ اگر صحابہ کرام نے آپ کا منشا اور نقطۂ نظر یہ سمجھا ہوتا تو وہ سب ایسا ہی کیا کرتے اور ہر قبر پر شاخ نصب کرنے بلکہ درخت لگانے کا اس دور میں عام رواج ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بہرحال حضور کے

اس عمل اور اس ارشاد کی یہ توجیہ بالکل غلط ہے اور پھر اس توجیہ کی بنیاد پر بزرگانِ دین کے مزارات پر (ار) پھول چڑھانے کی مشرکانہ رسم کا جواز نکالنا تو روحِ اسلامی پر سخت ظلم ہے۔

پس صحیح توجیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل اور ارشاد کی یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ سے اُن مُردوں کے لیے تخفیف عذاب کی دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بتایا گیا کہ آپ اس طرح ایک ہری شاخ کے دو حصے کر کے ان قبروں پر ایک ایک گاڑھ دیجیے۔ جب تک ان میں تری رہے گی اس وقت تک کے لیے ان کے عذاب میں تخفیف کر دی جائے گی۔ ــــ صحیح مسلم کے آخر میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث ہے اُس میں بھی دو قبروں کے عذاب کا ذکر ہے، اور وہ دوسرا واقعہ ہے۔ وہاں حضرت جابر رضی اللہ کا یہ بیان ہے کہ حضور نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ! ان دو درختوں میں سے دو شاخیں کاٹ کے فلاں جگہ ڈال آؤ! حضرت جابر فرماتے ہیں، میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی، اور جب آپ سے اس کی بابت میں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہاں دو قبریں ہیں جن پر عذاب ہو رہا ہو میں نے اللہ تعالیٰ سے تخفیف عذاب کی استدعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اتنی بات قبول فرمائی کہ جب تک یہ شاخیں تر رہیں گی۔ ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی ـــ بہرحال حضرت جابر کی اس روایت سے یہ بات صراحۃً معلوم ہو گئی کہ ہری شاخوں کو یا ان کی تری کو عذاب کی تخفیف میں کوئی خاص دخل نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات فرمائی گئی تھی کہ آپ کی دعا کی وجہ سے ہم اتنی مدت کے لیے ان کے عذاب میں تخفیف کر دیں گے ـــ پس اصلی چیز تھی حضور کی دُعا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی بنا پر ایک محدود مدت تک کے لیے تخفیف کا فیصلہ۔

شارحین نے اس حدیث کی شرح میں اس پر بھی گفتگو کی ہے کہ یہ دو قبریں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی شاخ کے ٹکڑے گاڑے، مسلمانوں کی تھیں یا غیر مسلموں کی؟ اور پھر ترجیح اس کو دی ہے کہ یہ قبریں مسلمانوں کی تھیں، اس کا ایک واضح قرینہ خود اسی حدیث میں یہ موجود ہے کہ آپ نے عذاب کا سبب چغلخوری کی عادت اور پیشاب کے معاملہ میں بے احتیاطی اور لاپروائی بتایا ہے، حالانکہ اگر یہ قبریں کافروں کی ہوتیں تو عذاب کا

سب سے بڑا سبب اُن کا کفر و شرک بتلایا جاتا ـــــ علاوہ ازیں مسند احمد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبریں بقیع میں تھیں اور آپ نے بقیع سے گزرتے ہوئے ان قبروں کے عذاب کو محسوس کیا تھا ، اور معلوم ہے کہ بقیع مسلمانوں ہی کا قبرستان ہے ـــ بہرحال ان سب قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبریں مسلمانوں کی تھیں ـــــ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس حدیث کا خاص سبق اور اُس کی خاص ہدایت یہ ہے کہ پیشاب وغیرہ کی نجاست سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش اور فکر کی جائے اور جسم اور کپڑوں کے پاک صاف رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ اور چغلخوری جیسی منافقانہ و مفسدانہ عادات سے بچا جائے۔ ورنہ ان دونوں باتوں میں کوتاہی اور بے احتیاطی کا خمیازہ قبر میں بھی بھگتنا ہوگا۔ اللھم احفظنا!

پیشاب کے لیے مناسب جگہ تلاش کرنی چاہیے :-

(۳) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ کُنْتُ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ فَاَرَادَ اَنْ یَّبُوْلَ فَاَتٰی دَمِثًا فِیْ اَصْلِ جِدَارٍ فَبَالَ ثُمَّ قَالَ اِذَا اَرَادَ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّبُوْلَ فَلْیَرْتَدْ لِبَوْلِہٖ ـ (رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، آپ کو پیشاب کا تقاضا ہوا تو آپ ایک دیوار کے نیچے نرم اور نشیبی زمین کی طرف گئے اور وہاں پیشاب سے فارغ ہوئے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو پیشاب کرنا ہو تو اس کے لیے مناسب جگہ تلاش کرے۔ (سنن ابی داؤد)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ پیشاب کے لیے ایسی جگہ تلاش کرکے بیٹھنا چاہیے جہاں پردہ بھی ہو اور اپنے اوپر چھینٹیں آنے کا خطرہ بھی نہ ہو، اور رُخ بھی غلط نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کی بیشمار رحمتیں ہوں اس کے اُس پاک پیغمبر پر جس نے اُمت کو پیشاب پاخانے تک کے آداب سکھائے۔

قسط (۳)

تجلیاتِ مجدِّدِ الف ثانیؒ

مکتوبات کے آئینے میں

از ــــــ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی)

مکتوب :- (۵۱) شیخ فرید بخاریؒ کے نام

حق سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے وجودِ شریف کے ذریعے ارکانِ شریعت اور احکامِ ملت قوت گیر اور رواج پذیر ہوں ــــ ع

کار این است وغیر ایں ہمہ ہیچ

آج ضعفاءِ اہلِ اسلام کو اس زبردست طوفانِ گمراہی میں امیدِ نجات، اہلِ بیت خیر البشرؐ سے ہے ــــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ مَثَلُ اھلِ بیتی کمثلِ سفینۃِ نوحٍ من رکبھا نجا ومن تخلّف عنھا ھلک (میرے اہلِ بیت کی مثال، کشتیٔ نوحؑ کی سی ہے جو شخص اس پر سوار ہوا وہ نجات پاگیا اور جس نے اُس سے کنارہ کشی کی ہلاک ہوگیا)

آپ اپنی ہمت عالی کو تمام تر اس جانب لگائیں کہ اس سعادتِ عظمیٰ (امداد و اعانت کی دولت) کو حاصل کرلیں ــــ اللہ کی عنایت سے آپ کو جاہ و جلال اور عظمت و شوکت سب کچھ میسر ہے اگر شرفِ ذاتی کے ساتھ ساتھ ترویجِ شریعت بھی آپکے ذریعے ہوگی تو بوسیلہ چوگانِ سعادت گوئے سبقت لے جائیں گے ......

مکتوب (۵۲) شیخ فرید بخاریؒ کے نام

(نفسِ امّارہ کی مذمت میں)

آپ نے از روئے مہربانی جس مرحمت نامہ گرامی سے اس دعاگو کو ممتاز فرمایا تھا اس کے مطالعے سے مشرف ہوا ـــــ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، آپ کی عزت میں اضافہ کرے، آپ کو شرحِ صدر نصیب کرے اور آپ کے کاموں کو آسان کرے ـ بحرمتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ـــــ اور ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری و باطنی متابعت پر ثابت قدم رکھے۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے جو اس دعا پر آمین کہے ـــ

چند فقرے ایک مصاحبِ بد ذات اور ندیمِ بدخو (یعنی نفسِ امّارہ) کی مذمت میں لکھے جاتے ہیں امید کہ قبولیت کے کانوں سے سنے جائیں گے ـــ

مخدوما! انسان کا نفسِ امّارہ، حبِّ جاہ و ریاست پر مخلوق ہوا ہے اور اس کی تمام تر توجہ یہ ہے کہ اپنے اقران و اماثل پر بلندی حاصل ہو جائے وہ یہ چاہتا ہے کہ تمام مخلوق اسکی محتاج و مطیع ہو اور وہ خود کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو (درحقیقت) یہ نفس کی طرف سے ایک قسم کا دعویٰ الوہیت ہے اور خدائے بے ہمتا جل شانہٗ کے ساتھ شرکت ڈھونڈھنا ہے ـــــ بلکہ یہ نفسِ بے سعادت شرکت پر بھی راضی نہیں ہے وہ تو یہ چاہتا ہے کہ صرف وہی حاکم ہو اور سب صرف اس کے محکوم ہوں ـــــ...... لہٰذا نفس کے مرادات، جاہ و ریاست وغیرہ حاصل کرا کے اس کی پرورش کرنا فی الحقیقت، دشمنِ خدا کی امداد کرنا ہے اور اس کو تقویت دینا ہے ـــــ اس امر کی قباحت اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

حدیثِ قدسی میں وارد ہوا ہے ـــــ الکبریاء ردائیٗ والعظمۃ اِزاری فمن نَازَعَنِی فی شئٍ منہما ادخلتہٗ فی النّار ولا اُبالی ـــــ (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ برتری میری چادر ہے اور عظمت و بزرگی میری ازار ہے پس جو کوئی مجھ سے ان دو چیزوں کے بارے میں منازعت کرے گا میں اسکو آتشِ دوزخ میں داخل کر دوں گا اور کچھ پرواہ نہ کروں گا) دنیا اسی بنا پر اللہ کے نزدیک ملعون و مبغوض ہے کہ اس کا حاصل ہونا، نفس کی مرادوں کے حصول کا معاون ہے ـــــ پس جو دشمن کو مدد دے گا یقیناً لعنت کا مستحق ہوگا ـــ

فقر جو فخرِ محمدی قرار پایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فقر میں نامرادیٔ نفس اور عاجزیٔ نفس حاصل ہوتی ہے ـــــ انبیاء علیہم السّلام کی بعثت کا مقصد اور تکلیفاتِ شرعیہ کی حکمت بھی

نفس امّارہ کو عاجز اور خراب وخستہ کرنا ہے ــــ شریعتیں ہوائے نفسانی کو دور کرنے کے واسطے وارد ہوئی ہیں ــــ جو شخص جتنا مقتضائے شریعت پر عمل کرے گا اسی قدر خواہش نفسانی کو زائل کرے گا ــــ اسی بناء پر ہوائے نفسانی کے ازالے کے لیے احکامِ شرعیہ میں سے کسی ایک حکم کا بجالانا، ایسے ہزار سالہ ریاضات ومجاہدات سے بہتر ہے جو اپنی رائے سے کیے جائیں ــــ ایسے ریاضات ومجاہدات جو شریعت کے تقاضے کے مطابق نہ ہوں، ہوائے نفسانی کو تقویت دیا کرتے ہیں ــــ برہمنوں اور جوگیوں نے ریاضات ومجاہدات میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے مگر اُن کو فائدہ کچھ بھی نہ ہوا البتہ نفس کو تقویت ضرور حاصل ہوگئی ــــــــ شریعت کے مطابق تھوڑی سی رقم (باقاعدہ) زکوٰۃ میں نکالنا نفس کو پامال کرنے کے لیے اتنی مفید ہے کہ اپنی رائے سے یوں ہی ہزار دینار خرچ کر دینا اتنا مفید نہیں ہے ــــــــ خواہش نفس توڑنے کے لئے حکم شریعت کے ماتحت عید الفطر کے دن کھانا کھالینا، اپنی مرضی سے سالہا سال نفلی روزے رکھنے سے بھی زیادہ نافع ہے ــــ اور صبح کی دو رکعت نماز جماعت سے ادا کرنا ایک مستقل سنت کا انجام دینا ہے اور یہ عمل ثواب میں اس سے کہیں زیادہ ہے کہ تمام رات، صلوٰۃ نافلہ ادا کرتا رہے اور صبح کی نماز بے جماعت ادا کرے ــــــــ حاصل کلام یہ ہے کہ جب تک نفس کا تزکیہ نہ ہوگا اور اس کے اندر سے تکبر کا مالیخولیا نہ جائے گا ــــ نجات محال ہے ــــ اس مرض کے ازالے کی فکر بہت ضروری ہے تاکہ بات موت ابدی تک نہ پہونچے ــ کلمۂ طیبہ لا اِلٰہَ اِلَّا اللہ جو تمام آفاقی وانفسی معبودانِ باطل کی نفی کے واسطے وضع کیا گیا ہے، نفس کے تزکیے اور تطہیر کے حق میں بہت نافع اور مناسب ہے ــــ اکابر طریقت نے تزکیۂ نفس کے لیے اسی کلمۂ طیبہ کو اختیار کیا ہے ــــ

تا بجاروب "لا" نروبی راہ　　　نرسی در سرائے "الّا اللہ"

جب بھی نفس، مقام سرکشی میں آئے اور نقض عہد کرے اس کلمے کی تکرار سے تجدیدِ ایمان کرنا چاہیئے ــــــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ لا اِلٰہَ اِلّا اللہ کہہ کر اپنے ایمان کو تازہ کر لیا کرو ــــــــ بلکہ اس کلمے کی تکرار ہمہ وقت ہونا ضروری ہے اس لیے کہ نفسِ امّارہ برابر خباثت پر اترا رہتا ہے۔

حدیث میں اس کلمے کی تفضیلت میں آیا ہے کہ اگر تمام آسمان اور تمام زمینیں ایک پلّے میں رکھی جائیں اور کلمۂ طیبہ کو دوسرے پلّے میں رکھیں تو یقیناً کلمے والا پلّہ جھک جائے گا۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ والتزم متابعۃ المصطفیٰ
علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰت والتسلیمات

مکتوب (۵۳) شیخ فرید بخاریؒ کے نام

(اختلاف علماء سوء، موجب فسادِ عالم ہے)

سنا گیا ہے کہ بادشاہ اسلام (جہانگیر) نے اپنے اسلامی حسن باطن کی بنا پر آپ سے فرمایا ہے کہ آپ چار ایسے دیندار عالم مہیا کریں جو حاضر رہ کر مسائل شرعیہ کو بیان کیا کریں تاکہ کوئی امر خلافِ شرع واقع نہ ہو۔ الحمد للہ سبحانہ علیٰ ذالک)۔۔۔ مسلمانوں کو اس سے بہتر کیا بشارت اور "ماتم زدگان" کو اس سے اچھی کیا خوشخبری ہو سکتی ہے ــــ چونکہ فقیر اسی (دینی) غرض سے آپ کی طرف متوجہ رہتا ہے چنانچہ مکرر اس امر کا اظہار بھی کیا جا چکا ہے لہٰذا ضرورۃً (اب بھی) اس بارے میں کچھ دردِ دل سے اپنے آپ کو معاف نہیں رکھوں گا امید کہ مجھے معذور قرار دیں گے صاحب الغرض مجنون (صاحب غرض مجنون ہوتا ہے) بنا بریں معروض ہے کہ ایسے علماء دیندار جو حب جاہ اور حب ریاست سے علیٰحدہ ہوں اور ترویج شریعت اور تائید ملت کے علاوہ کوئی مطلب نہ رکھتے ہوں تعداد میں بہت قلیل ہیں ــــ اگر ان میں حب جاہ ہوئی تو ہر ایک کوئی نہ کوئی ڈگر اختیار کرکے اپنی فضیلت کا اظہار کرے گا، اختلافی مسائل درمیان میں لائے گا اور اس طرز کو بادشاہ کے قرب کا ذریعہ بنائے گا لامحالہ دین کی مہم ابتر ہو جائے گی ــ زمانۂ گزشتہ (عہد اکبری) میں علماء سوء کے اختلافات نے ہی دنیا کو بلا میں ڈالا تھا ــــ اب بھی صحبت علماء سوء کا اندیشہ درپیش ہے ــ ایسی صورت میں ترویج دین کیا خاک ہو گی الٹی تخریب دین ہو جائے گی ــــ میں علماء سوء کے فتنے سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں ــــــ (میرے نزدیک) اگر صرف ایک عالم کو اس غرض کے لیے منتخب کیا جائے تو بہتر ہو گا ـــ علماء آخرت میں سے کوئی عالم میسر آجائے تو اس سے

اچھی کیا بات ہے اسکی صحبت کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے ــــــ اگر وہ میسر نہ آسکے تو غور و فکر کے بعد علماء میں سے کسی بہتر و غنیمت عالم کا انتخاب کر لیا جائے ــــ اگر کل میسر نہ آسکے تو کل کو ترک بھی نہ کیا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس بارے میں سوائے اس کے اور کیا لکھوں کہ جس طرح خلائق کی رستگاری علماء کے وجود سے وابستہ ہے اسی طرح دنیا کی زیاں کاری بھی انھیں سے مربوط ہے۔ بہترین علماء بہترین خلائق اور ان میں کا بدترین بدترین خلائق ہے ــــ ہدایت و گمراہی کو اُن کی ذات سے ہی متعلق کیا گیا ہو...

ع عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

غرض یہ ہے کہ اس باب میں فکر صحیح اور کامل غور و خوض کو کام میں لاکر کوئی قدم اٹھائیں، جب وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ پھر کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا ــــ اگرچہ شرم آتی ہے کہ اس قسم کی (موٹی موٹی) باتیں اربابِ عقلِ صحیح کے سامنے پیش کی جائیں لیکن اس بات کو اپنی سعادت کا ذریعہ سمجھ کر درد سر کا باعث بن رہا ہوں ــــ

مکتوب (۵۴) شیخ فرید بخاریؒ کے نام

(بدعتی اور اہل باطل کی صحبت سے اجتناب لازم ہے)

جو شخص انسان کا شکریہ نہ بجا لائے گا وہ خدائے عز و جل کا شکر بھی ادا نہیں کرسکتا اس حقیقت کے پیشِ نظر ہم فقیروں پر آپ کے احسانات کا شکریہ ادا کرنا دو وجہ سے لازم ہے ــــ اوّلاً اس لیے کہ حضرت خواجہ (باقی باللہؒ) کی جمعیت ظاہری کا سبب آپ ہوئے ہیں ہم نے آپ کے طفیل اس جمعیت ظاہری میں طلب حق کا موقع حاصل کیا ہے، اور کامل حصہ لیا ہے ــــ ثانیاً اس وجہ سے کہ جب حضرت خواجہؒ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اس فقیر کی خدمات کا وقت آیا، تب بھی "اجتماعِ فقراء" اور "انتظام طالباں" باعث آپ ہی بنے ــــ اللہ تعالےٰ آپ کو بہترین جزا عطا فرمائے۔

ع گر بر تنِ من زباں شود ہر موئے
یک شکرِ تو از ہزار نتوانم کرد

دلی آرزو یہ ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو دنیا و آخرت میں ہر نقصان دہ بات سے محفوظ رکھے ـــ بحرمتہ جدکم سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ـــ یہ فقیر آپ کی صحبت گرامی سے دوری واقع ہے اس وجہ سے معلوم نہیں کہ آپ کی مجلس مبارک میں کس قسم کے لوگوں کا داخلہ ہوتا ہے اور انہیں خلوت وجلوت کون کون ہے ـ

خواہم بشد (برفت) از دیدہ درین فکر جگر سوز

کاغوش کہ شد (کدام کس) منزل و آسائش خوابت

آپ یہ یقین رکھیں کہ بدعتی کی صحبت، کافر کی صحبت سے زیادہ مضر ہے اور تمام بدعتی فرقوں میں سب سے زیادہ بدتر وہ گروہ ہے جو اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھتا ہے ـ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید (سورۂ فتح) میں ایسے لوگوں کو (صحابہ سے بغض رکھنے والوں کو) کفار قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا ہے ـلِیَغِیْظَ بِھِمُ الْکُفَّارَ ـــــــــ صحابہ کرامؓ نے قرآن وشریعت کی تبلیغ کی ہے اگر یہ حضرات مطعون ہوں گے تو قرآن وشریعت پر طعن لازم آئے گا ـــ قرآن کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے (ایک قرأت پر) جمع کیا ہے اگر حضرت عثمانؓ قابل طعن ہیں تو قرآن بھی مطعون ہو جائے گا ـــــ اللہ تعالیٰ زندیقوں کے اعتقاد سے محفوظ رکھے ـ

جو اختلاف ونزاع صحابہؓ کے درمیان واقع ہوا تھا وہ ہوائے نفسانی کے ماتحت نہ تھا ـــ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اقدس میں ان حضرات کے نفوس کا مکمل تزکیہ ہو گیا تھا اور ان کے نفوس، امّارگی سے آزاد ہو گئے تھے ـ

اتنا تو میں جانتا ہوں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے معاملے میں حق پر تھے اور ان کے مقابل (حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) خطا پر ـــ ـ ـــ لیکن یہ خطا، خطائے اجتہادی ہے جو حدِ فسق تک پہونچانے والی نہیں ـــ ایسی صورت میں ملامت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ اجتہادی غلطی کرنے والے کو بھی ایک درجہ ثواب حاصل ہوتا ہے .... ضرورت ہے کہ آپ کی مجلس شریف

ہیں مخدومِ[1] جہانیاں جہاں گشت (حضرت سید جلال الدین بخاریؒ) کی کتب معتبرہ میں سے ہر روز کچھ نہ کچھ پڑھا جایا کرے تاکہ معلوم ہو کہ انھوں نے اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کس طرح تعریف کی ہے اور ان کو کس قدر ادب و تعظیم سے یاد کیا ہے ـــ ان کتب معتبرہ کے مضامین سُن کر مخالفین بداندیش شرمندہ اور ذلیل ہو جائیں گے ـــــ اس زمانے میں یہ گروہ بد (مخالفین صحابہؓ) بہت سر اٹھا رہا ہے اور اطراف و جوانب میں منتشر ہو رہا ہے ـــ اسی لیے اس بارے میں یہ چند کلمات لکھے گئے تاکہ آپ کی مجلس مبارک میں اس قسم کے مخالفین کو جگہ نہ ملنے پائے ـــــ اللہ تعالےٰ آپ کو طریقۂ مرضیہ پر ثابت قدم رکھے۔

مکتوب (۵۹) سید محمود کے نام

[بے اتباع اہل سنت و جماعت نجات متصور نہیں اور علم و عمل شریعت سے ہی مستفاد ہیں]

مکتوب شریف وارد ہو کر موجب فرحت ہوا ـــ محبت فقرا اور اس جماعت سے اخلاص کا اظہار ہوا ـ اللہ تعالےٰ محبت فقرا کو زیادہ کرے ـــ نصائح طلب کئے گئے تھے (لہذا لکھتا ہوں)

مخدوما! آدمی کو نجاتِ ابدی حاصل کرنے کے لیے ان تین چیزوں کے بغیر چارہ نہیں (۱) علم (۲) عمل (۳) اخلاص۔

علم دو قسم پر ہے ایک وہ علم ہے جس سے مقصود عمل ہے ـــ علم فقہ اس کا متکفل و ضامن ہے ـــــ ایک وہ علم ہے جس سے مقصود فقط اعتقاد اور یقین قلبی ہے اُس کو علم عقائد و کلام میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے ـــــ عقائد فرقۂ اہل سنت و جماعت

---

[1] آپ حضرت سید احمد کبیرؒ کے صاحبزادے اور حضرت سید جلال الدین جلال اعظم گل سرخ بخاریؒ کے پوتے ہیں ـــ حضرت جلال اعظم بخاریؒ کے دوسرے صاحبزادے سید محمد غوث کی اولاد میں شیخ فرید بخاریؒ ہیں۔ اس لحاظ سے آپ ان کے ہم جدی ہیں ـــ مخدوم جہانیاںؒ نے دوبار ربع مسکون کی سیاحت کی ہے اور صدہا فقرا و مشائخ کو دیکھا ہے اور ان سے اخذ برکت کی ہے ۵۸۵ھ یا ۵۸۶ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ (خزینۃ الاصفیا)

کے مطابق ہوں کیونکہ یہ فرقہ، فرقۂ ناجیہ ہے ان حضرات کے اتباع کے بغیر نجات متصور نہیں ہے ــــ اگر ان کے عقائد سے سر مو مخالفت ہوئی تو خطر در خطر ہے ــــــــ یہ بات کشفِ صحیح اور الہام صریح کی رُو سے بھی یقینی ہے اسکے خلاف کا کوئی احتمال نہیں ــــ پس خوشحال ہے وہ شخص جس کو اہلِ سنت کی متابعت نصیب ہوئی اور ان کی تقلید سے مشرف ہوا ــــ اور خرابی ہے اس کی جو اُن کے خلاف چلا، اُن سے انحراف کیا، ان کے قوانین کو ترک کیا اور اُن کے زمرے سے باہر نکل گیا ــــــــ ایسے لوگ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا ــ انھوں نے رویتِ باری تعالیٰ اور شفاعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا ان پر فضیلتِ صحبتِ پیغمبرؐ اور فضیلتِ اصحابِ پیغمبرؐ پوشیدہ رہی، وہ اہلِ بیتِ رسولؐ کی دوستی سے اور اولادِ فاطمہؓ کی محبت سے بھی بے بہرہ رہے ــــــــ غرض وہ اس خیر کثیر سے محروم رہے جس کو اہلِ سنت نے حاصل کیا ــــــ صحابہؓ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان میں سے سب سے زیادہ بزرگ حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں ــــ حضرت شافعیؒ جو حضرات صحابہ کے حالات سے بہت زیادہ واقف ہیں انھوں نے فرمایا ہے کہ بعد وفاتِ رسولِ مقبولؐ، جب لوگ مضطر و پریشان ہوئے اور انھوں نے سقفِ آسمان کے نیچے کوئی شخص حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ بہتر نہ پایا تو ان ہی کو اپنا امیر و حکمراں بنا لیا ــــ اس سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرامؓ افضلیتِ صدیقِ اکبرؓ پر متفق تھے ــ پس قرنِ اوّل ہی میں افضلیت صدیقؓ پر اجماع منعقد ہو گیا تھا ــــ لہٰذا یہ افضلیت قطعی ہوئی اس سے انکار جائز نہ ہوگا۔

بیشک اہلِ بیت رسولؐ، کشتیٔ نوحؑ کی مثل ہیں جو کشتیٔ نوحؑ پر سوار ہوا نجات پا گیا اور جو اس پر سوار نہ ہوا وہ ہلاکت کو پہونچا ــــ (لیکن) بعض اکابر نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو تاروں سے تشبیہ دی ہے (اور ظاہر ہے کہ) تاروں سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں ــــ اور اہلِ بیت کو کشتیٔ نوحؑ سے تشبیہ دی ہے۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ کشتی کے سوار کو تاروں کا لحاظ رکھے بغیر چارہ نہیں ہے تاکہ ہلاکت کے خوف سے نجات ملے ــ اور تاروں کی رعایت کے بغیر ہلاکت سے نجات مل نہیں سکتی ــــ یہ بھی جاننا چاہیے کہ کسی ایک صحابی کا انکار تمام صحابہؓ سے انکار کے مرادف ہو

اس لئے کہ صحابہؓ سب کے سب صحبتِ خیرالبشرؐ کی فضیلت میں مشترک ہیں اور یہ فضیلتِ صحبت، تمام فضائل وکمالات سے بالاتر ہے ـــــ یہی وجہ ہے کہ حضرت اویس قرنیؒ جو کہ خیرالتابعین ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنیٰ صحابی کے مرتبے کو بھی نہیں پہونچ سکے، پس کسی چیز کو بھی فضیلتِ صحبت کے مساوی قرار نہیں دیا جا سکتا ـــ کوئی چیز بھی ہو ـــ اس لئے کہ صحابہؓ کا ایمان صحبتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور نزولِ وحی کے مشاہدے کی برکت سے "شہودی" ہو گیا تھا ـ ایمان کے اس درجے سے صحابہ کرامؓ کے بعد کوئی بھی مشرف نہیں ہوا، رہے اعمال، سو وہ ایمان کے ثمرات ونتائج ہوتے ہیں جتنا ایمان، کامل ہوگا، اعمال میں بھی کمال ہوگا ـ

صحابہؓ کے درمیان جو منازعات ومحاربات واقع ہوئے ہیں وہ محمول ہیں بلیغ حکمتوں پر، ہوائے نفسانی سے وہ منازعات صادر نہیں ہوئے بلکہ اجتہاد سے صادر ہوئے ہیں، اگر ان میں سے کوئی اپنے اجتہاد میں راہ خطا پر بھی چلا ہے تب بھی اس کے لئے ایک درجۂ ثواب ثابت ہے ـ ـــــ یہ ہے وہ سیدھا راستہ جو افراط وتفریط کے درمیان ہے اور جس کو اہلِ سنت نے اختیار کیا ہے ـــــ یہی طریق اسلم اور سبیل محکم ہے ـــــ حاصل کلام یہ ہے کہ علم وعمل شرع سے مستفاد ہیں اور تحصیلِ خلاص جو علم وعمل کے لئے مانند روح ہے وہ طریقِ صوفیہ کے ساتھ وابستہ ہے ......

جو نفع کہ طریقِ صوفیہ سے علم وعمل کو پہونچتا ہے وہ یہ ہے کہ علوم کلامیہ استدلالیہ، کشفی ہو جاتے ہیں اور ادائیگیٔ اعمال میں پوری پوری آسانی میسر آجاتی ہے اور وہ سستی جو نفس وشیطان کی طرف سے ہوتی ہے زائل ہو جاتی ہے ـ

ع ایں کار دولت است کنوں تا کرا دھند

والسّلام اوّلاً وآخراً ـــ

دُعا کے اسرار و آداب

(از جناب قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری رح)

[قاضی سلیمان صاحب منصور پوری "صاحب" رحمۃ للعالمین" سے کون پڑھا لکھا مسلم ناواقف ہوسکتا ہے، ذیل میں موصوف کا ایک غیر مطبوعہ مضمون شائع کیا جا رہا ہے، جو حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب دہلوی مقیم حجاز کی عنایت سے ہمیں حاصل ہوا ہے ——— ادارہ]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والسلام علی المرسلین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا محمد الامین وآلہ واصحابہ اجمعین الیٰ یوم الدین

امابعد۔ ایک مخلص نے درخواست کی کہ ایک مختصر سا رسالہ ادعیہ ماثورہ پر لکھ دیا جائے، میں نے تعمیل درخواست یہ رسالہ لکھ دیا ہے، اگرچہ مضمون کے وسعت اور اہمیت کا اقتضا یہ تھا کہ اس بارہ میں جو کچھ لکھا جائے وہ مختصر نہ ہو، مگر درخواست کی پابندی بھی ضروری تھی۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف قویٰ عطا فرمائے ہیں۔ اور ہر ایک قوت کا کمال دوسری قوت سے الگ ہے، مثلاً آنکھ کا کمال بینائی اور کان کا کمال شنوائی وغیرہ وغیرہ۔ اور جب کسی قوت کے کسی کمال میں ضعف یا زوال پیدا ہو جاتا ہے تو سبب عارضی کے دفعیہ کی سعی بذریعہ علاج کی جایا کرتی ہو۔ اسی طرح روحانی قویٰ کے لیے بھی روحانی امراض ہیں جن کا ازالہ روحانی ادویہ ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

قلب انسان کا کمال یہ ہے کہ اس میں خالق کی معرفت اور توحید راسخ ہو۔ مالک کی محبت ہی قلب کا

سرور و ابتہاج ہو، اور اسی کی رضا و اطاعت اس کا مطلوب۔ موالات و معادات اور حُب و بغض بھی اسی کا رضوان مقصود ہو۔ قلب پر اسی کا جلال سایہ فگن ہو، اور اسی کا کمال نور افزا ہو۔ دُنیا کی کوئی نعمت، کوئی لذت، کوئی عیش، کوئی سرور، بلکہ زندگانیٔ دنیوی بھی مندرجہ بالا مقصود کے سامنے ذرا عزیز و محبوب نہ ہو۔ جب تک قلب کی یہ کیفیت ہے اس وقت تک اس کی صحت کامل اور سالم ہے۔ لیکن جب دل کی ان معتقدات یا کیفیات میں فتور آ جاتا ہے تو قلب کو اتنا ہی بیمار سمجھ لینا چاہیے۔

علاج قلب بذریعہ ادویات روحانی کیا جاتا ہے اور وہ دوائیں یہ ادویہ ماثورہ ہیں جو حکیم مطلق تقدس و تعالیٰ اور طبیب حاذق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز فرمودہ ہیں۔ ان مرکبات پر جب کوئی بصیر نظر کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ نسخۂ روحانی کی تجویز میں کئی اقسام کی ادویہ کا استعمال کیا گیا ہے۔

(۱) توحید الوہیت کی تعلیم | کہ عرش سے فرش تک کی حکومت اور تدبیر اس واحد مالک کے قبضہ میں ہے، ریگ کا ذرہ، درخت کا پتا، نوری، خاکی، حیوان، بے جان سب پر اسی کا حکم جاری ہے۔ اور ہر ایک شئے اس کے جلال کے سامنے سرفگندہ و فرماں بردار ہے۔

(۲) توحید ربوبیت کی تعلیم | کہ پالنے والا، وجود بخشنے والا، نیست سے ہست بنانے والا، پرورش کے تمام بیرونی وسائل اور تمام اندرونی ذرائع جمع کرنے والا، ہر ایک شئے کو اس کی مناسبت طبع اور ضروریات فطرت کے مطابق مواہب عطا کرنے والا وہی ہے، ہر شخص اور ہر چیز اس کی پروردہ ہے۔ اور وہ سب کا پروردگار ہے۔ پانی میں تیرنے والے، ہوا میں اڑنے والے، زمین پر رینگنے والے۔ زندگانی کا سانس رکھنے والے یا بے ترکیب سے، نیز دنبول کرنے والے، خاکی، ناری، نوری، کرشتی، سب کے سب ہر لحظہ ہر آن اسی کی پرورش کے محتاج ہیں اور ہر وقت وہر لحظہ اسی کی پرورش سے مستفید۔

(۳) توحید علمی | کہ سمندر کی گہرائی یا آسمانوں کی بلندی پر کوئی چھوٹی یا بڑی جو چیز موجود ہے وہ اسی مالک کے علم کے اندر ہے ریگ کا کوئی ذرہ، بحر کا کوئی قطرہ، مادہ کا کوئی جزو اس کے علم اور قدرت سے باہر نہیں انسان کے اعمال و افعال بلکہ نیت اور ارادے اس کے علم میں ہیں، وہی سینوں کے بھیدوں کا جاننے والا۔ وہی دل کے جذبات کا علم رکھنے والا، وہی خیالات اور وساوس پر اطلاع رکھنے والا ہے۔ وہی پکارنے کی حالت کو دیکھتا ہے، وہی پڑھنے والے کی آواز کو سنتا ہے۔

(۴) تنزیہ باری | وہ بندوں پر ظلم کرنے سے برتر و اعلیٰ ہے۔ ہماری ہر ایک مصیبت میں اس کی حکمت و دانائی کام کرتی ہے۔ ہماری ہر ایک محنت میں اس کی مصلحت مخفی ہے۔ وہ نہ کبھی بندہ کے گناہ پر اس کی روزی بند کرتا ہے اور نہ کبھی بندہ کو اس کی غفلت پر اپنی حفاظت سے محروم کرتا ہے۔

(۵) اعتراف | یعنی بندہ کا صدق دل سے یہ اقرار کرنا کہ یہ بندہ ہی ظالم ہے اور اس کے ہاتھوں کے اعمال ایسے ہی بدترین انجام کے ملتزم ہیں۔

(۶) توسل | ان تمام حالات کو زیر نظر رکھ کر ہر دعا مانگنے والے کا رب العالمین کے اسماء حسنیٰ اور صفات کاملہ کا یاد کرنا اور انہی کے واسطے سے اپنی معروضات کو پذیرائی کے لیے پیش کرنا۔

(۷) استعانت | دنیا کے حیلہ و سائل اور تعلقات سے الگ ہو کر محض رب العالمین کی مدد پر حصر کرنا۔

(۸) رجا | گوناگوں ناکامیابی، نامرادی، ہیچ میرزی، بیکسی کے ہوتے ہوئے بھی افضال والطاف الٰہی پر اعتماد و وثوق قائم رکھنا۔

(۹) استغفار | گزشتہ تقصیرات کی معافی کا سوال بار بار پیش کرنا۔

(۱۰) توبہ | گزشتہ افعال سے بیزار ہو کر آئندہ بہترین اعمال پر کاربند ہو جانا اور گزشتہ پر ندامت و پشیمانی کا بار بار اظہار کرنا۔

(۱۱) تفویض | اپنی دعاؤں اور التماسوں کو پیش کرنے کے بعد انجام کار کو مشیت ربانی پر چھوڑ دینا اور اس کی قبولیت کے لیے بکشادہ پیشانی آمادگی رکھنا۔

(۱۲) ترک دعویٰ | نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت کو اپنے سے منسوب نہ کرنا۔ اپنے نفس کا اس میں کوئی حصہ نہ سمجھنا، اور سب کو حوالہ بخدا کر دینا۔

بس یہی وہ ادویہ ہیں جن کا استعمال عوارض قلب میں کیا گیا ہے۔ انہی کے استعمال کے لیے کہیں قرآن پاک پر تدبر کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے کبھی نماز نافلہ کا طریق بتایا جاتا ہے، اور کبھی جہاد کو اسی سبب سے نافع تر سمجھا جاتا ہے۔

اب دعا مانگنے والے کو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ دعا کی جان اضطرار قلب ہے اور اضطرار قلب ہی کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ نے قبولیت دعا کا وعدہ فرمایا ہے۔ الفاظ دعا کو بطور عادت زبان سے استعمال کرنا ہرگز ہرگز صحیح طریقہ دعا مانگنے کا نہیں، بعض لوگ اچھے اچھے وظیفے کرتے اور عمدہ

عمدہ اوراد پڑھا کرتے ہیں مگر اسی طرح کہ زبان ذاکر ہے اور قلب غافل اور پھر شکایت کیا کرتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہوئی یا کہا کرتے ہیں کہ کلام میں اثر نہیں یا اثر نہیں رہا۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ پینے کی دوا کا اثر سونگھنے سے نہیں حاصل ہوا کرتا۔

میرے عزیزو! دعا تنہائی میں مانگو، تمہارے جسم کا انداز، تمہاری آواز ایسی ہو کہ اس سے عجز و خشوع آشکارا ہو۔ تمہارے دل میں انابت الی اللہ جوش زن ہو۔ دعا کی معانی پر غور کرو اور اپنی حالت کو ان معانی کے مطابق بنالو۔

اگر اب بھی دعا مانگنا نہ آئے تو کسی شہر کی بڑی سڑک پر یا ریلوے اسٹیشن پر چلے جاؤ وہاں تم کو بھیک مانگنے والے بیٹھے نظر آئیں گے خواہ گرمی سے زمین و آسمان تپ اٹھے ہوں خواہ دھوپ سے بچنے کو پناہ کے لیے سایہ میں جا ٹھہرے ہوں مگر یہ بھیک مانگنے والا ایک ہی جگہ پر اور ایک ہی وضع میں بیٹھا ہوا ہے زمین پر جھکا ہوا یا آنکھوں کو بند کیے ہوئے، ہاتھ آگے کو پھیلائے ہوئے ایک ہی آواز کے ساتھ مسلسل بلا انقطاع اپنی مخصوص صدا کو دہرائے جاتا ہے، خواہ سردی کی وجہ سے لوگ مکانوں کے اندر چھپ کر بیٹھے ہوں، خواہ آمد و رفت کی راہوں پر رونق نہ رہی ہو، خواہ پالا اور ہوا باہر کسی کو ٹھہرنے نہ دیتی ہو مگر وہ برف کی طرح جما ہوا ہے اور رعد کی طرح اپنی آواز دور دور تک کے جانے والوں کے کان میں پہونچا رہا ہے۔

یہ بھکاری کیا مانگتا ہے؟	پیسہ دو پیسہ!
کس سے مانگتا ہے؟	اپنے ہی جیسے انسانوں سے!
کیا کسی استحقاق پر؟	نہیں
کیا کسی وعدے پر؟	نہیں
کیا اس کو مل رہتا ہے؟	ہاں! میرے اور آپ کے اندازے سے بڑھ کر!

اب دعا مانگنے والے کو سبق لینا چاہیے۔ وہ تو رب العالمین سے مانگتا ہے جس کی عظمت و جلال ہمارے اندازۂ وہم و خیال سے برتر ہے۔ وہ تو ایسی چیزیں مانگ رہا ہے جو قیمت و وقعت میں لاکھوں کروڑوں روپے سے اعلیٰ ہیں۔

پس لازم ہے کہ اپنے سوال کی اہمیت اور مسئول عنہ کی عظمت کے لحاظ سے دعا مانگنے والے

ں دعا میں سوز و گداز، عجز و نیاز، لجاجت و انکسار، عبودیت و افتقار پایا جائے۔
وہ بار بار اپنی خستگی و درماندگی، عاجزی و بے چارگی بیکسی و ناکسی کا اظہار کرے۔ بار بار اپنے آپ کو اسی کے در کا گدا، اسی کے آستان کا سوالی، اسی کے دربار کا امیدوار بتلائے۔ اسی کی دین کا فقیر۔ اسی کے فضل کا مسکین۔ اسی کے احسانات کا پروردہ ہونا زبان و دل پر لائے۔ اور اس حالت پر یہ یقین رکھے کہ وہ رحمٰن الرحیم سے مانگ رہا ہے جس کی رحمت نے اسے لباس انسانی عطا فرمایا۔ اور جس کی رحمانیت نے اسے شکم مادر میں رزق پہونچایا۔ یا ایمان رکھے کہ وہ تو غفور الودود سے مانگ رہا ہے جس کے غفران نے ہر ایک عاصی کو خود طلب فرمایا اور جس کی محبت نے ہر ایک جاندار کو محبت دے کر (؟) ہے۔
دعا مانگنے والے کو یاد رکھنا چاہیے کہ اثر دعا کے ظہور میں اگر دیر لگتی جائے اسی قدر اس کا زیادہ اعتماد بڑھتا جائے اور یقین محکم ہوتا جائے۔ دیکھو زمین سے کوئی دانہ جلد اور کوئی دانہ دیر سے نکلتا ہو۔ کوئی درخت جلد پھل دینے لگتا ہے اور کوئی دیر میں ثمر لاتا ہے۔ دعا مانگنے والے کو ضرور ہی ہو کہ یاس و ناامیدی کا اثر اپنے دل پر نہ ہونے دے۔ ممکن ہو کہ نظر بہ اسباب دنیوی کسی مقصد میں یاس و ناامیدی کا کھلا چہرہ بھی نظر آتا ہو لیکن پھر بھی دعا مانگنے والے کی توقع اور امید رب العالمین کے ساتھ وابستہ رہے اور اپنے مقصد کی کامیابی کو تائید غیبی کے حاصل ہو جانے پر منحصر رکھ کر روح کو اور دل کو یاس کے زہریلے اثر سے بچالے اور ہمت بلند اور عزم راسخ اور طلب صادق کے ساتھ اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو جاری رکھے۔ دعا مانگنے والے کو لازم ہے کہ دعا مانگنے کے وقت اپنے خیال کو کلیتہً اسباب ظاہری اور وسائل دنیوی کی طرف سے ہٹالے اور خوب یقین کرے کہ مالک کی لاانتہا قدرت اور لامحدود طاقت انسان کے جانے پہچانے اسباب اور وسائل میں محدود نہیں۔
دعا مانگنے والے کو لازم ہے کہ ایسی شئ کا سوال نہ کرے جو شرعاً ممنوع ہو۔ کسی ایسی شئے کا سوال نہ کرے جو سنت اللہ کے خلاف ہو۔ کسی ایسی چیز کا سوال نہ کرے جو رحم اور انسانیت کے خلاف ہو۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دعا کے منافع و فوائد لاانتہا میں سے فائدہ جلیلہ تو یہی ہے کہ قلب انسانی کو اپنے مالک و خالق سے نسبت صحیح حاصل ہو جاتی ہے اسے پتہ لگ جاتا ہے کہ ارض و سما میں مدبر امور کون ہے؟۔

وہ جان جاتا ہے کہ اس کی جان کس کے قبضہ میں ہے؟

اُس کا ایمان خدائے حیّ وقیوم پر کامل ہو جاتا ہے۔

اُس کا اعتماد قریبٌ مجیب کی ہستی پر مکمل ہو جاتا ہے۔

رب العٰلمین کے سمع و بصر اور علم وقدرت کی صفات پر اس کا وثوق مستحکم بن جاتا ہے۔ بندہ کو اپنی بیکسی بلکہ کل عالم کی درماندگی آشکار ہو جاتی ہے، یہی عرفان جس سے بندہ خود اپنی قدر وقیمت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور یہی معرفت جس سے اس کے سامنے کچھ کچھ شانِ الوہیت جلوہ گر ہو جاتی ہے، ہزار منفعتوں کی ایک منفعت ہو۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے، انبیاء اور فرشتے شب وروز ذکر ودعا اور تسبیح واستغفار کو اپنا وِرد بنائے رکھتے ہیں۔

مبارک ہے وہ انسان جسے دعا مانگنا آجائے۔ مبارک ہے وہ انسان جسے دعا مانگنے والوں کے زمرہ میں جگہ مل جائے، دعاء کی منفعت خود لذتِ دعا ہے۔ اور دعا کی اجابت دعا پر مداومت کا ثمر ہو جاتا ہے۔ یہ وہ فائدے ہیں جو آغاز کار میں عطا فرمائے جاتے ہیں۔

دعا مانگنے والے کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے زیادہ خوش ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ مانگتا ہے۔ جس طرح انسان اس شخص سے ناراض ہو جاتے ہیں جو ان سے ہر وقت مانگا کرتا ہے۔ پس دعا مانگنے کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہے کہ دعا مانگنے والا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کرتا ہے۔

اے رب! ہم کو اپنے در کا فقیر بنا دے۔

اے رب! ہم کو اپنے گھر کا سوالی بنا دے۔

اے رب! ہم کو مانگنا سکھلا دے۔

نہایت ضروری مسئلہ | یاد رکھو، خواہ کوئی وظیفہ ہو، کوئی دعا ہو، اس کے اول وآخر بلکہ اُس کے درمیان میں بھی درود شریف ضرور ضرور پڑھنا چاہیے۔ سب سے افضل وہ درود ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

اسلامی تہذیب میں انسانیت کا مقام

(از:۔ استاذ مصطفیٰ السباعی)

اسلامی تہذیب اور اسکے آثار کا ایماندارانہ مطالعہ کرنے والا اس تہذیب کے رگ و پے میں بسے ہوئے اس گہرے انسانی شعور کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے جو دوسرے تہذیبی نظاموں کے مقابلہ میں اس تہذیب کا خاص امتیاز ہے۔ اسی انسانی شعور کی بدولت ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تہذیب انسانیت کو کینہ و افتراق اور طبقاتیت و گروہ بندی کی تنگ و تاریک فضاؤں سے نکال کر محبت و تعاون، اخلاص و رواداری اور برابری ـــــ اللہ کے حضور بھی، قانون کی نظر میں بھی، اور سماجی نظام میں بھی ـــــ ایسی برابری کی حیات بخش فضاؤں میں لے جاتی ہے، جن میں کسی نسل کی دوسری نسل پر، کسی گروہ کی دوسرے گروہ پر، اور کسی قوم کی دوسری قوم پر ـــــ زور دستی کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا ـــــ یہ عظیم انسانی شعور ہمیں اسلامی تہذیب کے ہر دائرے میں جھلکتا ہوا ملتا ہے۔ اصول و مبادی دیکھئے تو وہ اس شعور سے لبریز ہیں۔ احکام و قوانین دیکھئے تو وہ اس رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، اور عمل کے میدان میں آئیے تو وہاں یہی شعور واقعیت کا روپ دھارتا ہوا ملتا ہے۔

اسلامی تہذیب کے مبادی اور عظیم تر انسانی شعور

مبدءِ اول:۔ اسلامی تہذیب کے مبادی میں اس عظیم تر انسانی شعور کا سب سے پہلا جلوہ ہم اس وقت دیکھتے ہیں جب اسلام کا یہ اعلان سامنے آتا ہے کہ تمام لوگ ایک نفس انسانی کی اولاد ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ　　اے لوگو! ڈرو اپنے پروردگار سے جس نے

اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ	پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور پیدا کیا
وَخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ	اس جان سے اس کا جوڑا۔ اور پھیلائے
مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً۔	ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں۔

پس اسلام نے بتایا کہ جمیع ابناء بشریت کی بشری اصل ایک ہے، اور اس کے بعد ان میں قوم و وطن اور جنس و قبیلے کی جتنی بھی تقسیمیں ہو جائیں وہ سب ایسی ہیں جیسے ایک گھرانے کی اور ایک ماں باپ کی اولاد کی تقسیم۔ اور یہ اختلاف و تقسیم اور تعدد و تفرق جب اس طرح کا ہوا تو لازم ہوا کہ اس سے انسانوں میں باہم تعارف، تعاون اور خیر خواہی کا جذبہ بروئے کار آئے۔

مبدء ثانی:۔ چنانچہ یہاں سے ایک دوسری اصل پھوٹتی ہے۔ اور اسلام اپنے تہذیبی نظام کے اس دوسرے انسانیت انگیز اساسی تصور کو یوں اُبھار کر سامنے لاتا ہے:۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ	اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تم کو ایک مرد
مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ	اور ایک عورت سے اور بنایا ہے تم کو قومیں
شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	اور قبیلے تا کہ پہچان کرو ایک دوسرے کی۔

پھر وہ اس حقیقت پر نظر کرتا ہے کہ زندگی کی کشمکش میں بعض افراد اُبھر جاتے اور بعض پست ہو جاتے ہیں، بعضوں کے گھر میں ہُن برستا ہے اور بعض نان جویں کو محتاج نظر آتے ہیں، ایک شخص ہوتا ہے جو حکومت کرتا ہے دوسرے اطاعت و انقیاد کے مقام پر کھڑے ہوتے ہیں، بعض تو میں سرخ و سپید اور بعض سیاہ فام ہوتی ہیں۔

مبدء ثالث:۔ وہ کہتا ہے کہ ہر چند یہ ایک لابدی چیز اور زندگی کی ناقابل تغیر اور ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو زندگی کے بلند معیار کو پا گیا اُسے پست کے مقابلہ میں، جو زردار ہو گیا اُسے بے زر کے مقابلہ میں، جسے حکومت کا مرتبہ مل گیا اسے محکوموں کے مقابلہ میں اور جو گورے رنگ پر پیدا ہو گیا اُسے کالوں کے مقابلہ میں کوئی امتیاز بھی مل گیا، یا کسی امتیازی حیثیت کا استحقاق اُس کے لئے پیدا ہو گیا، نہیں! ہرگز نہیں! سب برابر ہیں اللہ کی نظر میں اپنی آدمیت اور انسانیت میں سب کا درجہ ایک ہے۔ کسی کو دوسرے پر

کوئی فوقیت نہیں، مگر تقوے کی بنیاد پر۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (قرآن)	بے شک تم میں زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ ڈرنے والا ہے۔

قانون کی نظر میں سب برابر ہیں، کوئی تفریق نہیں، مگر حق کی بنا پر۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہٗ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہٗ۔ (قرآن)	پس جو عمل کرے گا ایک ذرہ برابر بھی بھلا وہ اسکو دیکھے گا۔ اور جو عمل کرے گا ذرہ برابر بھی برا وہ اسکو دیکھے گا۔

سماج میں سب کا درجہ ایک ہے۔ قوی ضعیف کے حالات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اور افراد کے فعل سے معاشرہ کا متأثر ہونا ناگزیر ہے۔

مثل المؤمنین فی توادّھم وتراحمھم کمثل الجسد الواحد اذا اشتکیٰ منہ عضوتداعی لہ سائر الاعضاء بالحمّی والسھر (حدیث)	اہل ایمان کی مثال باہمی محبت و ہمدردی میں بالکل ایسی ہے جیسے ایک جسم ہو۔ جب اسکے کسی حصہ کو تکلیف ہوتی ہے۔ پورا بدن اس سے متاثر ہوکر بخار اور بے خوابی میں اس کا شریک حال ہوتا ہے۔

یہی چند تصریحات نہیں ہیں، بلکہ قرآن و حدیث میں بکرّات و مرّات اس حقیقت کو دُہرایا گیا اور صریح ترکیا گیا ہے کہ تمام انسان انسانی وحدت کی لڑی میں بالکل اسی طرح منسلک ہیں جس طرح ایک ماں باپ کی اولاد۔ اور پورا انسانی معاشرہ ایک ایسی اجتماعی وحدت ہے جیسے ایک درخت کہ جب ہوا کا کوئی جھونکا اسے چھوکر گزرتا ہے تو اوپر اور نیچے کی تفریق کے بغیر درخت کی ہر ہر شاخ حرکت میں آجاتی ہے۔ اگر غور کیجئے تو اسلام کے اس موقف کو سمجھنے کے لئے بظاہر یہ ایک معمولی سی بات بھی بہت مفید ہوسکتی ہے کہ قرآن عموماً لوگوں کو ایسے الفاظ سے خطاب کرتا ہے جو ان میں وحدت اصل کا شعور بیدار کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے یاایّھا النّاس! ــــ یابنی آدم اسی طرح دین واحد کے پیرووں کو خطاب کرتا ہے تو کہتا ہے یاایّھا الّذین آمنوا! ــــ ایّھا المؤمنون! انسانیت کے جمیع فرزند ہوں یا دینِ واحد کے پیرو، سب کو ایک سطح پر

رکھ کر خطاب کرتا ہے۔ اُن کے مابین کسی امتیاز اور تفریق کا شائبہ تک گوارا نہیں کرتا۔

اسلامی قانون و شریعت اور وحدت انسانیت

اسلامیات و عبادیات کے بعد احکام و قوانین کے دائرہ میں قدم رکھیے، تو یہاں بھی ہر ہر بات میں وہی عظیم انسانی شعور جلوہ گر ملے گا۔ سب سے پہلے خالص دینی ابواب لیجیے۔ نماز میں اسلام تمام انسانوں کو اللہ کے حضور ایک صف میں کھڑا کرتا ہے۔ کسی عالم کسی رئیس و امیر اور کسی بادشاہ تک کے لیے کوئی مخصوص اور ممتاز جگہ نہیں ہو سکتی۔ روزے میں سب کو یکساں طور پر بھوکا رہنا ہوتا ہے کوئی حاکم، کوئی دولتمند اور کوئی ذی مرتبت کوئی الگ قسم کا روزہ نہیں رکھ سکتا۔ حج میں سب ایک لباس پہنتے ہیں۔ ایک جگہ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک سی عبادت کرتے ہیں۔ قریب و بعید، قوی و ضعیف اور خواص و عوام کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔

ان خالص دینی احکام کے بعد جب آپ اسلام کے قوانین اجتماع پر نظر کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہاں لوگوں کے باہمی تعلقات و معاملات کی بنیاد صرف اور صرف حق ہے، پورے قانون کی روح عدل ہے۔ اور گویا قانون نے ظلم و جبر کے استیصال کا جھنڈا اٹھا رکھا ہے کہ ہر مجبور و مظلوم اسکے نیچے آجائے۔ اس کے بعد جب آپ خاص قانون تعزیرات کی طرف آئیں گے تو دیکھیں گے کہ ہر جرم کی سزا ہر شخص کے لئے ایک ہے۔ کوئی بھی ہو اگر وہ قاتل ہے تو قصاص میں قتل کیا جائے گا، چوری جو بھی کرے گا، وہ چوری کی سزا پائے گا، اور زیادتی جو بھی کرے گا وہ اس کا مزہ چکھے گا۔ بغیر اس تفریق کے کہ قتل کرنے والا عالم ہے یا جاہل۔ مقتول کوئی حاکم تھا یا کسان! اور عام اس سے کہ زیادتی جس نے کی وہ مسلمانوں کا امیر تھا یا کپڑا بننے والا غریب۔ نیز عام اس سے کہ مظلوم عربی تھا یا عجمی اور شرقی تھا یا غربی ——— الغرض قانون کی نظر میں سب بالکل برابر ہیں۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی

آزاد کو اگر آزاد نے قتل کیا ہے تو وہ آزاد ہی بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ غلام کو اگر غلام نے قتل کیا ہے تو صرف وہ غلام ہی قتل کیا جائے گا، اسی طرح عورت اگر عورت کی قاتل ہے تو اُس عورت ہی سے قصاص لیا جائے گا۔

اور اس سے بھی آگے بڑھکر یہ دیکھئے کہ اسلامی قانون انسانوں کے رنگ و نسل اور کیش و ملت سے بالکلیہ قطع نظر کرتے ہوئے سب کو یکساں طور پر انسانی شرف و عظمت کا حامل ٹھیراتا ہو۔ اور کہتا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ　　　اور یہ حقیقت ہو کہ ہم نے عزت بخشی بنی آدم کو۔

یہی عزت و کرامت ہے جو ہر ابن آدم کے لئے حیات و معیشت اور علم و عقیدے کے بنیادی حقوق کی ضمانت اپنے اندر رکھتی ہے، اور حکومت پابند ہوتی ہے کہ بلا کسی استثناء اور امتیاز کے ہر شخص کے یہ حقوق مہیا کرے ——— اس طرح اسلامی قانون کو انسانیت پروری کی جو ایک نئی رفعت حاصل ہو جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔

لیکن اسلامی قانون اس سے بھی آگے جاتا ہے اور اُس وقت وہ انسانی عظمت کے شعور و ادراک کی اور بھی بلند تر سطح پر پہنچ جاتا ہے جب وہ اعلان کرتا ہے کہ انسانوں کے ثواب و عذاب کا انحصار ظاہر افعال پر نہیں بلکہ نیات پر ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَىٰ صُوَرِكُمْ　　　اللہ تعالیٰ کی نظر تمھارے ظاہر پر نہیں
وَلٰكِنْ إِلَىٰ قُلُوبِكُمْ　　　بلکہ تمھارے دلوں پر ہے۔

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ　　　اعمال کا معاملہ نیتوں سے وابستہ ہے اور
وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَىٰ　　　ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ ملے گا۔

ایک طرف یہ تصریحات ہیں دوسری طرف یہ معلوم ہے کہ اللہ کے یہاں جس نیت کو قبول حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کی رضا طلبی اور بندگان خدا کے بھلے اور اُن کے نفع کی وہ بے آمیز نیت ہے جس میں کوئی مادی غرض اور تجارتی نفع کی نیت شامل نہو ——— قرآن فرماتا ہو:-

وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا　　　بندگی کرو اپنے پروردگار کی۔ اور بھلائی
الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔　　　کے کام کرو تاکہ تم فلاح یاب ہوسکو۔

یہ بھلائی کے کام جو آپ خالص اللہ کے لئے کرتے ہیں، اسلام بتاتا ہے کہ ان کی صحت کی شرط یہ ہے کہ جو شخص ان نیک کاموں سے مستفید ہوتا ہو اُس سے کسی صلے یا شکرانے کی

طمع نہ کی جائے، دیکھئے وہ ایسے کاموں کی تعریف کرتے ہوئے کس طرح اس بلند جذبہ کو ابھارتا ہے، فرمایا جاتا ہے:۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ	اور وہ لوگ اپنی ضرورت اور خواہش
حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا	کے علی الرغم مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں
وَأَسِيرًا. إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ	کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (اور زبان حال
لِوَجْهِ اللَّهِ، لَا نُرِيدُ	سے کہتے ہوتے ہیں کہ) ہم تمھیں صرف اللہ
مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا	کے لئے کھلاتے ہیں تم سے کوئی صلہ اور
(قرآن)	کسی قسم کا شکریہ نہیں چاہیے۔

آپ سمجھتے ہوں گے کہ اسلام کے قانون عمل میں انسانی شعور کی بلندیوں کی شاید یہ آخری حد ہوگی۔ جی نہیں! اس شعور و ادراک کی ایک اور بلندی باقی رہ گئی تھی اسکو بھی اسلام اس وقت سر کرلیتا ہے جب وہ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ کی غلامی اور اسکے تکوینی قانون کی اطاعت گزاری کے لحاظ سے عالم انسانیت عالم حیوانیت عالم نباتات وجمادات اور ارض و افلاک سب ایک وحدت ہیں۔ کیا عجیب انداز ہے، جس میں قرآن ہر مسلم سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی نماز کی ہر رکعت میں اس حقیقت کو تازہ کرلیا کرے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ	ہر تعریف کا سزاوار اللہ ہی جو رب
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	ہے تمام عالموں کا۔ رحمٰن ہے اور رحیم ہے۔

یہ خوبصورت اور بلیغ یاددہانی تلقین کرکے قرآن نے گویا ہر مسلم کو یہ یاد رکھنے کا پابند کردیا ہے کہ وہ اس وسیع کائنات کا ایک جزء ہے جو بے پایاں رحمت والے معبود برحق کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اور اس کا قدرتی تقاضا یہ ہے کہ مسلم، جو اسی عالم میں زندگی بسر کرتا اور قدم قدم پر اس سے احتیاج رکھتا ہے، اسی عالمگیر اور ہمہ گیر رحمت کا نمونہ بن کر رہے جو اللہ کی شان ہے۔ درانحالیکہ اُسے اس عالم سے کوئی احتیاج نہیں۔

اسلامی تہذیب عمل کی امتحان گاہ میں یہ وہ مظاہر ہیں جن سے ہماری تہذیب کے مبادی و احکام میں انسانی شعور کی کیفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر آپ

کو خیال ہو سکتا ہے کہ یہ صرف اعلانات تھے یا یہ تہذیب جب وقت کی غالب تہذیب ہوئی اور اُسے عمل کے سانچہ میں ڈھلنے کا موقع ملا تو اس کا واقعاتی روپ بھی یہی تھا؟ کہیں اِن رفیع الشان مبادی کا حشر انسانی حقوق کے اس بین الاقوامی چارٹر کا سا تو نہیں ہوا جس کی سالانہ یادگار حکومتیں بڑی شان بان سے مناتی ہیں، درانحالیکہ دنیا کی بڑی طاقتیں سال کے ہر مہینے، مہینے کے ہر دن اور دن کی ہر ساعت میں اسے پامال کیا کرتی ہیں؟ کہیں یہ بلند بانگ اصول و مبادی اسی خاص ملک میں تو محدود ہو کر نہیں رہ گئے جہاں ان کا اعلان ہوا تھا، جیسے کہ انقلاب فرانس کے اصول و مبادی فرانس ہی کی سرزمین میں مقید کر دیے گئے اور فرانس کی نوآبادیات اور اس کے زیر انتداب علاقے آج تک اِن اصولوں کے استعمال سے محروم ہیں؟ ——— آپ سوچ سکتے ہیں کہ کہیں ان خوشنما اصولوں کی اسی طرح کی جھوٹی نمائش تو ان اصولوں کا اعلان کرنے والوں نے نہیں کی کچھ نئے مجسمے نصب کر دیے ہوں جیسا کہ نیویارک میں آزادی کا مجسمہ اس انداز سے نصب کیا گیا ہے کہ اس دیار میں قدم رکھنے والے کے سامنے سب سے پہلے حریت پسندی کی یہی نمائش آتی ہے درانحالیکہ بیرونی دنیا میں یہی امریکہ وہ کام کرتا ہے جو زبانِ حال سے حریت و آزادی پر لعنت برساتے، اس کا تمسخر اڑاتے اور آزادی کے متوالوں کے لئے زہر کا گھونٹ تجویز کرتے ہیں؟

آپ کو یہ سب خیالات آسکتے ہیں، آئیے تاریخ سے فیصلہ مانگئے، کہ اُس سے زیادہ سچی بات کوئی اور نہیں بتا سکتا۔ آئیے تاریخ سے ہماری تہذیب کے انسانی شعور کی دلآویز کیفیتوں کا تذکرہ سنئے، اور دیکھئے کہ اس تہذیب کے علمبرداروں اور سربراہوں کے اعمال میں کس طرح یہ شعور ایک بولتی ہوئی حقیقت بن کر سامنے آرہا ہے۔

۱۔ ابوذرؓ، جو غفار کے عربی قبیلہ کے ایک فرد تھے، کسی بات پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام، سیاہ فام بلال حبشی سے بگڑ گئے ——— یہ دونوں رسولِ پاک کے صحابی تھے ——— بات کچھ اتنی بڑھی کہ ابوذر نے غصہ سے بے قابو ہو کر بلالؓ سے کہا کہ "او حبشن کی اولاد"۔ بلالؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی۔ آپ جانتے ہیں رسول عربی نے کیا کہا؟ فرمایا ابوذرؓ "تم نے بلال کو اُس کی ماں کی طرف عار دلائی ہے؟ تم میں ابھی جاہلیت

کے اثرات ہیں!" ابوذر، جو جاہلیت کا مصداق محض شہوت پرستانہ اخلاقی بے راہ روی کو سمجھتے تھے ـــــ جو کہ صرف نوجوانوں ہی سے ممکن ہے ـــــ اس پر بولے کہ "کیا حضور اس بڑھاپے کے باوجود مجھ سے جاہلیت سرزد ہو سکتی ہے"؟ آپ نے فرمایا "ہاں" ـــــ یہ جو تم نے بلال کے ساتھ کیا یہ جاہلیت ہی تو ہے ـــــ اسلامی نقطہ نظر سے تو یہ تمہارے برابر کے بھائی ہیں"! ابوذر پشیمانی کی تصویر بن گئے، تائب ہوئے، اور توبہ کی اس بلندی پر پہنچے کہ بلال سے کہا کہ مجھے منہ کے بل ڈال کر اپنے پیروں سے روند دو!

۲۔ قریش کی شاخ بنی مخزوم کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں چوری کی۔ وہ سزا کے لئے حضور کی خدمت میں لائی گئی۔ قریش پر یہ بات بڑی بھاری ہوئی جنا ہوئی کہ کوئی سفارش کرتا کہ حضور اس پر حد جاری نہ فرمائیں۔ خیال آیا کہ اسامہ بن زید آنحضرت کو بڑے محبوب ہیں۔ ان سے بات کی گئی کہ وہ سفارش کریں، وہ سفارش کرنے گئے۔ آپ جانتے ہیں کیا ہوا حضور نے شدید ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ کیا تم حدود اللہ میں سفارش کی جرأت کرتے ہو؟ پھر لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا اور فرمایا:-

"تم سے پہلی امتیں اسی میں ماری گئیں کہ جب ان میں کوئی باثر اور اونچے طبقہ کا آدمی چوری کرتا تو چھوڑ دیا جاتا اور اگر معمولی آدمی پکڑا جاتا تو اس پر حد جاری کی جاتی۔ خدا گواہ ہے کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹے بغیر نہ رہتا۔"

۳۔ صحابہ (غالباً انصاری صحابہ) کے ایک حلقہ میں سلمان فارسی، صہیب رومی اور بلال حبشی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک منافق (قیس بن مطاطیہ) کا ادھر گزر ہوا۔ کہنے لگا کہ یہ اوس و خزرج والوں کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ یہ محمد کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں اور ان کی مدد کچھ کام دے سکتی ہے۔ مگر یہ لوگ (سلمان و صہیب اور بلال) یہ آخر کس مرض کی دوا ہیں؟ ـــــ معاذ بن جبل انصاری نے اٹھ کر اس منافق کا گریبان پکڑ لیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ بتایا کہ اس نے ایسی بات کہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مارے غصہ کے چادر سمیٹے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی طرح مسجد تک تشریف لائے کہ ردائے مبارک گھسٹتی ہوئی آرہی تھی منادی کرائی گئی اور لوگ جمع ہوئے۔

آپ نے خطاب فرمایا اور کہا۔

اَيُّهَا النَّاس! إِنَّ الرَّبَّ	لوگو! یاد رکھو، تم سب کا رب ایک ہے
وَاحِدٌ وَالْأَبَ وَاحِدٌ	باپ ایک ہے اور دین بھی ایک ہی ہے
وَإِنَّ الدِّينَ وَاحِدٌ۔	(پھر کسی تفریق کے کیا معنیٰ؟)

۴۔ عدی بن حاتم الطائیؓ، اسلام لانے سے پہلے ایک دن مدینے آئے۔ یہاں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پہنچے۔ یہ ایسا وقت تھا کہ اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب آپ کی معیت میں ایک غزوہ سے واپس ہوئے تھے اور اسی جنگی لباس میں آپ کے اردگرد جمع تھے۔ اس فوجی ہیئت میں صحابہ کے ادب و احترام کی کیفیت کے منظر نے عدی بن حاتم پر ایک ہیبت طاری کر دی ——— اور وہ ایسا محسوس کرنے لگے جیسے کسی باجبروت بادشاہ کے دربار میں ہوں ——— اسی اثنا میں مدینہ کی ایک غریب لونڈی رسول اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور عرض کی کہ حضور! میں کچھ تنہائی میں عرض کرنا چاہتی ہوں ——— آپ جانتے ہیں اس عالی دربار سے کیا جواب ملا؟ ——— ارشاد ہوا، بہت اچھا، تو مدینہ کی جس گلی میں کہے میں تیری بات سننے کے لیے چلا چلوں۔ یہ فرماکر آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ الگ جاکر کافی دیر تک کھڑے اس کی بات سنتے رہے۔ وہ بات کر چکی تو واپس تشریف لائے۔ اس پہلے منظر کے پہلو بہ پہلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانی حسن وجمال کا یہ منظر عدی بن حاتم کے دل پر نقش ہوکر رہ گیا۔

۵۔ اکیس سال کی کشمکش وپیکار کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا، اور اس پوزیشن میں آئے کہ جن لوگوں نے آپ کی تکذیب کی تھی، وطن سے نکالا تھا، اور مسلسل جنگ آپ کے خلاف برپا کر رکھی تھی ان سے بھرپور انتقام لیں، تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اس دن آپ کو اس تلخ داستان کا کوئی جز دیاد نہ آیا، یاد آئی تو صرف اپنی دعوت اور اس کے وہ مبادی یاد آئے جو مکہ کے دور محن میں آپ کی زبان پر رہے تھے، اور جن کو بروئے کار لانے کا عملی اعلان آپ نے اس کامل فتح مندی سے بہت پہلے اس وقت کیا تھا جب آپ نے مدینہ میں حاکمانہ اقتدار کے ساتھ اسلام کی ابدی تہذیب کی بنیاد رکھنا شروع کی تھی۔ آپ نے کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہوکر اعلان

فرمایا اور نسلی تکبر و ظالمانہ سماجی امتیازات کے پرستار قریش سامنے کھڑے سن رہے تھے، کہ

"اے جماعتِ قریش! آج سے اللہ کا یہ فیصلہ نافذ ہوتا ہے کہ تمھارے اندر سے جاہلی غرور اور فخر بالآباء کی جاہلی خصلت نکال دی جائے ـــــ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، اور سن لو! کہ آدم مٹی سے بنے تھے۔"

پھر آپ نے پروردگارِ عالم کا وہ ارشاد تلاوت فرمایا جس کی پکار آپ آج سے پہلے برپا کرتے رہے تھے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔	اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے۔ اور بنا دیئے ہیں تم میں قومیں اور قبیلے پہچان کی غرض سے (ان تقسیمات کو عند اللہ بزرگی میں کوئی دخل نہیں) اللہ کے نزدیک تو زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق کی سربراہی کا دور آتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ایک ایسے آئیڈیل رئیسِ مملکت کی خصوصیات کا مجسمہ ثابت ہوئے جس کا دل اور جس کی روح انسانیت سے لبریز ہو۔ وہ خلیفہ ہوتے ہوئے بھی خلافت سے پہلے کی طرح محلہ کی ان بچیوں کے گھر جا جا کر اُن کی بکریاں دوھتے رہے جن کے باپ جہاد میں کام آگئے تھے۔ کوئی کچھ کہتا تو فرماتے تھے، خلافت سے پہلے جو وضع رہی ہے میں پسند نہیں کرتا کہ اس میں کوئی فرق آئے۔

اور عمر کی زندگی کے حقائق پر کون خاک ڈال سکتا ہے؟ آپ ایک ایسے خلیفہ کا تصور کیجئے جسے قوم کے ایک ایک فرد کی عزتِ نفس کا خیال ہو، جو ضعیفوں کا سہارا، حق کے معاملہ میں سخت تر، اور سب کو ایک نظر سے دیکھنے والا ہو۔ نہیں! جس کے اوصاف میں یہ بھی شامل ہو کہ قوم کو دینے کے لئے اپنی ذات کو محروم کرے اور قوم کا پیٹ بھرنے کے لیے اپنا پیٹ کاٹے۔ آپ ایک ایسے خلیفہ کا تصور کیجئے اور پھر اس خیالی تصویر کو عمر کی تاریخی تصویر سے ملا کر دیکھئے

سر مو بھی کوئی فرق آپ کو ان دونوں میں نظر آتا ہے! یہ تھے عمر اپنے دورِ خلافت میں۔ گھروں پر گھوم گھوم کر لوگوں کے حالات جاننے کی کوشش کرتے تھے، اس باب میں ان کے کتنے ہی واقعات ہیں جو زبان زدِ عوام و خواص ہیں۔

ایک مرتبہ ایک ضعیف بوڑھے کو بازار میں صدقہ مانگتے ہوئے دیکھا۔ کہا بڑے میاں کیا کر رہے ہو؟ جواب ملا کہ میں ایک ضعیف بوڑھا ہوں، جزیہ ادا کرنے اور پیٹ بھرنے کے لئے لوگوں سے سوال کر رہا ہوں ــــــ یہ مدینے ہی کا ایک یہودی تھا ــــــ ذرا اس جواب پر عمرؓ کا تاثر سنیئے، اور اس انسانی احساس کی عظمت کا اندازہ کیجئے جس پر وہ فائز تھے ــــــ "بڑے صاحب ہم نے آپکے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ جوانی اور توانائی کی عمر میں آپسے جزیہ وصول کیا اور اب بوڑھاپے میں ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیا" یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے۔ اپنے لئے جو کچھ کھانا رکھا تھا وہ اُسے کھلایا، پھر بیت المال کے خزانچی کو حکم بھیجا کہ اس شخص کے لئے اور رعیت کے اس جیسے تمام افراد کے لئے اتنا وظیفہ مقرر کر دو جو اِن کے اور انکے بال بچوں کیلئے کافی ہو سکے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ عمر مدینے کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے۔ ایک بچی نظر پڑی جو نقاہت سے لڑکھڑا رہی تھی۔ کھڑی ہوتی اور گر جاتی، کھڑی ہوتی اور گر جاتی۔ عمر نے افسوس کرتے ہوئے کہا یہ کس کی بچی ہے؟ صاحبزادے عبداللہ (ابن عمر) نے عرض کیا "امیرالمومنین آپنے اسے نہیں پہچانا؟" فرمایا "نہیں!" صاحبزادے نے عرض کیا "آپ ہی کی بچی ہے۔" کہا "یہ میری کونسی بچی ہے؟" کہا "یہ فلاں ہے آپ کے لڑکے عبداللہ کی (یعنی میری) بچی"۔ حضرت نے فرمایا "اس کا یہ کیا حال کیونکر ہے؟" صاحبزادے نے عرض کیا۔ یہ حال کیسے نہ ہو جبکہ آپ ہمیں محروم رکھتے ہیں! عمر نے کہا "بیٹے خدا کی قسم میں تمھیں اسکے سوا کچھ نہیں دے سکتا جو ایک عام مسلمان کی حیثیت سے تمھارے حصہ میں آتا ہے اب یہ چاہے تمھیں کافی ہو یا ناکافی! اللہ کی کتاب کا میرے اور تمھارے درمیان یہی فیصلہ ہے!

ایک تجارتی قافلہ مدینے میں اُترتا ہے جس میں عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ عمرؓ عبدالرحمٰن بن عوف سے کہتے ہیں کہ کیا تم آج کی رات ان کی پہرے داری کر سکتے ہو۔ وہ راضی ہو جاتے ہیں اور پھر

دونوں مل کر رات بھر اُن کی نگہبانی کرتے اور حسب توفیق نوافل پڑھتے ہیں۔ اسی دوران میں عمر ایک بچے کے رونے کی آواز سنتے ہیں، جدھر سے آواز آئی ہے اُدھر جاتے ہیں، اور بچہ کی ماں سے کہتے ہیں کہ خدا کی بندی اللہ سے ڈر اور اسکی تکلیف دور کر، کیوں رلا رہی ہے؟ اس کے بعد اپنی جگہ واپس آجاتے ہیں، پھر وہی آواز آتی ہے، پھر پلٹ کر جاتے ہیں اور اسکی ماں کو اسی طرح نصیحت کر کے چلے آتے ہیں ـــــ آخر شب میں پھر وہی آواز بچے کے رونے کی آتی ہے، اب کی اس کی ماں کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ بُرا ہو تیرا، بڑی بُری ماں معلوم ہوتی ہے، رات بھر ہو گئی کہ تیرا بچہ بے چین ہے مگر تو اس کے لئے کچھ نہیں کر رہی؟ ـــــ اُسے کیا خبر تھی کہ یہ امیرالمومنین ہیں جو قافلہ کے پہرے پر ہیں۔ اس نے بھی عاجز آکر کہا کہ "اے بندۂ خدا! تو رات بھر سے مجھے خواہ مخواہ حیران کر رہا ہے۔ میں اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں، اس وجہ سے یہ روتا ہے۔" پوچھا "کیوں"؟ ـــــ کہا "اس لئے کہ عمر بچوں کا وظیفہ اس وقت تک مقرر نہیں کرتے جب تک ان کا دودھ نہ چھوٹ جائے۔" حضرت عمر نے پوچھا "اس کی عمر کیا ہے"؟ اُس نے کچھ مہینے کی بتائی۔ آپ نے فرمایا خدا کی بندی اتنی جلدی نہ کر ـــــ صبح ہو چکی تھی آپ نماز پڑھانے تشریف لے گئے۔ نماز میں گریہ کا یہ عالم تھا کہ قرأت صاف سننے میں نہیں آتی تھی۔ سلام پھیرا اور بے اختیار پکارے کہ ہائے عمر کی بدبختی، اس طرح کتنے مسلمانوں کے بچے اس نے ہلاک کرا دیئے ہوں گے! ـــــ پھر ایک شخص کو یہ اعلانِ عام کرنے کا حکم دیا کہ:-

"اپنے بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کرو، ہم آج سے ہر اس بچے کا وظیفہ مقرر کرتے ہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہو۔"

اور پھر یہ حکم پوری مملکت میں نافذ کر دیا گیا۔

قسم ہے لکھنے والے کی عمر کی! تاریخ نے اس سے زیادہ پیارا اور اس سے زیادہ انسانیت انگیز کوئی واقعہ آج تک روایت نہیں کیا، اور اگلی اور پچھلی تمام تہذیبیں عمر کی اس جمہوری ادا کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں کہ ایک قافلہ آکر ٹھیرتا ہے تو اُس کے پہرے کے لیے وہ خود جاگتے اور اُن کے دوست اور ماتحت سوتے ہیں، کون عمر؟ امیرالمومنین!

وہ امیر المومنین ــــ جو کسریٰ وقیصر کو مغلوب کر کے اُن دونوں کی سلطنتوں پر فرمانروا تھا!!
اس شب بیداری اور پہرہ داری میں ان کا شریک صرف ایک شخص ہوتا ہے جسے وہ اپنی معیت کے لئے آمادہ کرتے ہیں، مگر اس معیت کے باوجود اُن کی انفرادیت قائم رہتی ہے، رونے والے بچے کی طرف تنہا وہ ہی متوجہ ہوتے ہیں، تین تین بار جا کر اسکی ماں کو وہ ہی نہائش کرتے ہیں۔ ساتھی کو یہ بات حاصل نہیں ہوتی! ــــ ہم میں سے کون ہے جو ایک اجنبی قافلہ کے بچوں کے بارے میں اتنا انسانی درد رکھتا ہو؟ اور ہم میں سے تو کیا، تاریخی شاہیر میں سے آپ کو کوئی نظر آتا ہے جو اس عظیم انسانی احساس میں عمر کے ہم پلہ ہو؟۔

اور آئیے۔ اسلامی تہذیب کی تاریخ کا میں ایک اس سے بھی زیادہ تابندہ ورق آپ کے سامنے کھولتا ہوں۔

عمر کے خادم اسلم راوی ہیں۔ ایک رات میں حضرت عمرؓ کے ساتھ گشت میں نکلا۔ گھومتے گھومتے ہم مدینہ سے باہر نکل گئے تھے اور نواحی بستیوں کے باشندوں کے احوال کا تجسس کر رہے تھے، دور ایک جگہ آگ جلتی ہوئی دکھائی دی۔ حضرت عمرؓ بولے، میں سمجھتا ہوں یہاں کوئی قافلہ ہے جسے رات اور سردی آڑے آگئی ہے۔ آؤ چلیں۔ ہم تیزی کے ساتھ اس رُخ پر چل کر اُن لوگوں کے پاس پہنچ گئے۔ ایک عورت نظر آئی جس کے ساتھ بچے تھے اور پاس ایک ہانڈی آگ پر چڑھی ہوئی تھی۔ بچے بڑی طرح رو رہے تھے۔ عمر نے سلام کیا اور عورت سے پوچھا، کیا معاملہ ہے۔ یہاں تم لوگ کیسے ہو؟ جواب ملا "رات اور سردی نے رُکنے پر مجبور کر دیا ہے" ــــ "اچھا یہ بچے کیوں رو چیخ رہے ہیں؟" "بھوک کی وجہ سے!" ــــ "ہانڈی میں کیا چڑھا ہے؟" ــــ "پانی ہے، تاکہ بہلا کر انھیں سلا دوں!" اور یہ کہتے ہوئے اس نے کہا "اللہ عمر کے اور ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا" ــــ وہ نہیں پہچانتی تھی کہ عمر ہی سے بات کر رہی ہے ــــ عمر نے کہا ارے، خدا کی بندی، خدا تجھے خوش رکھے، عمر بیچارے کو تمھارے حال کی کیا خبر! کہ اسکی تم شکایت کرو، عورت نے کہا۔ حکومت سنبھالی لی اور رعایا کے

حال کی خبر تک نہیں! ـــــ یہ مکالمہ پورا ہوا، عمرؓ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا چلو۔ ہم بڑی تیزی سے چلتے ہوئے سرکاری آٹے کے گودام پر آئے۔ عمرؓ نے وہاں سے ایک بوری آٹا لیا اور کچھ چربی اس کے ساتھ باندھی اور پھر مجھ سے کہا "یہ اٹھا کر میرے اوپر لاد دو۔" میں نے عرض کیا "نہیں میں لاد لوں گا" فرمایا "کیا قیامت کے دن بھی تو میرا بوجھ اٹھا لے گا؟" میں نے مجبوراً وہ سامان ان کی پیٹھ پر لاد دیا۔ اس کو لے کر وہ تیزی کے ساتھ اس عورت کی طرف روانہ ہوئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ اس کے پاس پہونچ کر یہ سامان اتارا، اور کچھ آٹا نکالا۔ پھر اس عورت سے کہا ذرا تم پتیلی میں آٹا گھولتی جاؤ میں اسے ہلاتا جاؤں گا اور پھر خود پتیلی کے نیچے آگ بھی پھونکنا شروع کی۔ آپ کی ڈاڑھی بڑی تھی، چنانچہ میں اس حال میں دیکھ رہا تھا کہ دھواں ڈاڑھی کے درمیان میں سے نکل کر جا رہا تھا۔ اسی طرح لگے رہے یہاں تک کہ حریرہ تیار کر دیا۔ پھر اس کو اتارا اور عورت سے کہا کہ اسکے نکالنے کے لیے کچھ دو، اس نے ایک بہت بڑا پیالہ نکال کر دیا اور آپ نے ہانڈی اس میں خالی کر دی۔ پھر آپ نے اس سے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا کہ اب تم ان بچوں کو کھلاتی جاؤ اور میں پھیلا پھیلا کر حریرہ ٹھنڈا کرتا جاتا ہوں، آپ برابر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ بچے آسودہ ہو گئے۔ بقیہ کھانا اس کے پاس چھوڑا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہو گیا عورت نے شکر کے ساتھ کہا جزاک اللہ خیراً۔ امارت کے مستحق دراصل تم تھے، امیر المومنین (عمر) نہیں! عمرؓ نے اس پر کہا، اچھی بات کہو۔ اگر تم امیر المومنین کے پاس آؤ گی تو انشاء اللہ مجھے وہاں پاؤ گی۔ یہ کہہ کر چل دیئے اور ایک آڑ میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر ٹھہر کر پھر اس کی طرف کو آئے اور بکری کی طرح دبک کر بیٹھ رہے ـــــ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے عرض کیا کہ حضرت! اب اس کے پیچھے کب تک پڑے رہیے گا؟ مگر انھوں نے کچھ جواب نہ دیا، حتیٰ کہ بچوں کو میں نے دیکھا کہ لیٹ گئے اور پھر سو گئے۔ یہ دیکھ کر عمرؓ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کھڑے ہوئے اور اب میری طرف متوجہ ہو کر بولے اسلم! بھوک نے انہیں بے چین کیے رکھا تھا اس لیے میرا جی چاہتا تھا کہ اس وقت تک یہاں سے نہ جاؤں جب تک اپنی آنکھ سے انھیں آرام سے سوتا ہوا نہ دیکھ لوں۔

انسانیت کی اسی منفرد نوع کا، عمرؓ ہی کا وہ واقعہ بھی ہے کہ ایک شب جب وہ حسب عادت گشت پر تھے اور مدینہ کے ایک کھلے میدان میں گزر رہے تھے تو ان کا گزر ایک بالدار خیمہ پر سے ہوا جس سے ایک عورت کے کراہنے کی آواز آرہی تھی اور دروازے پر ایک مرد بیٹھا ہوا تھا، عمرؓ نے اس شخص کو

سلام کیا۔ اور پوچھا کون ہو؟ جواب ملا کہ ایک بدوی ہوں، امیرالمؤمنین کے جود وعطا سے کچھ حاصل کرنے کے ارادہ سے آیا ہوں۔ عمر نے کہا کہ یہ اندر سے آواز کیسی آرہی ہو؟ وہ آدمی، جسے معلوم نہیں تھا کہ وہ امیرالمؤمنین سے مخاطب ہو، شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا میاں جہاں جارہے ہو، جاؤ، یہ سب پوچھ کر تم کیا کروگے؟ عمر مُصر ہوئے کہ نہیں بتاؤ تو، اس نے بتایا کہ اندر میری بیوی ہے جسے دردِ زِہ ہو رہا ہو، اور اس کے پاس کوئی رہنے نہیں! عمر یہ حال معلوم کرکے اپنے گھر آئے۔ اور اپنی اہلیہ اُم کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ سے بولے کہ ایک ثواب کمائی جو خود چل کر تمھارے پاس آگیا ہو؟ اہلیہ نے دریافت کیا: "کیا ہے؟" آپ نے پوری بات بتائی، اور فرمایا کہ ایک تو مولود کے لیے کپڑوں کی اور زچہ کے لیے تیل وغیرہ کی جو ضرورت ہوتی ہو وہ ساتھ لے لو، نیز ایک ہانڈی لے لو اور اس میں کچھ کھانے کا سامان رکھ لو، ام کلثوم نے فوراً تیاری کرلی، عمر نے ہانڈی اُٹھائی اور اُم کلثوم اُن کے پیچھے پیچھے چلیں، منزلِ مقصود آگئی۔ عمر نے کہا تم اندر چلی جاؤ اور خود مرد کے پاس باہر بیٹھ گئے۔ دم خود آگ جلائی اور جو کچھ لائے تھے اُسے پکا کر تیار کیا، بدوی غریب بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ اُسے بالکل نہیں پتہ تھا کہ یہ کون ہو۔ اتنے میں اندر ولادت کا مرحلہ طے ہوگیا، اور حضرت ام کلثوم کی آواز آئی: "امیرالمؤمنین اپنے دوست کو خوشخبری دیجئے فرزند کی!" ـــــ یہ آواز جو بدوی کے کانوں میں پہونچی، اور معلوم ہوا کہ یہ تو امیرالمؤمنین ہیں، تو اس کے تو ہوش خراب ہوگئے۔ ایک دم سے اُٹھ کر دور بیٹھنے لگا، عمر نے فرمایا، نہیں نہیں، اپنی جگہ رہو، مجھ سے دور ہونے کی ضرورت نہیں، پھر ہانڈی اٹھائی اور اہلیہ کو پکارا کہ اندر لے جاکر عورت کو کھلاؤ، جب وہ کھا چکی تو واپس منگا کر اس کے مرد کو دی اور اس سے کہا۔ لو میاں کھا پی لو، تم رات بھر حیران رہے ہو ـــــ اس کے بعد اہلیہ کو لے کر روانہ ہوگئے۔ اور چلتے وقت بدوی سے کہا، کل ہمارے پاس آجانا، تمھارے لیے کچھ بندوبست کر دیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو بدوی پہونچا، آپ نے اس کے بچے کے لیے وظیفہ مقرر فرما دیا، اور اُسے بھی کچھ دیا۔

میں دیانتداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے دنیا کے بڑے آدمیوں کی زندگی کا جو کچھ مطالعہ کیا ہو، انسانی نقطۂ نظر سے اتنا بلند اور اتنا دلکش نمونہ میں نے نہیں دیکھا۔ واشنگٹن کے حالات میں میں نے پڑھا ہو کہ وہ ایک دن اس شہر کی کسی سڑک سے گزر رہے تھے جو آج انھیں کے

نام سے موسوم ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک جگہ کچھ سپاہی ایک پتھر کو اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو رہے تھے، ان کا ایک افسر پاس کھڑا ہوا تھا، مگر اُن کی مدد سے مطلق دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ واشنگٹن نے اس سے کہا کچھ آپ کو بھی مدد کرنی چاہیے، افسر نے جواب دیا "جی نہیں یہ میرے مرتبہ سے فروتر ہے" واشنگٹن نے اپنا گون اتار کر ایک طرف ڈالا اور ان کی مدد کر کے پتھر اٹھوا دیا۔ اس کے بعد اُن سے کہا "تمھیں جب مدد کی ضرورت ہو واشنگٹن کے گھر آجاؤ" ــــ بیشک یہ ایک کمیاب نمونہ ہے اور اعلیٰ کیرکٹر کی نشاندہی کرتا ہے! مگر کہاں یہ اور کہاں عمر کی پیش کی ہوئی مثال کہ رات کی نیند اور آرام چھوڑ کر عوام کی خبرگیری ہو رہی ہے، ایک حاملہ عورت کا پتہ چلتا ہے جو قریب الولادت ہے۔ کوئی اُس کے پاس مونس و مددگار نہیں ہے، گھر واپس آتے ہیں بیوی کو جگا کر ساتھ لیتے ہیں پھر دونوں (امیر المومنین اور اُن کی بیگم) اس شان سے رات کی اندھیری میں پیادہ پا اس غریب الدیار کی مدد کے لیے روانہ ہوتے ہیں، کہ امیر المؤمنین کھانا اُٹھائے ہوئے ہیں، اور بیگم صاحبہ کپڑوں کی پوٹلی دبائے ہوئے ہیں۔ اس شان سے چل کر بدوی کے خیمہ پر پہونچتے ہیں اور یہاں عمر کی اہلیہ جنھیں ہماری آج کی زبان میں مملکت کی پہلی خاتون (first Lady of the State) کہا جانا چاہیے، ایک دائی کے فرائض انجام دیتی ہیں، اور امیر المومنین عمر "خانساماں" کے روپ میں نظر آتے ہیں! ــــ انسانی احساس کی اس بلندی کی کیا مثال لائی جا سکتی ہے جس پر روئے زمین کا کوئی حکمراں عمر کے سوا آج تک نہیں پہونچا؟ ــــ یہ عمر کی منفرد عظمتوں میں سے ایک عظمت کا نشان ہے۔ اور ہماری اس تہذیب کے حسین ابواب میں سے ایک باب ہے جس نے عمر کو ایک ایسے پیکر میں ڈھالا جو آج تاریخ کی عظیم شخصیتوں میں اسی طرح سب سے اوپر کھڑا نظر آتا ہے جس طرح اسلامی تہذیب تمام دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں۔

اور یہ انسانیت عظمیٰ کا صرف ایک پتلا نہیں ہے جو ہماری تہذیب نے ڈھالا ہو، ابوبکر میں یہی انسانیت جلوہ گر ہے، عثمان و علی کی سیرتوں میں انسانیت کی یہی بلندیاں ہیں، عمر بن عبدالعزیز اسی انسانیت کا پرتو ہیں، صلاح الدین ایوبی کی زندگی اسی کا ثبوت ہے اور ان کے علاوہ علماء، عظماء، قائدین، صوفیاء اور فلاسفۂ اسلام میں سے کتنوں ہی کی زندگیاں ہیں جو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر امت شہادتیں فراہم کر رہی ہیں کہ انسانیت کا بلند ترین شعور اسلامی تہذیب کا خاص حصہ ہے۔

(ماہنامہ المسلمون (دمشق) سے ترجمہ)

تعارف و تبصرہ

صبح امید | از، مولانا ابوالکلام آزاد، صفحات ۳۰۴، سائز متوسط ۱۸×۲۲/۸ کتابت طباعت معمولی۔ مجلد قیمت ۶/- ناشر: سنگم کتاب گھر، اردو بازار دہلی

مضامین آزاد کے نام سے مولانا مرحوم کے مضامین کا جو انتخاب ایک عرصہ ہوا ہندستانی پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے دو جلدوں میں شائع ہوا تھا، کچھ اضافوں کے ساتھ اسی کا یہ ایک حصہ ہے جو مولانا عزیز الرحمٰن جامعی نے سنگم کتاب گھر دہلی کی طرف سے شائع کرایا ہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت کی ذمہ داریاں جناب حافظ فیاض احمد صاحب (جامعہ ملیہ) نے انجام دی ہیں۔

مضامین آزاد کے علاوہ کتاب کے شروع میں کچھ لوگوں کے تأثرات و آراء بھی مولانا مرحوم سے متعلق درج کی گئی ہیں، بلکہ اسی میں خود مولانا کے اپنے قلم سے بھی اپنا وہ مشہور تعارف ہو جو تذکرہ میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب کے اس حصہ کو "شیش محل" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

مضامین کا حصہ جو "صبح امید" کے نام سے موسوم ہے مولانا مرحوم کے ۱۵ مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ سب مضامین مولانا کے "الہلالی" دور کے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ مولانا کی بعض آخری دور کی تقریریں بھی اس حصہ میں شامل کر دی گئی ہیں۔ تقسیم کے بعد کی پہلی تقریر جو مولانا نے جامع مسجد دہلی میں فرمائی، اور زبان کے مسئلہ پر پارلیمنٹ کی تقریر بھی ان تقریروں میں شامل ہے۔

اس مجموعہ مضامین کا نام اسی میں کے ایک مضمون "صبح امید" کے عنوان سے مستعار لیا گیا ہے۔ مگر ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مجموعی طور پر کوئی مناسبت اس نام اور کتاب میں نہیں ہے علاوہ ازیں ایک احساس ہمارا یہ بھی ہے کہ مضامین کا یہ انتخاب اگر آج سے ۱۵ برس پیشتر جامعہ ملیہ کے

"چند منچلے اولڈ بوائز" نے کیا تھا تو کچھ ایسا بیجا نہیں تھا۔ مگر یہ انتخاب مجموعی طور پر اس شان کا ہرگز نہیں تھا کہ جامعہ کے سنجیدہ بزرگ اسے آج مولانا آزاد کی یاد قائم رکھنے اور ان کے فیض و برکات کو باقی رکھنے کی نیت سے دوبارہ شائع کرتے، الہلال کے دورِ ادارت میں مولانا کی طبیعت کا ایک خاص انداز تھا جس کے اثر سے تنقید و احتساب اور نوک جھونک کے میدان میں اُن کا قلم بے پناہ شوخی اور سخت بے رحمی کے مظاہرے کرتا تھا، اِس اندازِ طبیعت کو بعد میں مولانا خود ناپسند کرنے لگے تھے۔ چنانچہ مہر صاحب کے شائع کردہ خطوط (نقشِ آزاد) میں ایک خط میں یہ بات صراحتاً ملتی ہے۔ "ندوۃ العلماء" اور "حظ و کرب" کی بحث کے سلسلہ کے دونوں مضمون مولانا کے اسی اندازِ طبیعت کا عکس ہیں۔ ان میں کوئی خاص افادی پہلو تو ہے نہیں، البتہ کچھ تلخ اور ناخوشگوار یادوں کو یہ ضرور اُبھار دیتے ہیں۔ اسی طرح "نشۂ نیم شبی کا خمار" پڑھ جائیے تو اس میں شوخی کی لذت کے سوا کچھ ہاتھ آنا مشکل ہے۔ اور صرف اسی لذت کے لئے اسے پڑھا جا سکتا ہے ــــ ورنہ یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے جلسہ کی یہ حکایتِ دراز آج ہمارے لئے کیا افادیت رکھتی ہے۔

الہلال کے صفحات میں ایسے علمی ادبی، دینی اور سیاسی مضامین کی کمی نہیں ہے جو آج بھی کم و بیش افادیت رکھتے ہیں۔ درحقیقت وہی اسکے مستحق ہوسکتے ہیں کہ ان کو مولانا کی یاد قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ جیسے کہ اس مجموعہ میں بھی اور دوسرے مضامین اور تقریریں اس وصف کی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قیمتی ہمارے نزدیک اس مجموعہ کے پہلے مضمون کی ہے۔ جس کا عنوان ہے "الہلال کے مقاصد اور پولیٹکل تعلیم" جن لوگوں نے الہلال نہیں پڑھا وہ صرف اس مضمون کو پڑھ کر الہلال کی روح کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور جان سکتے ہیں کہ مولانا کا فکری نہج "الہلالی" دور میں کیا تھا ــــ آئیے چند ٹکڑے یہاں بھی پڑھ لیجئے۔

یہ ذہن میں رہے کہ یہ مضمون ایک خط کے جواب میں ہے ــــ

"آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجئے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں مذہب سے کیونکر الگ کر دیں؟ ہمارے عقیدے میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ

سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے۔ اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اصلی عظمت میں نہیں دیکھا مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (۲۲ : ۷۴) ورنہ پولیٹکل پالیسی کے لئے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتداء کرنے کی ضرورت پیش آتی "

ص ۷۹ — ۸۰

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں پولیٹکل خیالات کے تین راستے موجود ہیں۔ الہلال کس راہ پر قوم کو چلانا چاہتا ہے؟ پھر آپ نے ان کو گنوایا بھی ہے، لیکن افسوس ہے کہ آپ ایک چوتھی راہ کو بالکل بھول گئے۔ یہ تین راستے تو آج آپکے سامنے نمودار ہوتے ہیں، مگر وہ چوتھی راہ تو وہ قدیمی راہ ہے جس پر چل کر ہزاروں ہستیاں منزل مقصود تک پہنچ چکی ہیں۔ آسمان و زمین کے فاطر نے جس وقت آدم کو آنکھیں دیکھنے کے لئے عطا فرمائیں اسی وقت اس کے سامنے یہ راہ بھی کھول دی تھی۔ آدم نے اس پر قدم رکھا۔ اور نوح نے پتھروں کی بارش میں اس کا وعظ کہا۔ ابراہیم نے اس کی نشانی کے لئے قربان گاہ بنائی۔ اور اسمٰعیل نے اس کے لئے اینٹیں چنیں۔ یوسف نے مصر کے قید خانے میں جب ایک ساتھی نے پوچھا تو اسی راہ کی اس نے رہنمائی کی اور موسیٰ جب وادی سین (ایمن؟) میں روشنی کے لئے بے قرار ہوا تو اسی راہ کی تجلّی ایک سبز درخت کے اندر نظر آئی۔ گلیل (گلیلی؟) کا اسرائیلی واعظ جب یروشلم کے قریب ایک پہاڑ پر چڑھا تو اسکی نظر اسی راہ پر تھی۔ اور پھر جب خداوند تعبیر سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو وہی راہ تھی جس کی طرف اس نے دنیا کو دعوت دی ....

یہی وہ راہ ہے جس کی نسبت یوسف صدیق نے قید خانۂ مصر میں یہ کہہ کر اپنا وعظ ختم کیا تھا۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲ — ۴۰)	یہی سیدھا راستہ ہو مگر بہت ہیں جو نہیں جانتے۔

اور جن کی نسبت داعی اسلام کو حکم ہوا تھا کہ کہدے :۔

هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔ (۱۲ - ۱۰۸)

میرا راستہ یہ ہے، تم سب کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں سب عقل و بصیرت کے ساتھ اسی راستہ پر ہیں۔

الحمدللہ کہ ہم " وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ " کے زمرے میں داخل ہیں۔ اور اسی لئے جناب کی قرار دی ہوئی ان تینوں انسانی راہوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ بلکہ اس چوتھی راہ الٰہی کی طرف دعوت دیتے ہیں ؟

ص ۸۴ - ۸۵

" آپ پوچھتے ہیں کہ " آجکل ہندوؤں کے دو پولیٹیکل گروہ موجود ہیں آپ ان میں سے کس کے ساتھ ہیں ؟" گزارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اسکے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہوجائیں تو ساری دنیا اُن کے آگے کھڑی ہوجائے گی ؟ (ص ۸۵)

اس کے آگے اسلام کے اساسی اصول بیان کرتے ہوئے گورنمنٹ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

" گورنمنٹ کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوجائیں تو جس قدر اپنے نفس کے لئے مفید ہوں گے اتنا ہی گورنمنٹ کے لئے نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لئے۔ اس کو بھولنا نہ چاہیئے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوں تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا۔ اور جو ہاتھ قرآن سے رکا ہوا ہو وہ بم کا گولہ یا ریوالور نہیں پکڑ سکتا ؟ الخ (ص ۸۶)

اس کے بعد پھر مقصود اصلی کی طرف آجاتے ہیں اور فرماتے ہیں :۔

"یہ الہلال کی پالیسی ہے اور یہی دعوت ہے جس کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں یہ کسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع و تقلید ہے بلکہ اُس رب العالمین نے جس نے کتاب و حکمت اور عدل و میزان کے ساتھ اپنے رسول کو دنیا میں بھیجا، یہ راہ ہمارے لئے کھول دی ہے۔ وہ اگر توفیق بخشے تو اسی کی راہ میں ہو کر زندگی کو اسی دعوت حق میں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ نہ کسی سے جنگ ہے نہ کسی سے مناقشہ، نہ صلہ کی توقع نہ داد کی امید" (ص ۹)

یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایک طرف مولانا آزاد کے یہ افکار پنڈت جواہر لال نہرو سے انتساب کے ساتھ شائع ہوں اور دوسری طرف وہ ایسے ہی خیالات رکھنے پر ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت کو گردن زدنی قرار دیں۔ پتہ نہیں انھیں اس انتساب کی خبر ہے یا نہیں۔ کتاب کے تعارف میں یہ بات ذکر ہونے سے رہ گئی کہ دس عکسی بلاک بھی اس میں شامل ہیں جن میں مولانا آزاد، پنڈت نہرو اور ناشر و مرتب وغیرہ کے فوٹو بھی ہیں۔

مطالعۂ اسلامیات | از جناب حسن واصف عثمانی۔ ناشر: کتب خانہ اسلامیہ الہ آباد ۳، کتابت طباعت اور کاغذ معیاری صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت ۵۰/۲

بہمہ جہت حسن ظاہری سے مالامال یہ کتاب مولف کے مطالعۂ اسلامیات کا نچوڑ ہے۔ مؤلف کا مقصد اس تالیف سے اسلام کے چند اہم اجزا کی "ہمہ جہتی تاریخ اُن کے ارتقا اور انکی وحدت کا ایسا جائزہ لینا ہے جس سے اسلامی تہذیب کے ذہنی اور عملی کارنامے کھل کر سامنے آجائیں"۔۔۔۔ کتاب کا سب سے پہلا عنوان ہے "سلطنت و تہذیب کا عروج" جس میں ۳۰ - ۳۱ صفحوں کے اندر "اسلام کی تیرہ صدیوں کی تاریخ کا خلاصہ اور صحرائے عرب سے چل کر مراکش و ملایا تک پیام حق لے جانے کی داستان" بیان کر دی گئی ہے ۔۔۔۔ یہ اجمال ہے جس کی تفصیل آگے ۱۲ عنوانات اور ڈیڑھ سو صفحات میں کی گئی ہے۔ یہ عنوانات ہیں:-

"الکتاب اللہ، الرسول اللہ، احکام قرآن، حدیث و سنت، قانون کا ارتقاء، المعتزلہ، تین فرقے، (اہلسنت، شیعہ، خوارج) زہد و اتقاء کا نظریہ صوفی تحریک

نشاۃ ثانیہ کی لہر، ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری، آثار حیات"
اسلامیات کے گہرے مطالعہ اور صحیح نتائج اخذ کرنے کے لئے (کم ازکم دینیات کی حد تک) عربی زبان اور دینی علوم سے براہ راست واقفیت ایک ضروری شرط ہے۔ جب کہ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بات ہمارے مؤلف کو حاصل نہیں ہے تاہم یہ بات بڑی تحسین و اعتراف کی مستحق ہے کہ انھوں نے ذوق و محنت اور ذہنی کاوش سے پورا پورا کام لے کر ایسے پڑھے لکھے نوجوان طبقہ کی اسلامیات سے فی الجملہ واقفیت کا سامان اس کتاب میں کر دیا ہے جس نے اسلامیات پر کچھ نہ پڑھا ہو، بلکہ کتاب کا نصف آخر جو تاریخی عنوانات پر مشتمل ہے اس کی افادیت کا حلقہ کچھ اور بھی وسیع ہو سکتا ہے ——— مؤلف اگر اپنی محنت کے ساتھ کسی عربی داں کی نظر بھی شامل کر لیتے تو کم از کم "الکتاب اللہ"، "الرسول اللہ" جیسی غلطیاں کتاب میں نظر نہ آتیں۔ ان لفظی اغلاط کے علاوہ معناً بھی کتاب کے متعدد مقامات تصحیح و ترمیم کے محتاج ہیں۔

مسئلۂ قربانی

از، پیرزادہ محمد بہاء الحق صاحب قاسمی۔
ماڈل ٹاؤن لاہور، ملنے کا پتہ یہی ہے۔ قیمت ۴؍

یہ رسالہ دو مقالوں پر مشتمل ہے، ایک میں لاہور کی شاہی مسجد کے خطیب مولوی غلام مرشد کے کردار کی عکاسی کی گئی ہے جنھوں نے حال ہی میں قربانی کو محدود کر دینے کی تجویز گورنمنٹ کے سامنے رکھی تھی۔ دوسرے مقالہ میں قرآن و سنت کی روشنی میں قربانی کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ دونوں مقالے مفید اور اچھے ہیں۔ پاکستان کے مسلمان ان سے خاص طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جمال کربلا

از، جمال قریشی احمد آبادی، صفحات ۱۱۲ — قیمت ۱/۸
ناشر، حسینی انجمن، سوداگر کی پول، جمال پور چکلہ، احمد آباد

جمال قریشی صاحب احمد آباد کے ایک نوجوان شاعر ہیں، پیش نظر کتاب ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، جو اصلاً شہید کربلاؓ کی خدمت میں سلاموں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نظمیں

نعتیں اور قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ مجموعی طور سے کلام سے اسلامیت اور دینی جذبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ واقعہ کربلا کے بیان اور شہداء کربلا کی یاد میں، شاعر اپنی روشن خیالی کے باوجود مشہور عوام روایتوں اور عوامی تصوّرات کے چکّر سے نہیں نکل سکے ہیں۔ — شروع میں اعجاز صدیقی اور حبیب الرحمٰن غزنوی صاحب کے قلم سے تقریظیں ہیں جن میں شاعر کی کامیابی کے پہلو اُبھارے گئے ہیں۔

مختصر فہرست کتب خانۂ الفرقان لکھنؤ

پہلے یہ چند باتیں ملاحظہ فرمالیجئے :-

(۱) اپنا پتہ ہمیشہ صاف اُردو میں ضرور لکھئے، اور اگر ہوسکے تو انگریزی میں بھی لکھ دیجئے۔
(۲) اگر آپ صرف ایک دو روپے کی کتابیں منگوائیں گے تو محصول ڈاک کا بار بہت زیادہ پڑ جائے گا، اور اگر زیادہ منگوائیں گے یا اگر چند ساتھی مل کر اور زیادہ منگوائیں گے تو محصول کا بوجھ اسی حساب سے بہت کم ہو جائے گا، اور آپ نفع میں رہیں گے۔

پاکستانی احباب کی خدمت میں :-

(۳) آپ حضرات کو جو کتابیں منگوانی ہوں، اُنکی قیمت اس فہرست میں دیکھ لیجئے، پھر اس قیمت پر فی روپیہ دو آنے کے حساب سے محصول بک پوسٹ اور ۸ر رجسٹری فیس و صرفہ پیکنگ کا اضافہ کرکے کل رقم ذریعہ منی آرڈر "ناظم ادارۂ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور" کے نام روانہ کر دیجئے، اور ڈاک خانہ کی ابتدائی رسید تفصیلی فرمائش کے ساتھ ہم کو بھیج دیجئے۔ یہاں سے کتابیں رجسٹرڈ آپ کو فوراً روانہ کرادی جائیں گی۔
(۴) یاد رکھئے کہ ایک بنڈل میں مختلف کتابوں کے چند نسخے تو ہندوستان سے پاکستان جا سکتے ہیں، لیکن ایک کتاب کے زیادہ نسخے نہیں جا سکتے۔

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

معارف الحدیث (اوّل) قیمت مجلد -/-/۵ غیر مجلد -/-/۴	معارف الحدیث (دوم) مجلد -/۸/۵ غیر مجلد -/۸/۴	قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ مجلد -/-/۱۲	دین و شریعت مجلد -/-/۲	تذکرہ مجدد الف ثانیؒ (الفرقان کے مجدد الف ثانی نمبر کا کتابی ایڈیشن) مجلد -/-/۴
اسلام کیا ہے؟ (جدید ایڈیشن) مجلد -/۸/۲	اسلام کیا ہے؟ (ہندی) مجلد -/-/۳	کلمہ طیبہ کی حقیقت -/۶/-	نماز کی حقیقت -/۱۲/-	برکات رمضان -/۱۲/-
آپ حج کیسے کریں؟ مجلد -/-/۲	آسان حج :- (حج کیسے کریں کا خلاصہ) (جیبی سائز) -/۸/-	حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور انکی دینی دعوت ۲/۸/-	ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ ۱/۸/-	حضرت شاہ شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات ۱/۸/-
دیوبند اور بریلی کے اختلافی فیصلہ کن مناظرہ ۱/-/-	امام ولی اللہ دہلویؒ (از مولانا سندھیؒ) ۱/-/-	اسلام اور نظام سرمایہ داری -/۸/-	بوارق الغیب :- (حصہ دوم) ۱/-/-	قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ -/۶/-
	دجالی فتنہ اور سورۂ کہف ۱/۴/-	انیس نسواں -/۱۰/-		

قرآن مجید سے متعلق کتابیں

تفسیر ابن کثیر (اُردو) :- حافظ عماد الدین بن کثیرؒ کی تفسیر، جو عربی تفسیروں میں بھی مستند ترین تفسیر سمجھی جاتی ہے، اور جس میں یہ التزام ہے کہ آیات کی تفسیر وہ پہلے دوسری آیتوں سے کرتے ہیں، اسکے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے، پھر صحابۂ کرامؓ، تابعین، اور بعد کے ائمۂ تفسیر کے ارشادات سے۔ یہ اس کا مکمل اُردو ترجمہ ہے۔ پانچ ضخیم جلدیں ہیں ———— (قیمت مجلد مکمل سٹ) ———— ۵۵/-/-

تفسیر بیان القرآن :-
(از حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ)
مکمل بارہ جلد مطبوعہ ہندوستان ۔ ۶۰/-/-

قصص القرآن :- (از مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی)
جلد اوّل :- حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ و ہارون کے حالات تک ۔ ۶/-/-
〃 دوم :- حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰ تک کے واقعات ۔ ۴/-/-
〃 سوم :- انبیاء علیہم السلام کے علاوہ باقی قصص قرآن کا بیان ۵/۸/-
〃 چہارم :- حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات ———— ۶/-/-

رہنمائے قرآن :-
اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت کو سمجھنے کے لئے اپنے انداز کی بالکل نئی کتاب۔ اصل کتاب انگریزی میں تھی، اُردو ترجمہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب (پی، ایچ، ڈی) نے کیا ہے ———— ۱/-/-

لغات القرآن (کامل) :-
اُردو زبان میں قرآن شریف کے تمام الفاظ و لغات کی نہایت مفصل اور مبسوط تشریح ———— چھ جلدوں میں۔
قیمت مکمل سٹ مجلد ۳۶/۸/- غیر مجلد ۳۰/۸/-

مصباح اللغات :- اُردو میں عربی زبان کا سب سے زیادہ جامع اور مبسوط لغت ———— قیمت مجلد ۱۶/-/-

اُردو عربی ڈکشنری :- (اُردو سے عربی)
قیمت مجلد ۶/-/-

قرآن اور تعمیر سیرت :- (از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب)۔
قیمت غیر مجلد ۵/-/- مجلد ۶/-/-

قرآن اور تصوّف :- (از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب)۔
قیمت غیر مجلد ۲/-/- مجلد ۳/-/-

حدیث شریف سے متعلق کتابیں

صحیح بخاری شریف مکمل (اُردو) :- (تین ضخیم جلدوں میں)
قیمت مکمل مجلد سٹ ۲۴/-/-

جامع ترمذی شریف (اُردو) :-
امام ترمذی نے اپنی اس کتاب میں اس کا التزام کیا ہے کہ ہر باب میں حدیثیں درج کرنے کے ساتھ وہ ائمہ امت کا مذہب بھی لکھتے ہیں۔ دو ضخیم جلدوں میں ———— قیمت مجلد ۱۸/-/-

مشکوٰۃ شریف (اُردو) :-
مشکوٰۃ شریف کو بجا طور پر حدیث کے کتب خانہ کا جامع انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ دو ضخیم جلدیں ۔ قیمت مجلد ۱۶/-/-

ترجمان السنہ :- (از مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی) مقیم مدینۂ طیبہ
قیمت جلد اوّل ۱۰/-/- جلد دوم ۹/-/- جلد سوم ۱۰/-/-

حدیث کا ایک اہم تاریخی مجموعہ

صحیفہ ہمام بن منبہ :- ہمام بن منبہ، مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہیں، انھوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنی ہوئی حدیثوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیا تھا۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا صرف تذکرہ ملتا تھا۔ ہمارے زمانہ کے مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے اس کا نسخہ کسی طرح حاصل کیا، اور اپنے فاضلانہ مقدمہ اور ترجمہ اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ شائع کیا ہے، قدردانوں کیلئے بڑا قابل قدر تحفہ ہے ———— قیمت ۳/-/-

زاد سفر :-
امام نوویؒ کی بہترین کتاب "ریاض الصالحین" کا ترجمہ محترمہ اَمۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے قلم سے ۔ قیمت مکمل مجلد ۷/-/-

حجۃ اللہ البالغہ (مع ترجمہ اُردو) :-
اسلامی اسرار و حقائق کے بیان اور احادیث نبویہ کی عارفانہ اور حکیمانہ تشریح میں یہ کتاب بلاشبہ پورے اسلامی کتب خانہ میں بے نظیر ہے۔
اصح المطابع کراچی نے اس کو تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق حقانی کے بہترین ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اصل عربی متن بھی ساتھ میں چھاپا گیا ہے۔ علماء اور تعلیمیافتہ طبقے کیلئے بہترین تحفہ ہے ———— دو ضخیم جلدیں۔
قیمت مجلد ۲۰/-/-

علم الحدیث :- اپنے موضوع پر بہترین کتاب نیز حدیث کے بارے میں پیدا کئے جانیوالے شبہات کا جواب ———— قیمت ۱/۴/-

مختلف موضوعات پر منتخب کتابیں

سلسلہ تاریخ ملت :-
(شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی)

حصہ اوّل (نبی عربی)	عہ/
〃 دوم (خلافت راشدہ)	۸؍
〃 سوم (〃 بنو امیہ)	۸؍
〃 چہارم (〃 ہسپانیہ)	ع/
〃 پنجم (〃 عباسیہ اوّل)	۱۲؍
〃 ششم (〃 〃 دوم)	للعہ ۱۲/
〃 ہفتم (تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ)	۱۲؍
〃 ہشتم (خلافت عثمانیہ)	۸؍
〃 نہم (تاریخ صقلیہ)	عہ ۱۲/
〃 دہم (سلاطین ہند اوّل)	۸؍
〃 یازدہم (〃 〃 دوم)	۸؍

قیمت مکمل سٹ غیر مجلد ۳۱/۸، مجلد ۳۴/-

تاریخ اسلام پر ایک نظر :- اسلام کے مختلف دوروں اور خلافت و حکومت کے مختلف سلسلوں کی جامع و مختصر تاریخ ۶/-
مجلد ۶/۸

رحمت عالمؐ :- از مولانا سید سلیمان ندویؒ - عہ ۱۲/

خطبات مدراس :- 〃 〃 〃 ۸؍

سیرت پاک :- از بشیر محمد شارق دہلوی عہ/

صدیق اکبرؓ :-
(از مولانا سعید احمد اکبر آبادی) -/۷

تاریخ دیوبند :- یہ دراصل قصبہ دیوبند و دارالعلوم دیوبند کی تاریخ ہے۔ شروع میں مولانا محمد طیب صاحب کا پیش لفظ ہے -
قیمت مجلد - ع/

سفرنامہ ابن بطوطہ :-
(از مولوی عبد الرحمن خان صاحب)
قیمت مجلد ۳/-

گلبانگ حرم :- ۳/۱۲

نقش گل :- ۶/-

رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی :-
(از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب) - قیمت -/-/۷

عہد نبویؐ کے میدان جنگ :-
(از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب) - قیمت -/۸/۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوبات و معاہدات :- یعنی شاہان عالم، عرب کے حکمرانوں اور قبائلی سرداروں سے آپ کی سیاسی خط و کتابت اور معاہدات، انکے پس منظر اور نتائج -
(از سید محبوب رضوی) - قیمت مجلد -/۴/۲

تاریخ مشائخ چشت :-
(از پروفیسر خلیق احمد نظامی) سلسلہ چشتیہ کی نظامی شاخ کی چند اہم شخصیتوں کا مفصل اور محققانہ تذکرہ، تصوّف اور خاص کر چشتی سلسلہ کے متعلق نہایت اہم اصولی بحثیں -
قیمت -/۱۲/

حیات شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ :-
(از پروفیسر خلیق احمد نظامی) شیخ موصوف ہندوستان کی نہایت اہم شخصیتوں میں سے ایک ہیں، انکی سوانح کی کمی کو اس تحقیقی کتاب نے پورا کر دیا ہے - قیمت مجلد -/۷/

تذکرہ علامہ ابن طاہر محدث پٹنی :-
(از پروفیسر سید ابو ظفر ندوی)
قیمت مجلد عہ/

حیات انور :-
خاتم المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی سوانح حیات -
قیمت مجلد -/۴

سوانح قاسمی :- ہر سہ جلد کامل - ۱۵/۸/

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات :- (دو جلدوں میں)
قیمت مکمل -/۱۲/۵

اسلام کا نظام حکومت :-
اس میں اسلام کی ریاست عامہ کا مکمل دستور اساسی، اور مستند ضابطہ حکومت پیش کیا گیا ہے طرز تحریر زمانہ حال کی قانونی زبان سے پوری مطابقت رکھتا ہے - قیمت غیر مجلد -/۶
قیمت مجلد -/۷

مسلمانوں کا نظم مملکت :- یہ دراصل ایک مصری فاضل کی کتاب "النظم الاسلامیہ" کا اردو ترجمہ ہے اسکے مطالعہ سے مسلمانوں کے نظام حکومت و مملکت کی ایک صاف محققانہ تاریخ سامنے آجاتی ہے - قیمت غیر مجلد -/۴/ مجلد -/۵

اسلام کا اقتصادی نظام :- مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی کی مشہور تالیف ہے -
قیمت غیر مجلد -/۵/ مجلد -/۶

اسلام کا زرعی نظام :- اپنے موضوع پر جامع اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب -
قیمت غیر مجلد /۴/ مجلد -/۵

اسلام کا نظام عصمت و عفت :- اسلام نے پاکدامنی اور عصمت کی حفاظت کے جو اصول مقرر کئے ہیں انکی تفصیل اور ان کی حکمت اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے -
قیمت -/۴/

اسلام کا نظام مساجد :- اسلام کے نظام میں مساجد کا کیا مقام ہے اور اس سے کتنے اہم مقاصد وابستہ ہیں، اور اسکے بارہ میں اسلام کے احکام کیا ہیں؟ - قیمت ۳/۸/

غلامان اسلام :-
(از مولانا سعید احمد صاحب ایم اے)
قیمت مجلد -/۸/۶

فلسفہ کیا ہے ؟ :-
(از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب)
قیمت مجلد -/۲

تصنیفات حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہٗ

خصائل نبوی شرح شمائل ترمذی قیمت ۵/-

حکایات صحابہؓ	۲/-
فضائل حج	۳/-
برکات ذکر	۲/۱۰/-
فضائل صدقات اوّل	۳/۸/-
" " دوم	۳/۱۲/-
فضائل نماز	/۱۲/-
فضائل رمضان	/۱۲/-
فضائل قرآن	/۱۲/-
فضائل تبلیغ	/۶/-

تصنیفات مولانا احتشام الحسن صاحب

حقیقت ذکر	۲/۱۲/-
تجلّیات کعبہ (مجلّد)	۳/-/-
تجلّیات مدینہ	۲/۸/-
ارکان اسلام	۱/۸/-
دین خالص	-/۸/-
شاہراہ ترقی	-/۱۲/-
حیات مختصر	-/۱۰/-
اسلامی زندگی	-/۴/-
پستی کا واحد علاج	-/۴/-
انقلاب معاشرت	-/۴/-

تصانیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی :-

دعوت وعزیمت اوّل	۶/-
" " " دوم	۶/۸/-
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ... ... (زیر طبع)	
اصلاحیات (اصلاحی مضامین کا مجموعہ)	۱/۱۰/-
دعائیں	/۶/-
پیام انسانیت	/۱۰/-
مقام انسانیت	/۱۰/-
تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی	۲/۸/-
نیا طوفان اور اس کا مقابلہ	/۸/-
سیرت سید احمد شہیدؒ	۵/-
شرق اوسط میں کیا دیکھا؟	۱/۴/-
دو ہفتے ترکی میں	۱/۶/-

تصانیف مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی (بی اے)

تفسیر ماجدی اوّل	۱۲/-
" " دوم	۱۱/-
" " سوم	۱۱/-
" " چہارم	۱۱/-
حیوانات قرآنی	۲/-
جغرافیہ قرآنی	۱/۴/-
مناجات مقبول (ترجمہ اور تشریح از مولانا موصوف)	۲/-
سفر نامہ حجاز	۵/-
حکیم الامت	۷/۸/-
اکبر نامہ	۳/-

تصنیفات حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ

تدوین حدیث	۶/۸/-
مقالات احسانی	۶/۸/-
امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی	۱۲/-/-
تدوین قرآن	۱/۸/-
تاریخ علم فقہ	۱/۸/-
سوانح قاسمی (تین جلدیں) قیمت مکمل سٹ	۱۵/۸/-
مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ	۱/۸/-

تصانیف مولانا عبد الباری صاحب (ندوی)

جامع المجددین :- اس میں خصوصاً اعمال ظاہر کی صلاح و اصلاح پر بحث ہے، جو شریعت کا ایک خاص موضوع ہے۔ قیمت مجلد ۵/-

تجدید تصوف و سلوک :- اس کا موضوع انسانوں کی قلبی باطنی یا اخلاقی اصلاح ہے، اس میں تصوف کے متعلق موافقین و مخالفین کی تمام نئی پرانی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتلایا گیا ہے کہ تصوف درحقیقت نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا۔ قیمت مجلد ۵/-

تجدید تعلیم و تبلیغ :- اس میں دین کی تعلیم و تبلیغ کا مکمل نظام بتلایا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۳/-

تجدید معاشیات :- معاشیات کے موضوع پر خالص کتابی نقطۂ نظر سے اس دور کی بے واحد تصنیف ہے جس میں معاشیات نو پیدا نظریوں اور تعروں سے مرعوب ہوئے بغیر بلکہ ان کو محض فریب ثابت کرتے ہوئے رزق و معاش سے متعلق خالص اسلامی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ۱/-

ترجمۂ قرآن کا مکمل نصاب :-

(از مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی)

رحمانی قاعدہ عربی باتصویر	۵/
" " اردو	۵/
مفتاح القرآن (اوّل)	۵/
" " (دوم)	۶/
" " (سوم)	۱۰/
" " (چہارم)	۱۴/
" " (پنجم)	۱۸/
معلم القرآن۔	۱۴/

ہمارے بچوں کا مکتب نصاب

اچھا قاعدہ	۳/	اچھی باتیں	
اللہ کے رسولؐ	۷/	حضرت ابو بکرؓ	
حضرت عمرؓ	۷/	حضرت عثمانؓ	
حضرت علیؓ	۷/	اچھے قصے	
حضرت خدیجہؓ	۸/	حضرت سودہؓ	

دو قابل مطالعہ کتابیں

"اسلامی کشکول"

مسلمانوں کی فکری و عملی اصلاح کے لئے مشاہیر اہل قلم نے اپنی سیکڑوں کتابوں اور مقالوں میں جو کچھ لکھا، یہ انکے سیکڑوں اقتباسات کا مجموعہ ہے ـــــ قیمت ۳/-/-

"ارشاد السالکین" :- ہر مبتدی اور طالب خدا کے پاس رہنے کے لائق نہایت مؤثر کتاب ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کو بجا طور پر تصوف کے کتب خانہ کا عطر کہا جا سکتا ہے۔ قیمت مجلد :- ۱/۸/-

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW.

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

ہماری دعوت

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اس کلمہ پر اسلام کی بنیاد ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہی انسانیت کی نجات کا کلمہ ہے

لیکن یہ صرف ایک مقولہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک شہادت، ایک اصول اور ایک اہم فیصلہ ہے، ایک عہد ہے اس بات کا عہد کہ ہم صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی بھیجی ہوئی اور حضرت محمد صلعم کی لائی ہوئی ہدایت اور شریعت کی پیروی کریں گے اور اسی حال پر جئیں گے اور مریں گے

جو لوگ اس کلمہ پر ایمان لا چکے ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی اس عہد کے مطابق گزاریں اور اسی ایمانی زندگی کو دنیا میں رواج دینے کی کوشش کریں، وہ اسی لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اس کا عہد کرتے ہیں، اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اسی پر جینا اور مرنا چاہتے ہیں

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ

توفنی مسلما والحقنی بالصالحین

ادارہ الفرقان

مدیر مسئول
محمد منظور نعمانی

مرتب
عتیق الرحمٰن سنبھلی

ہندوستان و پاکستان سے
سالانہ چندہ (ہندوستان) ...
سالانہ چندہ (پاکستان) ...
ششماہی ... ...

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

(فی کاپی آٹھ آنے)

غیر ممالک سے
سالانہ چندہ ... ... شلنگ
اعزازی خریداروں سے
سالانہ ۱۵

جلد ۲۷ | بابتہ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۹ء | شمارہ ۵

اگر اس دائرہ میں ◯ سرخ نشان ہو تو

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے سالانہ چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں ورنہ اگلا رسالہ بصیغہ وی پی ارسال کیا جائے گا وی پی میں آپ کے کچھ آنے زائد صرف ہوں گے اور رسالہ دیر سے بھی پہونچے گا۔ چندہ یا کوئی دوسری اطلاع دفتر میں زیادہ سے زیادہ ۳۰ دسمبر تک پہونچ جانی چاہیے۔

پاکستانی خریدار اپنا چندہ سکریٹری ادارہ اصلاح و تبلیغ آسٹریلین بلڈنگ لاہور کو بھیجیں اور منی آرڈر کی پہلی رسید ہمارے پاس فوراً بھیجدیں۔

تاریخ اشاعت :۔ رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۵ تک کسی صاحب کو نہ ملے تو مطلع فرمائیں ان کی اطلاع ۲۵ تاریخ کے اندر آجانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنے کی ذمہ داری دفتر پر نہیں۔ شکایت پر دوسرا رسالہ آئندہ ماہ کے رسالے کے ساتھ بھیجا جائے گا۔ جلدی ہو تو براہ کرم ۲ آنے پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ۔ **دفتر الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ**

مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے تنویر پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

نگاہِ اوّلیں

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

ہندوستان پر انگریزی اقتدار نے جو نقصانات ملّتِ اسلامیۂ ہند کو پہونچائے اُن میں سے ایک عظیم نقصان یہ تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم کا تصوّر یکسر بدل گیا۔ ان کی تعلیم ہمیشہ دین اور دنیا کی جامع رہی تھی، مگر انگریزی اقتدار کے بعد ان میں تعلیم کا تصوّر رفتہ رفتہ صرف حرفتی رہ گیا ہے۔ یعنی یہ ایک ذریعہ ہو گیا صرف نوکریاں حاصل کرنے کا یا اس قابل بن جانے کا کہ آدمی کوئی روزگار اچھی طرح کر سکے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے وہ تعلیم کافی سمجھ لی گئی جو حکومت کے قائم کردہ یا اُس کے منظور کردہ اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی تھی۔

یہ ایک نقصانِ عظیم تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی تعلیم کی اہمیت اور اس بات کی فکر لوگوں کے ذہن سے نکل گئی کہ اُن کے بچوں کو ضروری درجہ کی دینی تعلیم ضرور ملنی چاہیے اور اس کا ہر قیمت پر انتظام رہنا چاہیے۔

تعلیم کے اسی غلط تصور اور بچوں کی ضروری درجہ کی دینی تعلیم سے بے فکری کے دھارے پر بہتے ہوئے ہم مسلمانانِ ہند ۱۹۴۷ء کے موڑ پر پہونچے اور اسی ذہنی حالت کے ساتھ ہم اس نئے دور میں داخل ہو گئے —— اس نئے دور سے پہلے ابتدائی سرکاری اسکولوں کا تعلیمی نصاب اگرچہ دینی تعلیم سے خالی ہوتا تھا، تاہم اس میں ایسے اجزاء بھی نہیں ہوتے تھے جو خلافِ اسلام خیالات و تصورات سے بچوں کے ذہن کو آلودہ کریں۔ علاوہ ازیں بچوں کو اردو کی تعلیم دی جاتی تھی جس کے سبب سے وہ اپنے گھر کے ماحول میں آسانی کے ساتھ اسلامی دینیات سے واقف

ہو سکتے تھے۔ لیکن اس سیکولر دور میں یہ انقلاب ہوا کہ ایک طرف تو اسکولوں سے عملاً اُردو نکال دی گئی جس کے ذریعہ بچہ باقاعدہ دینی تعلیم کے بغیر بھی اپنی دینیات سے کچھ نہ کچھ آشنا ہو ہی جاتا تھا، دوسری طرف نصابی کتابوں میں ہندی کے پردے میں ہندوانہ عقائد و تصورات کا وہ زہر گھولا گیا ہے جو مسلمان بچوں کی اسلامیت کے لیے یکسر قاتل ہے۔ اور ان دونوں باتوں سے مل کر اس طرح کے نتائج نکلنے لگے کہ

۱۔ "ایک اسلامیہ کالج میں دیہات سے آکر داخل ہونے والے چند لڑکوں کو جب وہاں کے حساس پرنسپل نے دینیات سے آشنا کرنے کی کوشش شروع کی تو ایک موقع پر ان میں سے ایک لڑکے نے "مکہ" کے بارے میں پوچھا کہ یہ کس قسم کا پھل ہے؟ جب اس کو بتلایا گیا کہ مکہ ایک شہر ہے تو وہ حیران رہ گیا اور کہنے لگا کہاں ہے؟"

۲۔ "ایک خاندان کا لڑکا کسی امتحان میں ممتاز ہوا اور دوسرے کسی لڑکے نے اس سے کہا مٹھائی کھلاؤ تو اس لڑکے نے اپنی ماں سے پوچھ کر یہ جواب دیا کہ میلاد شریف ہوگی جب مٹھائی تقسیم ہوگی۔ مٹھائی مانگنے والے مسلمان لڑکے نے کہا کہ میلاد شریف کیا؟ اور جب اس کو سمجھایا گیا کہ جلسہ ہوگا اور اس میں ایسی تقریر ہوگی تو اس نے کہا "اچھا کتھا؟" تو کتھا دکھا بعد کو کرنا پہلے مٹھائی کھلاؤ۔"

۳۔ "ایک متقی عالم کا لڑکا بعض مذکورۃ الصدر پرنسپل صاحب کے گھر رہ کر کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ پرنسپل صاحب اس زمانہ میں آٹھ دس دوستوں کے ساتھ روزانہ قرآن پاک کی تفسیر پڑھتے اور سنتے تھے۔ اور اس وقت وہ لڑکا دوسرے سائبان میں جا کر دور بیٹھ جاتا تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ تم بھی کیوں نہیں یہاں بیٹھتے، تم بھی سنو! تو اس نے جواب دیا، آپ لوگ اردو پڑھتے ہیں جو میں نہیں سمجھ سکتا۔"

یہ واقعات حال ہی میں ایک ذمہ دار آدمی نے شائع کیے ہیں ــــــ کون مسلمان ہو جو

اس قسم کی باتوں کو جان کر چین بے چین نہ ہوتا ہو، اور صد درجہ لعنت اس تعلیم پر نہ بھیجتا ہو۔ تعلیمی تصور اور نقطۂ نظر کے اسی بگاڑ کے باعث جو انگریزی دور کے برکات کے طور پر اس سرے سے اُس سرے تک مسلمانوں میں پھیل چکا ہے، یہ نوبت آج تک نہیں آرہی کہ مسلمان اپنے بچوں کی دینی تعلیم کی کوئی باقاعدہ فکر کریں اور اس کے مؤثر انتظام کو اپنے بچوں کے دینی بچاؤ اور ان کی ملی موت و زیست کا مسئلہ سمجھتے ہوئے اس وقت تک چین نہ لیں جب تک اطمینان نہ ہو جائے کہ مسئلہ حل ہو گیا اور پورا پورا انتظام عمل میں آ گیا۔

چھوٹی اور بڑی متعدد کوششیں اس مقصد کے لیے اب تک ہو چکی ہیں۔ اور افسوس کہ اس کا کوئی خاص فائدہ مرتب نہ ہو سکا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس کام کو یونہی پڑا رہنے دیا جائے ——— شکر ہے کہ کچھ صاحبِ فکر اور باعمل حضرات اب تک کی کوششوں کی ناکامیوں کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے اور اپنے عملی تجربات کی بنا پر ایک اعتماد اور عزم لیے ہوئے، ایک بار پھر اس مسئلہ پر ایک اجتماع کے داعی ہوئے ہیں۔

یہ اجتماع بستی (صوبہ یو، پی) میں ۳۰، ۳۱ ؍دسمبر ۵۹ء و یکم جنوری ۶۰ء کو صوبائی پیمانہ پر منعقد ہو رہا ہے۔ اور خوشی ہے کہ ان داعیین نے اتنی فضا اس کے لیے تیار کر لی ہے کہ اخبارات میں مراسلوں کے ذریعہ اس سے کافی گہری دلچسپی کا اظہار ہو رہا ہے ——— ہم صوبہ کے تمام مسلمانوں کو پکار کر کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اگر اپنے بچوں کی اس حالت پر راضی نہیں ہیں جو سرکاری اسکولوں کی تعلیم سے بن رہی ہے، تو پھر اس موقع کو ایک آخری موقع سمجھیں اور اس کوشش کو ناکام نہ ہونے دیں۔ مسلمان اگر یہ طے کر لیں کہ وہ اس وقت تک اپنے بچوں کی تعلیم کو تعلیم نہیں سمجھیں گے جب تک وہ اللہ اور رسول سے واقف نہ ہوں تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ کام (دینی تعلیم کا انتظام) جو آج بڑا مشکل نظر آتا ہے، بہت تھوڑی مدت میں حل ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر مسلمان ہی یہ طے نہ کریں تو پھر اجتماع اور کانفرنسیں ہوا کریں، یہ کام نہ ہو سکے گا۔

بستی کے اس اجتماع کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کے داعیوں نے دو ایسی

متعین عملی باتیں اپنے کام کے نقشہ میں رکھی ہیں کہ اگر ان پر عمل ہوجائے تو واقعہ یہ ہے کہ کام بڑی حد تک قابو میں آسکتا ہے۔

یہ دو باتیں یہ ہیں کہ

۱۔ تمام دینی مدارس میں پرائمری درجات کے قیام کی کوشش!

۲۔ اسی طرح تمام اسلامیہ کالجوں میں پرائمری درجات جاری کرانے کی کوشش!

حقیقتاً اس کوشش کی کامیابی سے کام بڑا آسان ہوجائے گا، خدا کرے کہ دینی مدارس اور اسلامیہ کالجوں کے ذمہ داران اس اجتماع سے پوری طرح دلچسپی لیں تاکہ ان کے تعاون سے کام کا یہ نقشہ کم از کم ہمارے ایک صوبے میں تو بروئے کار آسکے۔

معارف الحدیث

(مسلسل)

(۴) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا اَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهٖ اُعَلِّمُكُمْ اِذَا اَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَاَمَرَ بِثَلٰثَةِ اَحْجَارٍ وَنَهٰى عَنِ الرَّوْثِ وَالرِّمَّةِ وَنَهٰى اَنْ يَّسْتَطِيْبَ الرَّجُلُ بِيَمِيْنِهٖ ——

—— رواہ ابن ماجہ والدارمی

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میں تم لوگوں کے لیے مثل ایک باپ کے ہوں اپنی اولاد کے لیے۔ (یعنی جس طرح اولاد کی خیرخواہی اور اُن کو زندگی کے اصول و آداب سکھانا ہر باپ کی ذمہ داری ہے اسی طرح تمھاری تعلیم و تربیت میرا کام ہے۔ اسی بنا پر) میں تمھیں بتاتا ہوں کہ جب تم قضائے حاجت کے لیے جاؤ تو نہ قبلہ کی طرف منھ کرکے بیٹھو نہ اس کی طرف پشت کرکے (بلکہ اس طرح بیٹھو کہ قبلہ کی جانب نہ تمھارا منھ ہو نہ تمھاری پیٹھ ہو) —— (حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ) اور آپ نے استنجے میں تین پتھروں کے استعمال کرنے کا حکم دیا اور منع فرمایا استنجے میں لید اور ہڈی استعمال کرنے سے۔ اور منع فرمایا داہنے ہاتھ سے استنجا کرنے سے۔ —— (سنن ابن ماجہ و دارمی)

(۵) عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قِيْلَ لَهٗ قَدْ عَلَّمَكُمْ نَبِيُّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُلَّ شَيْءٍ حَتّٰى الْخِرَاءَةَ قَالَ فَقَالَ اَجَلْ لَقَدْ نَهَانَا اَنْ

نَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ لِغَائِطٍ اَوْ بَوْلٍ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِالْيَمِيْنِ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلٰثَةِ اَحْجَارٍ اَوْ اَنْ نَسْتَنْجِيَ بِرَجِيْعٍ اَوْ بِعَظْمٍ ——— رواہ مسلم

(ترجمہ) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہو۔ بیان فرماتے ہیں کہ (بعض مشرکوں کی طرف سے تمسخر اور طنز کے طور پر) ان سے کہا گیا کہ تمھارے ان پیغمبر صاحب نے تو (صلی اللہ علیہ وسلم) تم لوگوں کو ساری ہی باتیں سکھا دی ہیں۔ یہاں تک کہ پاخانہ پھرنے کا طریقہ بھی! حضرت سلمان نے ان سے کہا ہاں بیشک (انھوں نے ہم کو سب ہی کچھ سکھایا ہے۔ اور استنجے کے متعلق بھی ضروری ہدایتیں دی ہیں۔ چنانچہ) انھوں نے ہم کو اس سے منع فرمایا ہے کہ پاخانے یا پیشاب کے وقت ہم قبلہ کی طرف رُخ کریں۔ یا یہ کہ ہم داہنے ہاتھ سے استنجا کریں یا یہ کہ ہم استنجے میں تین پتھروں سے کم استعمال کریں۔ یا یہ کہ ہم استنجا کریں (اونٹ، گھوڑے، یا بیل وغیرہ) کسی چوپائے کے فضلے یا ہڈی سے۔ ——— (صحیح مسلم)

(تشریح) جس طرح کھانا پینا انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے اسی طرح پاخانہ پیشاب بھی ہر انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ نبی برحق سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح زندگی کے دوسرے کاموں اور دوسرے شعبوں میں ہدایات دیں اسی طرح پاخانہ و پیشاب اور طہارت و استنجا کے بارہ میں بھی بتایا کہ یہ مناسب ہو اور یہ نامناسب، یہ درست ہو اور یہ نادرست ———

مندرجہ بالا دونوں حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات اس باب میں دی ہیں وہ چار ہیں۔

ایک یہ کہ پاخانہ پیشاب کے لیے اس طرح بیٹھا جائے کہ قبلہ کی طرف نہ منہ ہو نہ پیٹھ ——— یہ قبلہ کے ادب و احترام کا تقاضا ہے۔ ہر مہذب آدمی جس کو لطیف اور روحانی حقیقتوں کا کچھ شعور و احساس ہو، پیشاب پاخانہ کے وقت کسی مقدس اور محترم چیز کی طرف منہ یا پیٹھ کر کے بیٹھنا بے ادبی اور گنوارپن سمجھتا ہے۔

دوسری ہدایت آپ نے یہ دی کہ داہنا ہاتھ جو عام طور سے کھانے پینے، لکھنے، پکڑنے، لینے دینے وغیرہ سارے کاموں میں استعمال ہوتا ہے اور جس کو ہمارے پیدا کرنے والے نے پیدائشی طور پر بائیں ہاتھ کے مقابلہ میں زیادہ صلاحیت اور خاص فوقیت بخشی ہے اُس کو استنجے میں گندگی

کی صفائی کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ یہ بات بھی ایسی ہے کہ ہر مہذب آدمی جس کو انسانی شرف کا کچھ شعور و احساس ہے، اپنے بچوں کو یہ بات سکھانی ضروری سمجھتا ہے۔

تیسری ہدایت آپ نے یہ دی ہے کہ استنجے میں صفائی کے لیے کم سے کم تین پتھر استعمال کرنے چاہئیں۔ کیونکہ عام حال یہی ہے کہ تین سے کم میں پوری صفائی نہیں ہوتی۔ پس اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ اس کو صفائی کے لیے تین سے زیادہ پتھروں یا ڈھیلوں کے استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی ضرورت کے مطابق زیادہ استعمال کرے ۔۔۔۔۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ حدیثوں میں استنجے کے لیے خاص پتھر کا ذکر اس لیے آتا ہے کہ عرب میں پتھر کے ٹکڑے ہی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے، ورنہ پتھر کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ مٹی کے ڈھیلے اور اسی طرح ہر ایسی پاک چیز ہے یہ کام لیا جا سکتا ہے جس سے صفائی کا مقصد حاصل ہو سکتا ہو۔ اور اس کا استعمال اس کام کے لیے نامناسب نہ ہو۔

چوتھی ہدایت آپ نے اس سلسلہ میں یہ دی کہ کسی جانور کی گری پڑی ہڈی سے اور اسی طرح کسی جانور کے خشک فضلے سے یعنی لید وغیرہ سے استنجا نہ کیا جائے ۔۔۔۔۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں عرب کے بعض لوگ ان چیزوں سے بھی استنجا کر لیا کرتے تھے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً اس سے منع فرما دیا۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی چیزوں سے استنجا کرنا ہر سلیم الفطرت اور صاحب تمیز آدمی کے نزدیک بڑے گنوارپن کی بات ہے۔

(۶) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَتَى الْخَلَاءَ اَتَيْتُهُ بِمَاءٍ فِیْ تَوْرٍ اَوْ رَكْوَةٍ فَاسْتَنْجٰى ثُمَّ مَسَحَ يَدَهٗ عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ اَتَيْتُهُ بِاِنَاءٍ اٰخَرَ فَتَوَضَّاَ ۔۔۔ رواہ ابو داؤد

(ترجمہ) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب استنجے کو جاتے تھے تو میں آپ کو پانی لا کے دیتا تھا۔ پانی کے برتن تَور میں (جو کانسی یا پتھر سے بنا ہوا ایک برتن ہوتا تھا) یا رکوہ میں (یعنی چمڑے کے چھوٹے مشکیزے میں) تو آپ اس سے طہارت کرتے تھے۔ پھر اپنے ہاتھ کو زمین کی مٹی پر ملتے تھے، پھر میں دوسرا برتن پانی کا لاتا تھا تو اس سے آپ وضو فرماتے تھے ۔۔۔ (سنن ابی داؤد)

تشریح) مطلب یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پتھر وغیرہ سے استنجا کرنے کے بعد پانی سے بھی طہارت فرماتے تھے۔ پھر اس کے بعد ہاتھ کو زمین پر مل کر دھوتے تھے، اس کے بعد وضو بھی فرماتے تھے ـــــ حدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کے استنجے اور وضو کے لیے پانی لاکر دینے کی سعادت عموماً مجھے حاصل ہوتی تھی ـــــ صحیحین کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خدمت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بھی خاص حصہ تھا۔

(۷) عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ وَجَابِرٍ وَاَنَسٍ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ لَمَّا نَزَلَتْ "فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ" قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَثْنٰى عَلَيْكُمْ فِى الطُّهُوْرِ فَمَا طُهُوْرُكُمْ قَالُوْا نَتَوَضَّاُ لِلصَّلٰوةِ وَنَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَنَسْتَنْجِىْ بِالْمَاءِ قَالَ فَهُوَ ذَاكَ فَعَلَيْكُمُوْهُ ـــــــــ رواہ ابن ماجۃ

(**ترجمہ**) حضرت ابوایوب انصاری اور حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ یہ تینوں حضرات بیان فرماتے ہیں کہ مسجد قبا کے بارہ میں جب (سورۂ توبہ کی) یہ آیت نازل ہوئی "فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ" (اس مسجد میں ہمارے ایسے بندے ہیں جو بہت پاکیزگی پسند کرتے ہیں اور اللہ ایسے پاکیزگی پسند بندوں سے محبت کرتا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس مسجد میں نمازیں پڑھنے والے اور اس کو آباد کرنے والے انصار سے) فرمایا اے گروہ انصار اللہ تعالیٰ نے طہارت و پاکیزگی کے بارہ میں تمہاری تعریف فرمائی ہے تو وہ تمہاری کیا صفائی اور پاکیزگی ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ (طہارت و پاکیزگی کی کوئی خاص بات اس کے سوا تو ہم اپنے میں نہیں پاتے) کہ نماز کے لیے وضو کرتے ہیں، جنابت کا غسل کرتے ہیں اور پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ (یعنی صرف پتھر وغیرہ کے استعمال پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بعد میں پانی سے بھی استنجا کرتے ہیں) آپ نے فرمایا بس یہی بات ہے، پس تم اس کو اپنے اوپر لازم کر لو ـــــــــ (سنن ابن ماجہ)

(تشریح) عرب کے بہت سے لوگ صرف ڈھیلے پتھر سے استنجا کرنے پر اکتفا کرتے تھے، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (موٹی جھوٹی غذا اور ہاضمہ کی درستی کی وجہ سے) ان لوگوں کو اجابت اونٹ کی مینگنیوں کی طرح خشک ہوتی تھی اس لیے استنجے میں ان کو پانی کے استعمال کی خاص ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ صرف پتھر کے استعمال پر اکتفا کر لیتے تھے۔ لیکن انصار کی عادت پانی کے استعمال کی بھی تھی، قرآن مجید میں اُن کی اس پاکیزگی پسندی کی تحسین و تعریف نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اس کو اپنے پر لازم کر لیں ـــــ اور خود آپ کا طرزِ عمل تو یہ تھا ہی ـــــ الغرض قرآن مجید نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور طرز عمل نے اُمت مسلمہ کو ہدایت دی کہ اگر بالفرض کسی کا حال یہ ہو کہ اجابت کی خشکی کی وجہ سے ڈھیلے، پتھر وغیرہ کا استعمال صفائی کے لیے کافی ہو، تب بھی وہ پانی سے استنجا کرے اور ہاتھ کو مٹی وغیرہ سے مانجھے۔ پاکیزگی پسندی کا تقاضا یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہی طریقہ پسند ہے۔

تجلّیات مجدّدِ الفِ ثانی رح

مکتوبات کے آئینے میں

از مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی

مکتوب (۶۱) سید محمود کے نام ——— (ترغیب صحبت شیخ کامل)

التفات نامۂ گرامی نے مشرف کیا ——— چونکہ وہ طلب و شوق اور درد و تشنگی کی اطلاع دینے والا تھا نظر کو بہت بھلا معلوم ہوا ——— طلب، مطلوب کے حصول کی بشارت دیتی ہے اور درد، مقصود تک پہنچنے کی تمہید ہے ——— ایک درویش کا مقولہ ہے ——— اگر نخواستے داد نداد ے خواست ——— یعنی اگر اللہ تعالےٰ عطا کرنا نہ چاہتا تو طلب ہی پیدا نہ کرتا ——— دولتِ طلب کے حصول کو نعمتِ عظمیٰ تصور کر کے جو چیز اس کے مخالف ہو اُس سے بچنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ طلب میں سستی راہ پا جائے اور اس حرارت میں برودت اثر کر جائے ——— طلب کے محفوظ رکھنے کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ایک تو شکر خدا بجا لانا ہے ——— طلب کے حاصل ہونے پر ——— اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ——— لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ (اگر تم شکر کروگے تو میں ضرور بالضرور زیادہ عطا کروں گا تم کو) ——— (طلب کے محفوظ رکھنے کا دوسرا سبب، دوام التجا و تضرع ہے ——— اللہ تعالےٰ کی بارگاہ میں ——— تاکہ وہ طالب کے چہرۂ طلب کو اپنے "کعبۂ جمالِ لایزال" سے نہ پھیرے ——— اگر حقیقتِ التجا و تضرع (فی الحال) حاصل نہ ہو تو کم از کم صورتِ تضرع و نیاز مندی ہی کو ہاتھ سے نہ دے ——— حدیث اِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكَوْا (اگر تم کو رونا نہ آئے تو بہ تکلف ہی گریہ کرو) ——— اس حقیقت کو ظاہر

کرا رہی ہے ـــــ درد و شوق کی یہ محافظت اُس وقت تک ہے جب تک کہ شیخ کامل و مکمل میسّر نہ آئے ـــــ اور جب ایسا شیخ مل جائے تو اپنی تمام دل کی چاہتیں اس بزرگ کو سونپ دے اور جس طرح میت، غسّال کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس طرح خود کو اس کے سپرد کر دے ـ ـ ـ ـ ـ ـ
ابتداءً طالب کو اپنی کمالِ پستی و خساست کی بنا پر جنابِ اقدس جلّ سلطانہٗ سے مناسبت نہیں ہوتی اس لیے ایک " ذو جہتین برزخ " (جس کو عالمِ علوی و سفلی دونوں سے تعلق ہو) درکار ہے اور وہ برزخ، شیخ کامل ہے ـــــ
طلب میں فتور و سستی آجانے کے اسباب میں سب سے بڑا سبب ایسے شیخ ناقص کی طرف رجوع کرنا ہے جس نے سلوک و جذبہ کو باقاعدہ طے نہیں کیا اور (خواہ مخواہ) مسندِ شیخیت پر بیٹھ گیا ہے ـــــ طالب کو اس کی صحبت زہرِ قاتل اور اس سے رجوع کرنا مرضِ مہلک ہے ـــــ طالب کی بلند استعداد کو ایسی غلط صحبت پست کر دیتی ہے اور بلندی سے گڑھے میں ڈھکیل دیتی ہے ـــــ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر کوئی مریض کسی اناڑی طبیب سے دوا لے کر استعمال کرے تو اُس کا ایسا کرنا درحقیقت اپنے مرض میں اضافے کی کوشش کرنا اور (اس کے ساتھ ہی) ازالۂ مرض کی قابلیت کو بھی ضائع کرنا ہے ـــــ ہرچند وہ دوا شروع میں کچھ تخفیف مرض کر دے لیکن وہ حقیقت میں مجسّم مضرت ہے ـــــ اب اگر وہ مریض طبیب حاذق کے پاس پہنچے گا تو وہ اوّلاً اُس پہلی دوا کی تاثیر کو دور کرنے کے لیے مسہلات سے علاج کرے گا ـ جب اُس پہلے اثر کا ازالہ ہو جائے تب ازالۂ مرض کی فکر کرے گا ـــــ بزرگانِ نقشبندیہ کا مدارِ طریق، صحبتِ شیخ پر ہے محض گفتگو سے کام نہیں بنتا بلکہ ایسی صورت میں طلب کے اندر سستی رونما ہو جاتی ہے ـــــ ممکن ہے کچھ عرصے بعد دہلی و آگرہ کی جانب ہمارا سفر واقع ہو ـ اس موقع پر اگر تم تنہا ہمارے پاس آجاؤ اور کچھ حاصل کر کے جلد واپس چلے جاؤ تو اس کی گنجائش ہے ـ اس سے زیادہ کہنا دردِ سر پیدا کرنا ہے ـــــ
بعض اور باتیں بھی دریافت کی گئی تھیں اُن کا جواب یہ ہے کہ میاں شیخ تاج (شیخ تاج الدین سنبھلیؒ) اس علاقے میں بہت غنیمت بزرگ ہیں ـــــ لیکن تمھاری استعداد کو ان سے مناسبت کم ہے ـــــ رابطۂ مناسبت کے بغیر حصولِ مطلوب مشکل ہے ـــــ ویسے تمھیں سب اختیار

ہے ـــــ اگر کبھی کبھی اپنے حالات لکھتے رہا کرو تاکہ اِدھر سے بھی جو اباً کچھ لکھا جاتا رہے تو اچھا ہے ـــــ اس لیے کہ اس طریقے سے سلسلۂ اخلاص برابر قائم رہتا ہے۔ والسّلام ـــــ

مکتوب (۶۳) شیخ فرید بخاری کے نام ـــــ

(تمام انبیاء علیہم السلام اصُول دین میں متفق ہیں)

. . . . انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام سب کے سب رحمت ہیں کیونکہ ان بزرگوں کے توسط سے ایک عالم نجات ابدی سے بہرہ ور ہوتا ہے اور گرفتاریٔ دائمی سے نجات پا گیا ہے ـــــ اگر ان حضرات کا وجود نہ ہوتا تو حق سُبحانہ جو غنیٔ مطلق ہے نہ تو عالم کو اپنی ذات وصفات کی خبر دیتا اور نہ اپنی ذات وصفات کی طرف رہنمائی کرتا اور کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانتا اُس نے محض اپنے فضل وکرم سے بندوں کو خود اُن کے نفع کے لیے جن اوامر و نواہی کا مکلف بنایا ہے، اُن کا مکلف نہ بناتا، پھر اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات میں باہم امتیاز بھی نہ ہو سکتا ـــــ پس اِس نعمت عظمیٰ کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے اور کس کی طاقت ہے کہ اس فرض منصبی (شکر) سے (کما حقہ) سبکدوش ہو سکے ـــــ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر انعام فرمایا۔ ہمیں اسلام کی طرف ہدایت کی اور ہم کو انبیاء علیہم السّلام کے تصدیق کنندگان میں سے بنایا ـــــ

انبیاء علیہم السلام، اصُول دین میں متفق ہیں، ذات وصفات باری تعالیٰ، حشر ونشر، ارسالِ رُسل، نزول فرشتہ، ورودِ وحی، نعمتِ جنت، عذاب جہنم ـــــ ان سب مسائل میں سب انبیاء کا ایک ہی قول ہے ـــــ ہاں بعض احکام میں جو فروعِ دین سے تعلق رکھتے ہیں ان کا اختلاف ہے ـــــ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ہر پیغمبر اولوالعزم پر اُس زمانے کے لوگوں کے لیے بعض احکام مناسبہ کے متعلق وحی بھیجی ہے اور ان لوگوں کو احکام مخصوصہ کے ساتھ مکلف فرمایا ہے ـــــ احکام میں نسخ وتبدیل کا واقع ہونا اللہ کی حکمتوں اور مصلحتوں میں سے ہے ـــــ ایک صاحب شریعت پیغمبر پر بھی اوقات مختلفہ میں نسخ وتبدیل کے طور پر احکام متضادہ وارد ہوئے ہیں ـــــ ان حضرات انبیاءؑ کے کلمات متفقہ میں سے ایک کلمہ یہ ہے کہ

غیر حق کی عبادت نہ کی جائے نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے نیز اللہ کے علاوہ مخلوقات میں سے کسی کو اپنا رب نہ قرار دیا جائے ——— غیر حق کی عبادت کی نفی کرنا، انبیاءؑ کے ساتھ مخصوص ہے ——— انبیاءؑ کے متبعین کے علاوہ کوئی بھی اس دولت سے مشرف نہیں ہوا اور انبیاء کے علاوہ کسی نے ان کلمات طیبات کے ساتھ تکلم نہیں فرمایا ہے ——— منکرین نبوت اگرچہ خدائے تعالےٰ کو واحد کہتے ہیں مگر ان کا حال دو امر سے خالی نہیں یا وہ اہل اسلام کی تقلید (کا دعویٰ) کرتے ہیں یا اللہ تعالےٰ کو فقط " وجوب وجود " میں واحد جانتے ہیں۔ استحقاق عبادت میں نہیں! (اگر وہ اہل سنت کی تقلید کا دعوی کرتے ہیں تو ان کو واضح رہے کہ) اہل اسلام کے نزدیک تو اللہ تعالےٰ وجوب وجود میں بھی واحد ہے اور استحقاق عبادت میں بھی واحد ہے ——— کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سے مراد باطل معبودوں کی عبادت کی نفی کرنا اور معبودیت حق تعالیٰ کو ثابت کرنا ہے ———

دوسری بات جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے یہ ہے کہ وہ تمام آدمیوں کی طرح خود کو بشر جانتے ہیں اور معبود حقیقی اللہ تعالےٰ کو جانتے ہیں اور تمام لوگوں کو اسی کی طرف سر جھکانے کی دعوت دیتے ہیں نیز اللہ تعالےٰ کو حلول واتحاد سے منزّہ کہتے ہیں ——— منکرین نبوّت کا یہ حال نہیں ہے اُن کے تو بڑے بڑے معبودیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اللہ تعالےٰ کو اپنے اندر حلول کیے ہوئے ثابت کرتے ہیں اور اس طرح اپنے کو مستحق عبادت قرار دیتے اور اپنی الوہیت کے اطلاق سے مطلق اجتناب نہیں کرتے ——— اِسی وجہ سے وہ بندگی کے دائرے سے نکل کر گندے اعمال وافعال میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اُن کے ذریعے اباحت کا راستہ بھی خوب کھل جاتا ہے ——— (نادان) لوگ گمان کرتے ہیں کہ ان مدعیان الوہیت کو کسی قسم کی روک ٹوک نہیں یہ جو کچھ کہتے ہیں اُس کو ٹھیک جانتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اُس کو مُباح سمجھتے ہیں ——— یہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا ——— وائے ہے ان کے حال پر اور ان کے متبعین کے حال پر ———

تیسری بات جس میں انبیاء علیہم السلام متفق ہیں اور منکروں کا اس میں کوئی حصّہ نہیں یہ ہے کہ یہ بزرگ نزول ملائکہ کے قائل ہیں ——— وہ ملائکہ جو " معصوم مطلق " ہیں اور کوئی " تعلّق و تلوث " نہیں رکھتے ——— ملائکہ کو وہ وحی کا امین اور کلام ربانی کا حامل جانتے ہیں ——— الغرض یہ حضرات انبیاءؑ جو کچھ فرماتے ہیں اللہ تعالےٰ کی طرف سے فرماتے ہیں اور جو کچھ پہنچاتے ہیں

دہیں سے لے کر پہنچاتے ہیں ـــــ انبیاء کے احکام اجتہادیہ بھی وحی کی تائید حاصل کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر بالفرض ان میں سے کسی سے کوئی لغزش بھی واقع ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ فی الفور وحی قطعی کے ذریعے اس کا تدارک فرما دیتا تھا ـــــ اور جو لوگ منکرین نبوت اور مدعیان الوہیت ہیں وہ تو جو کچھ کہتے ہیں اپنی طرف سے کہتے ہیں اور اپنی الوہیت کے گھمنڈ میں اپنی من گڑھت ہی کو صحیح سمجھتے ہیں ـــــ پس انصاف درکار ہے کہ جو شخص کمال بے وقوفی کی بنا پر خود کو معبود اور مستحق عبادت قرار دے اور اس زعم فاسد کی بنیاد پر افعال ناشائستہ کرے اس کی باتوں کا کیا اعتبار ہے اور اس کی اتباع کس کام کی ع "سالیکہ نکو است از بہارش پیدا ست" اس قسم کی باتوں کا اظہار مزید وضاحت کی غرض سے ہے ورنہ حق و باطل اور نور و ظلمت دونوں جدا جدا اور ایک دوسرے سے ممتاز ہیں ـــــ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ـــــ (آیا حق اور گیا باطل ـــ بے شک باطل نابود ہونے والا ہی ہے)۔ اے اللہ! تو ہم کو ان اکابر (انبیاء علیہم السلام) کی متابعت پر ثابت قدم رکھ ... ...

مکتوب (۶۴) شیخ فرید بخاری کے نام ـــــ

(جسمانی و روحانی لذت و الم کے بیان میں)

... ... لذت و الم دنیا دو قسم پر ہے ـــ جسمانی[1] اور روحانی[2] ـــــ

جس چیز سے جسم کو لذت حاصل ہوتی ہے روح کو (درحقیقت) اس سے تکلیف ہوتی ہے اور جس چیز سے جسم دردمند ہوتا ہے روح کو اس سے لذت ملتی ہے ـــــ پس روح و جسم ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں ـــــ لیکن اس عالم آب و گل میں روح نے جسم کی قائم مقامی کر لی ہے اور جسم ہمانیات میں گرفتار ہو گئی ہے، نیز بحکم جسم پیدا کر کے وہ جسم کی لذت سے لذت یاب اور جسم کی تکلیف سے متاذی ہوتی ہے ـــــ یہ عوام کالانعام (چوپائے جیسے عوام) کا مرتبہ ہے ـــــ آیۂ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (یعنی جب انسان کافر ہوا تو ہم نے

اُس کو فروتر اشیاء سے بھی زیادہ فروتر کر دیا ایسے ہی لوگوں کے بارے میں صادق ہے —— وائے بزار وائے اگر روح اس گرفتاری سے خلاصی نہ پائے اور اپنے وطن اصلی کی طرف رجوع نہ کرے۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ یہ روح کی بیماری ہے کہ وہ اپنے (حقیقی) الم کو لذّت سمجھتی ہے اور (حقیقی) لذت کو الم تصور کرتی ہے بالکل غلبۂ صفرا کے مریض کی طرح کہ وہ شیرینی کو تلخ محسوس کرتا ہے —— پس عقلا پر اس مرض کا دور کرنا لازم ہے تاکہ جسمانی آلام و مصائب میں خوش خوش رہ کر زندگی بسر کریں۔ ۔ ۔ ۔
اگر اچھی طرح غور کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اگر دُنیا میں درد و الم اور مصیبت کا وجود نہ ہوتا تو پھر تو دُنیا کی قیمت ایک جَو کے برابر بھی نہ تھی۔ اس دُنیا کی ظلمتوں اور تاریکیوں کو یہاں کے مصائب و حوادث زائل کرتے ہیں —— حوادث کی تلخی کڑوی مگر فائدہ مند دوا کے مانند ہے جو مرض کو دور کر دیتی ہے —— بعض دعوت ہائے عام میں اس فقیر کو محسوس ہوا ہے کہ کھانا پکایا گیا اور اس دعوت میں خلوص نیت نہیں تھی۔ کچھ لوگ کھانا کھانے والوں میں سے شکوہ و شکایت کا دروازہ کھول دیتے ہیں اور کھانے میں عیب نکالتے اور کھلانے والوں کی مذمت کرتے ہیں —— صاحب طعام جب یہ سنتا ہے تو اُس کے دل میں شکستگی پیدا ہوتی ہے اور اُس کی یہی شکستگی قلب اُس ظلمت کا ازالہ کر دیتی ہے جو خلوص نیّت نہ ہونے کی وجہ سے کھانے میں پیدا ہو گئی تھی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ دعوت قبول ہو جاتی ہے —— اگر شکایت کرنے والے شکایت نہ کرتے اور صاحبِ دعوت کا دل نہ ٹوٹتا تو کھانا (عدم خلوص کی بنا پر) سراسر پُر از ظلمت و کدورت تھا، قبولیت کی ایسی صورت میں کیا گنجائش ہوتی، پس مدار کار شکستگیِ قلب اور پریشاں حالی پر ہے —— اور ہم "جو یارانِ عیش و تنعم" کے لیے یہ شکستگی، مشکل کام ہے —— وما خلقت الجنّ والانس الا لیعبدون (ہم نے جن و انس کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) نصِ قطعی ہے —— (اب دیکھنا یہ ہے کہ عبادت کے کیا معنی ہیں؟) عبادت سے مراد (اللہ کے آگے) ذلیل اور شکستہ ہونا ہے —— حاصل کلام یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد اُس کی خواری و ذلت ہے (خالق اکبر کے سامنے) ——
مسلمانوں اور دینداروں کا اس دُنیا میں جو اُن کا جیل خانہ ہے —— جو یانِ عیش و عشرت ہونا دُور از عقل بات ہے —— آدمی کو محنت کشی کی مشق کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے اور بار برداری کی ورزش کیے بغیر گزر نہیں —— حضرت حق تعالیٰ ہم بے طاقتوں کو اس امر پر استقامت نصیب

فرمائے ـــــــ بحرمت جدکم الامجد علیہ وعلی آلہ من الصلوٰت انمہا ومن التحیات اکملہا ـــــــ

مکتوب (۶۵) خان اعظم[۵] کے نام ـــــــ

[تاسف بر ضعف اسلام وزبونی مسلمانان
وترغیب تقویت اہل اسلام]

اللہ تعالیٰ آپ کی تائید کرے اور احکام اسلامیہ کے اونچا کرنے میں اعداء اسلام کے مقابلے میں آپ کی مدد فرمائے ـــــــ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الاسلام بدأ غریباً

۵ے مرزا عزیز کوکا (کوکلتاش) شمس الدین محمد غزنوی معروف بہ اتکہ کے صاحبزادے تھے (کوکا ترکی زبان میں دودھ شریک بھائی کو کہتے ہیں کوکلتاش بھی اسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ـــــــ اتکہ، ترکی میں رضاعی ماں کے شوہر کو کہتے ہیں) یہ اکبر کے رضاعی بھائی تھے، ان کی ماں جیجی بیگم اکبر کی رضاعی ماں تھی ـــــــ یہ بادشاہ کے بہترین جرنیلوں میں تھے، عقل و شجاعت دونوں میں کامل تھے ـــــــ سنہ ۱۶ جلوس اکبری میں ان کو خان اعظم کا خطاب ملا ـــــــ یہ کئی سال گجرات کے صوبے دار رہے ـــــــ ابوالفضل سے ان کی ان بن رہتی تھی ـــــــ عرصے تک یہ بارگاہی میں حاضر نہ ہوئے ـ اکبر نے ان کو دربار میں بلایا بھی لیکن ان کو حج بیت کی آرزو تھی مع عیال و اطفال بلا اجازت بادشاہ سنہ ۱۰۰۲ھ میں حجاز کو روانہ ہوگئے ـــــــ بعد حج بیت اللہ ہندوستان واپس ہوکر بادشاہ کے پاس آگئے ـ بادشاہ ان سے بغل گیر ہوا اور کچھ عرصے بعد وکالت کے عہدے پر سرفراز کیا اور اپنی مہر ان کے سپرد کردی، آخر کار منصب ہفت ہزاری تک پہنچے ـ عہد جہانگیری کے انیسویں سال سنہ ۱۰۳۳ھ میں بمقام احمد آباد گجرات وفات پائی ان کی نعش کو دہلی لایا گیا اور اپنے باپ کے مقبرے کے پاس دفن ہوئے ـ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے نزدیک بنگلے والی مرکزی مسجد کے جنوب میں سنگ مرمر کی جو عمارت چونسٹھ کھمبے کے نام سے مشہور ہے وہ انھیں خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کا مقبرہ ہے جو سنہ ۱۰۲۴ھ میں تعمیر ہوا ـــــــ

(ماخوذ از قاموس المشاہیر جلد اول ـــــــ خرابات نگار، آثار المتاخرین، ترجمہ انتخاب سیر المتاخرین و ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد اول)

وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء (اسلام اپنے آغاز میں اجنبیت، اور کس مپرسی کی حالت میں رہا اور جس طرح اس کا آغاز ہوا تھا عنقریب وہ پھر اسی طرح ہو جائے گا۔ پس خوشخبری ہے غرباکو یعنی اُن لوگوں کو جو ایسی حالت میں اسلام سے وابستگی رکھنے کی بنا پر اس کے شریک حال ہوں) ـــــ غربت اسلام اس حد کو پہنچی ہے کہ کفار برملا طعن اسلام اور "ذم مسلمانان" کرلیے ہیں اور بے محابا احکام کفر کا اجرا اور اہل کفر کی مداحی کوچہ و بازار میں ہو رہی ہے ـــــ مسلمان، اجرائے احکام سے روک دیئے گئے ہیں اور شریعت کی انجام دہی میں قابل ملامت و مطعون ہیں ے

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

سبحان اللہ و بحمدہٖ ـــــ

... رونق شرع شریف، سلاطین کے ساتھ وابستہ تبلائی گئی ہے مگر اب قضیہ بالکل الٹا ہے اور معاملہ برعکس ہے ـــــ واحسرتا، واندامتا، واویلا ـــــ
ہم اس دَور میں آپکے وجود کو غنیمت سمجھتے ہیں ـــ اور اس "معرکۂ ضعیف وشکست خوردہ" میں آپ ہی کو ایک ایسا جرنیل سمجھتے ہیں جو خم ٹھونک کر میدان مقابلہ میں آجائے ـــــ حق تعالیٰ آپ کا ناصر و موید ہے ـــــ بحرمۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم۔

حدیث شریف میں ہے ـــ لن یومن احد کم حتیٰ یقال انہٗ مجنون (تم میں سے کوئی اس وقت تک ہرگز کامل ایماندار نہیں ہو سکتا جب تک اس کو دین کے معاملے میں مجنون نہ کہا جائے) ـــ اس وقت وہ جنون جس کی اصل غیرت اسلام کی کثرت ہے آپ کی طبیعت میں محسوس ہو رہا ہے الحمد للہ سبحانہٗ علیٰ ذالک ـــ آج وہ زمانہ ہے کہ عمل قلیل کے مقابلے میں اجر جزیل عطا فرمائیں گے ـــ اصحاب کہف سے ہجرت کے علاوہ اور کوئی عمل نمایاں نہیں ہے مگر اسی ایک بر وقت عمل نے اُن کو فضائل عطا کیے ـــــ سپاہی غلبۂ اعدا کے وقت اگر تھوڑی سی جد و جہد کرتے ہیں تو اس کا بہت کچھ اعتبار ہوتا ہے بخلاف زمانۂ امن کے ـــــ یہ جہاد قولی جو آج آپ کو میسر ہے ـــ جہاد اکبر ہے ـــ اس کو غنیمت

سمجھیے اور اس میں ترقی طلب کیجیے ــــ اس "جہاد گفتن" کو "جہاد کشتن" سے بہتر جانیے ــــ
ہم جیسے فقرائے بے دست و پا اس دولت سے محروم ہیں ــ
دادیم ترا از گنج مقصود نشاں   گر ما نرسیدیم تو شاید برسی
حضرت خواجہ احرارؒ فرمایا کرتے تھے "اگر میں شیخت پر آجاؤں تو کوئی دنیا میں میرے مقابلے میں مرید نہ پاسکے ــــ مگر مجھے تو کسی اور کام کے لیے ہی حکم دیا گیا ہے اور وہ کام ترویج شریعت اور تائید ملت ہے" ــــ چنانچہ خواجہ احرارؒ سلاطین کے پاس جایا کرتے تھے اور اپنے تصرف سے ان کو مطیع بناتے تھے اور اُن بادشاہوں کے ذریعے ترویج شریعت کیا کرتے تھے ــــ التماس یہ ہے کہ جب کہ حق تعالیٰ نے بزرگان نقشبندیہ کی محبت کی برکت سے آپ کی بات میں ایک تاثیر بخشی ہے اور آپ کی عظمت مسلمانی تمام اقران و امثال میں ظاہر ہو گئی ہے ــــ سعی فرمائیں کہ کم از کم اہل کفر کے وہ شعائر جو اہل اسلام میں رائج ہو گئے ہیں ختم ہو جائیں ــــ اور مسلمان اُن منکرات سے محفوظ رہیں ــــ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری اور تمام مسلمین کی طرف سے بہترین جزا عطا فرمائے ــــ پچھلی سلطنت (عہد اکبری) میں تو دین مصطفوی کے ساتھ ایک دشمنی محسوس ہوتی تھی ــــ اس سلطنت (جہانگیری) میں بظاہر وہ دشمنی تو نہیں ہے اگر ہے بھی تو عدم علم کی وجہ سے ہے ــــ مگر ــــ خوف یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اس سلطنت میں بھی انجام کار دشمنی دین تک نوبت پہنچ جائے اور مسلمانوں کا معاملہ تنگ تر ہو جائے ع "چو بید بر سر ایمان خویش می لرزم"
اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو متابعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر ثابت قدم رکھے ــــ
فقیر ایک تقریب میں یہاں آیا ہوا ہے دل نے نہ چاہا کہ اپنے آنے کی اطلاع آپ کو نہ دوں اور بعض نفع مند باتیں آپ کو نہ لکھوں اور اس محبت قلبی سے جو مناسبت طبع کے باعث آپ سے ہے آپ کو آگاہ نہ کروں ــــ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ــــ من احبّ اخاہٗ فلیُعْلِمْہُ اِیّاہ ــــ یعنی جو کسی برادر مسلم سے محبت کرے اُس کو چاہیے کہ اپنی محبت کا اظہار اُس سے کر دے ــــ

والسلام علیکم وعلیٰ جمیع من اتبع الھدیٰ

مکتوب (۶۸) خان خاناں کے نام

[اس بیان میں کہ تواضع اغنیاء کو زیبا ہے
اور استغنار ارباب فقر کو]

مخدوما ! ۔ من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

تواضع اغنیاء کے لیے زیبا ہے اور استغنا اہل فقر کو۔ اس لیے کہ ہر مرض کا ازالہ اس کی ضد سے ہوا کرتا ہے ـــــ آپ کے تینوں خطوط میں استغنار اور بے نیازی کے سوا کچھ مفہوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ آپ کا مقصود تواضع تھا۔ . . . . . .

میں مانتا ہوں کہ آپ نے خدمتِ فقراء بہت کچھ کی ہے لیکن آدابِ خدمت کی رعایت بھی بہت ضروری ہے تاکہ خدمت کا ثمرہ مرتب ہو، رعایت آداب کے بغیر خدمت کرنا درخت خار دار پہ ہاتھ مارنا ہے . . . . . .

طائفہ درویشاں کو ذلیل و خوار نہ سمجھیں رُبّ اشعثَ مد فوعٍ بالا بواب لَو اقسم علی اللّٰہ لا برّہٗ ـــ یعنی بہت سے ایسے بندگان پراگندہ حال ہیں جن کو لوگ اپنے دروازوں سے دھکیلتے ہیں لیکن اگر وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کو ضرور پورا کرے ـــــ یہ حدیث نبوی ہے علیہ الصلوٰۃ والسّلام ہے ـــــ ؎

ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است
اندکے پیش تو گفتم غم دل

آپ کے محبوں اور مخلصوں پر لازم ہے کہ نفس امر (صحیح بات) کا لحاظ رکھیں اور آپ کو جو بات پہنچائیں وہ نفس الامر ہو اور جو مشورہ دیں اس میں آپ کی بہتری پیش نظر رکھیں نہ کہ اپنی مصلحتیں ـــــ اپنے ذاتی مصالح ملحوظ رکھنا خیانت محض ہے ـــــ . . . . . ہر چند کہ یہ باتیں "تلخ نما" ہیں مگر آپ کے خوشامد گو تو بہت سے ہیں ان پر ہی اکتفا کریں، ہم فقراء کی دوستی کا مقصد تو پوشیدہ عیوب پر مطلع ہونا اور رذائل پنہاں کا ظہور ہے ـــــ لیکن یہ واضح رہے کہ اس قسم کی باتیں دل آزاری کے طور پر نہیں بلکہ نیک خواہی اور دل سوزی کی بنا پر لکھی جا رہی ہیں ـــــ یقین جانیے کہ (آپ کے فرزند) خواجہ محمد صدیق اگر ایک روز پیشتر

بھی آجاتے تو ممکن ہے فقیر بہر حال میں اپنے کو آپ تک پہنچا دیتا لیکن انھوں نے اثناء راہ سرہند بس ملاقات کی ـــــ اُمید کہ معذور رکھیں گے ـــــ الخیر فیما صنع اللہ سبحانہ (اللہ جو کرے وہ خیر ہی خیر ہے) ـــــ

مکتوب (۶۹) خانِ خاناں کے نام ـــــ

[تواضع موجبِ نعمتِ دارین ہے اور متابعت اہلسنت و جماعت سے نجات وابستہ ہے]

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ ـــــ التفات نامۂ گرامی مولانا محمد صدیق کی معرفت وصول ہوا ـــــ بڑا کرم فرمایا ـــــ جزاکم اللہ خیر الجزاء ـــــ چونکہ اب آپ رعایت آدابِ فقرا بجا لائے ہیں اور تواضع کے ساتھ بات کہی ہے اُمید ہے کہ من تواضع للہ رفعہ اللہ (الحدیث) (یعنی جس نے اللہ کے لیے تواضع کی اللہ نے اس کو اونچا کر دیا) کی رُو سے آپ کا یہ نیچے اُترنا دینی و دنیوی بلندی کا باعث بن جائے گا ـــــ آپ کو بشارت ہو ـــــ چونکہ آپ المنابت ورجوع کے الفاظ درمیان میں لائے ہیں یوں تصور کریں کہ یہ رجوع درویشوں میں سے ایک درویش کے ہاتھ پر واقع ہوا ہے۔ اس کے نتائج و ثمرات کے منتظر رہیں ـــــ لیکن اس کے حقوق کا حتی الامکان لحاظ رکھیں ـــــ وصیتیں اور نصیحتیں کیا لکھوں اور علوم و معارف کا کیا اظہار کروں علماء مجتہدین اور صوفیاء محققین نے بسط و تفصیل سے سب باتیں لکھ دی ہیں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور شاید اس فقیر کے مسودات کا کچھ حصہ بھی بعض احباب آپ کی خدمت میں لے گئے ہیں آپ کی نظر سے وہ حصہ گزرا ہوگا ـــــ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نجات کا طریقہ اہلسنت وجماعت کی متابعت ہے ـــــ اقوال میں بھی، افعال میں بھی، اُصول میں بھی، فروع میں بھی ـــــ اس لیے کہ یہ گروہ ہی فرقۂ ناجیہ ہے ـــــ دیگر فرقے معرض زوال اور قرب ہلاک میں ہیں ـــــ آج کوئی جانے یا نہ جانے کل بروز قیامت ہر ایک جان لے گا ـــــ مگر اُس دن جاننا کچھ نفع نہ دیگا ـــــ اے اللہ ہم کو آگاہ کر دے پہلے اس سے کہ موت ہمیں آگاہ کرے ... ...

مکتوب (۷۰) خان خاناں کے نام

. . . . زندگانی چند روزہ کو صاحب شریعت کی اتباع میں بسر کرنا چاہیے اس لیے کہ عذاب اُخروی سے چھٹکارا اور تنعمات سرمدی تک پہنچنا اتباع شریعت کی سعادت ہی سے وابستہ ہے ـــــــ پس مال نامی اور جنگل میں چرنے والے چوپایوں کی پوری پوری زکوٰۃ ادا کرنا اور اس امر کو اموال و چہارپایگاں میں نہ پھنسنے کا وسیلہ بنانا چاہیے ـــــ لذیذ کھانوں اور نفیس کپڑوں میں حظ نفس کو ملحوظ نہ رکھا جائے بلکہ کھانے اور پینے کی چیزوں میں سوائے اس کے کہ ادائے عبادت پر قوت حاصل ہوگی اور کوئی نیت نہ کی جائے ـــــ اچھا کپڑا اس نیت سے پہنا جائے کہ قرآن میں فرمایا ہے خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اے فرزندان آدم! نماز کے وقت زینت کو اختیار کرو) ـــــ اگر حقیقت نیت میسر نہ ہو تو خود کو بہ تکلف ہی اس نیت پر لانا چاہیے . . ہمیشہ حق تعالیٰ سے ملتجی رہنا چاہیے کہ حقیقت نیت میسر آجائے اور تکلف سے نجات ملے ـــــ ؎

می تمانند کہ دہد اشک مرا حسن قبول ۔ آں کہ در ساختہ است قطرۂ بارانی را

علیٰ ہذا القیاس تمام امور میں علماء دیندار (جنھوں نے راہ عزیمت اختیار کی ہے اور رخصت سے اجتناب کیا ہے) کے فتوی کے مطابق زندگی گزار کر اس امر کو وسیلۂ نجاتِ ابدی سمجھنا چاہیے ـــــ مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (اگر تم اللہ کا شکر ادا کروگے اور اس پر ایمان لاؤگے تو وہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا) ـــــ

مکتوب ۷۱ مرزا داراب ابن خان خاناں کے نام ـــــ

اللہ تعالیٰ تمہاری تائید کرے اور تمہاری مدد فرمائے ـــــ انعام کرنے والے کا شکر ادا کرنا اُس شخص پر جس پر انعام ہوا ہے عقلاً و شرعاً واجب ہے اور یہ مسلّم ہے کہ وجوب شکر بانداز ۂ وصول نعمت ہے۔ پس جتنی نعمت زیادہ ہوگی وجوب شکر بھی زیادہ ہوگا ـــــ تونگروں پر اُن کے درجات کے پیش نظر بہ نسبت فقراء کے کئی گنا شکر واجب ہے اسی بنا پر اس اُمت کے فقراء، مالداروں سے پانچسو سال پہلے بہشت میں

بائیں گے ۔۔۔ منعم حقیقی کا شکر یا اوّلاً تو فرقۂ ناجیہ (اہلسنت وجماعت) کے مطابق تصحیح عقائد کے ذریعے ہو ۔۔۔ دوسرے مجتہدین اہلسنت کی رائے کے مطابق احکام شرعیہ علیہ کو انجام دے کر ۔۔۔ تیسرے صوفیائے اہلسنت کے طریقے سے تصفیہ و تزکیہ کر کے ۔۔۔ اور اس تیسرے رکن کا وجوب استحسانی ہے برخلاف دو سابق رکنوں کے ۔۔۔ اس لیے کہ اصل اسلام تصحیح عقائد اور ادائیگی اعمال ہی سے وابستہ ہے، البتہ کمال اسلام، تزکیہ سے متعلق ہے اور جو عمل ان ارکان ثلثہ کے مخالف ہو اگرچہ ریاضات شاقہ اور مجاہدات شدیدہ کی جنس ہی سے کیوں نہ ہو ۔۔۔ داخل معصیت ہے ۔۔۔

۔۔۔ پس تم کو متابعت سیدنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم و متابعت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم لازم ہے ۔۔۔

مکتوب (۴۲) خواجہ جہاں کے نام ۔۔۔

۔۔۔ دین و دنیا کا جمع کرنا جمع اضداد کے قبیل سے ہے پس طالب آخرت کو ترک دنیا ضروری ہوا ۔۔۔ مگر چونکہ اس وقت حقیقت ترک میسر نہیں ہے بلکہ مشکل ہے اس لیے ضرورتاً ترک حکمی پر اکتفا کر لیا جائے ۔۔۔ ترک حکمی سے مراد یہ ہے کہ امور دنیویہ میں شریعت کے مقتضا کا محکوم رہا جائے، کھانے پینے، رہنے سہنے میں حدود شرعیہ کی رعایت کی جائے، ان حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اِل نامی میں اور جنگل میں چرنے والے مویشیوں میں زکوٰۃ ادا کی جائے ۔۔۔ جب احکام شرعیہ کی بجاآوری سے آراستگی ہو گئی ۔۔۔ مضرت دنیا سے نجات حاصل ہو گئی اور دنیا آخرت کے ساتھ جمع ہو گئی ۔۔۔ اگر یہ قسم ترک حکمی بھی کسی کو میسر نہیں تو ایسا شخص بحث سے خارج ہے ۔۔۔ وہ حکم منافق رکھتا ہے محض صورت ایمان، آخرت میں اس کو سود مند نہ ہوگی ۔۔۔ اُس کو صورت ایمان سے بس یہ فائدہ حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کا خون اور مال محفوظ ہو جاتے ہیں ؎

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم ... تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سا صاحب نصیب ہے جو طمطراق دنیاوی، خدم و حشم، طعامہائے لذیذ و چرب و لباسہائے فاخرہ کے ہوتے کلمۂ حق کو سمع قبول سے سُنے ؎

گوش از بار در گراں شدہ است ... نشنود نالۂ و فغان مرا

اللہ آپ کو اور ہم کو متابعت شریعت مصطفویہ کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام اولاً و آخراً ۔

حقیقتِ ایمان

(ایک تازہ تقریر)

"یہ ناچیز اسی ماہ نومبر میں حیدرآباد دکن گیا تھا، ایک ہفتہ قیام رہا، روزانہ ایک دو تقریریں کرنی پڑتی تھیں، اور وہاں کے متعدد احباب ان تقریروں کو قلمبند کرنے کا اہتمام کرتے تھے، پہلے دن ۱۴ نومبر کو وہاں کی خاص علمی مجلس "اسلامک اسٹڈیز سرکل حیدرآباد" میں بعد مغرب ایک مختصر تقریر کی گئی تھی وہ ذیل میں درج کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ ناظرین کو اس سے نفع پہنچائے، اور جن دوست کی یہ لکھی ہوئی ہے ان کو بھی اس کا پورا پورا اجر عطا فرمائے"

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ لقد جاءت رسل ربنا بالحق صلوات اللہ تعالیٰ علیھم وعلی کل من تبعھم باحسان۔

محترم حضرات!

مجھے کل یہاں آکر اچانک معلوم ہوا کہ آپ حضرات کی ایک خاص قسم کی علمی مجلس میں بھی مجھے کچھ کہنا ہے، اور یہ بات مجلس کے ذمہ دار حضرات کے اور یہاں کے میرے دوستوں کے مابین طے ہو چکی ہے، میں بغیر کسی انکسار اور تواضع کے عرض کرتا ہوں کہ آپ حضرات کو یا میرے اُن دوستوں کو جنھوں نے یہ طے کیا ہے میرے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے واقعہ یہ ہے کہ میں اس طرح کا علمی آدمی نہیں ہوں کہ آپ جیسے حضرات کی معلومات میں کوئی خاص اضافہ کر سکوں، اور آپ کی خدمت میں کوئی علمی تحفہ پیش کر سکوں، میرا حال یہ ہے کہ پُرانے قسم کے ہمارے دینی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے میں نے بس وہ پڑھا ہے، اور پڑھایا بھی ہے، اور یہ سلسلہ اب تک بھی جاری ہے، لیکن اس کے علاوہ میرا مطالعہ بہت محدود ہے، میں تو بس حرف

اس چیز کا مطالعہ کرتا ہوں جس کے مطالعہ کی اپنے لئے کوئی خاص ضرورت محسوس کرتا ہوں، بغیر احساس ضرورت کے مجھ سے کسی چیز کا مطالعہ نہیں کیا جاتا، اور میرا یہ حال صرف کتابوں ہی کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ یہ میرا عام مزاج ہے اور گویا میری فطرت ہے، آپ میری اس افتادِ طبع کو شاید اس سے سمجھ سکیں کہ باوجودیکہ میں طالب علمی کے سلسلہ میں اپنی ۱۳ - ۱۴ سال کی عمر میں دہلی رہا ہوں، پھر اسکے بعد بھی بارہا کئی کئی مہینے دہلی قیام کرنے کا اتفاق ہوا ہے، اور آمد و رفت کا تو کوئی حساب و شمار ہی نہیں، لیکن یہ سنکر شاید آپ کو تعجب ہو کہ میں نے آج تک "لال قلعہ" نہیں دیکھا ہے کیونکہ مجھے اسکے دیکھنے کی ضرورت کا کبھی احساس نہیں ہوا، اسی طرح اپنی عمر میں بار بار آگرہ جانے کے باوجود میں نے کبھی "تاج محل" نہیں دیکھا۔ میں اپنی اس حالت کو کوئی کمال نہیں سمجھتا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ایک پہلو سے یہ نقص ہے، لیکن میں کیا کروں میرے مزاج اور میری طبیعت کی افتاد یہی ہے۔ بس یہی حال میرا کتابوں کے مطالعہ کے باب میں ہے جب تک کسی کتاب کے مطالعہ کی خاص ضرورت مجھے محسوس نہ ہو میں اُسے نہیں دیکھتا۔ اسلئے میرا مطالعہ اور میری معلومات کا دائرہ بہت محدود ہے، ظاہر ہے کہ ایسا آدمی آپ جیسے ممتاز اہل علم کی معلومات میں کیا اضافہ کرسکتا ہے، اسکے باوجود جب یہ بات میرے علم میں آئی، کہ آج بعد مغرب میں آپ حضرات کی "علمی مجلس" میں مدعو ہوں، اور وہاں مجھے کچھ کہنا ہے، تو میں نے طے کرلیا کہ انشاء اللہ کچھ کہوں گا، اور اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ آپکے اور میرے لئے نفع بخش ہوگا، میں نے سوچا ہے کہ بجائے کسی علمی افادے کے اپنا ایک حال اور اپنی ایک ضرورت آپ حضرات کے سامنے بیان کروں، میرا خیال ہے کہ آپ میں سے بہت سے حضرات کا بھی وہی حال ہوگا، اور اُس ضرورت میں آپ بھی میرے شریک ہوں گے، خدا کرے کہ اس وقت کی میری گذارش سے اپنی اس ضرورت کے احساس میں، اور اس کے لئے فکرمندی میں کچھ اضافہ ہوجائے۔

محترم بزرگو اور دوستو!

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے دو درجے ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ دو مقام ہیں، ایک کا اصطلاحی عنوان **اسلام** ہے، اور دوسرے کا **ایمان**۔ سورۂ حجرات میں ایک موقع پر کچھ لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے:- "قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ" یعنی یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہمیں ایمان حاصل ہوگیا۔ اے رسولؐ! آپ ان سے کہدیجئے کہ تمھیں ابھی مقام ایمان حاصل نہیں ہوا ہے، اسلئے یہ مت کہو کہ ہمیں ایمان حاصل ہوگیا ہے، بلکہ یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، کیونکہ ابھی تمھیں اسلام ہی کا مقام حاصل ہوا ہے، ایمان جس حقیقت کا نام ہے، وہ

ابھی تمھارے دلوں میں نہیں اُتری ہے ——— ان اعراب کا حال یہ تھا کہ انھوں نے دعوت اسلام قبول کرلیا تھا، اسکے بنیادی عقائد مان لئے تھے، نماز، روزہ جیسے اعمال یہ کرنے لگے تھے، اُن سے یہ فرمایا گیا کہ جس مقام پراس وقت تم ہو یہ "اسلام کا مقام" ہے۔ "ایمان کا مقام" اس سے آگے ہے، اور وہ ابھی تمھیں حاصل نہیں ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں، اور آخرت کے بارے میں اور اسی طرح کے دوسرے غیبی امور کے بارے میں پیغمبر کی زبان اور اللہ کی کتاب جو کچھ بتائے دل کو اس کا ایسا یقین ہوجائے جیسا کسی چیز کے مشاہدہ کے بعد ہوتا ہے جس کے بعد کسی قسم کے شک اور وسوسہ کی گنجائش نہیں رہتی، اور پھر وہ یقین ہی زندگی کا سب سے بڑا عامل بن جاتا ہے۔ اسی کے بارے میں حضرت امام بخاریؒ نے اپنی "الجامع الصحیح" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ: "الیقین الایمان کلہ" ——— بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نظری اور علمی طور سمجھنا تو بہت مشکل ہوتا ہے لیکن جب وہ موجود ہوکر سامنے آجائیں تو دیکھنے والوں کے لئے وہ ایک بالکل بدیہی بات ہوتی ہے، یہ ایمان بھی اسی قسم کی ایک حقیقت ہے، اسکے حاملوں کو دیکھ کر اس کی حقیقت بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاسکتی ہے، اس کا بہترین نمونہ صحابۂ کرامؓ کی پوری جماعت تھی۔ ایک صحابی (حارث بن مالکؓ) سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن دریافت فرمایا: "کَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا حَارِث؟" (آج تمھارا کیا حال ہے؟)۔ انھوں نے عرض کیا: "اَصْبَحْتُ بِنِعْمَةِ اللهِ مُؤْمِنًا حَقًّا" (خدا کے فضل سے میں نے ایمان کی حالت میں صبح کی ہے)۔ آپ نے فرمایا: "اُنْظُرْ مَا تَقُوْلُ الخ" (یعنی سوچو تم کیا کہہ رہے ہو! ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، ایمان کی بھی ایک حقیقت ہے، کیا وہی حقیقت تم کو حاصل ہے؟) انھوں نے عرض کیا: — الحمد للہ میرا یہ حال ہے کہ عرشِ الٰہی گویا میری آنکھوں کے سامنے ہے، اور جنت کی بہاروں کا، اور اس میں جنتیوں کی ملاقاتوں کا گویا نظارہ کر رہا ہوں، اور دوزخیوں کی چیخ پکار گویا میرے کان سن رہے ہیں۔

ان صحابیؓ کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں میں نے جو کچھ آپ کی زبانِ مبارک سے سنا ہے، اور جو کچھ قرآن مجید نے بتایا ہے، اس کا مجھے ایسا یقین حاصل ہے کہ گویا میں اس کو دیکھ رہا ہوں اسی طرح آخرت کے بارے میں اور دوزخ وجنت کے بارے میں، میں نے جو آپ سے سنا ہے اور جو قرآن مجید میں پڑھا ہے، اس کا بھی ایسا یقین حاصل ہے کہ گویا وہاں کی آوازیں تک کانوں میں گونج رہی ہیں —

صحابی رضؓ نے جو اپنا حال بتایا یہی بس "ایمان کی حقیقت" ہے، اور یہ اُن ہی کی خصوصیت نہ تھی، بلکہ عام جماعت صحابہؓ کا یہی حال تھا۔

ایک تابعی بزرگ نے جن کا مجھے اس وقت نام یاد نہیں، صحابۂ کرامؓ کے بارے میں اپنے زمانے کے لوگوں سے فرمایا تھا کہ ہم نے ان کو دیکھا ہے، وہ نماز، روزہ جیسے اعمال میں تم سے بہت بڑھے ہوئے نہیں تھے، ان کا خاص امتیاز ان کے دل کا یقین تھا، جو اُن کے دلوں میں جاگزیں ہوگیا تھا، ان کے الفاظ ہیں "ولکنّہ شیءٌ وَقَرَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ"

ایک دوسرے تابعی بزرگ غالبًا سیدنا حسن بصریؒ کا صحابۂ کرامؓ ہی کے بارے میں ارشاد ہے :۔

"کَاَنَّھُمْ رَاْیَ عین" یعنی اُن کے پاس بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو غیبی حقیقتیں ہم نے صرف سُنی ہیں اور جن کا ذکر ہم نے قرآن مجید میں پڑھا ہے، اُن کو انھوں نے گویا آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک صحابیؓ کا مشہور و معروف شعر ہے :۔

ارانا الھدی بعد العمی فقلوبنا
بہ موقنات ان ما قال واقع

یعنی ہم اندھیرے میں تھے، اور گویا بالکل اندھے تھے، آپؐ نے آکر ہمیں راہِ ہدایت دکھائی، اب خدا کے فضل سے ہمارا یہ حال ہے کہ ہمارے دلوں کو اس بات کا پورا پورا یقین نصیب ہے کہ جو کچھ آپؐ نے فرمایا ہے وہ بلا شبہ واقع ہونے والا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کا حال یہی تھا کہ جو چیز انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن لی تھی اُس کا پورا پورا یقین ان کو حاصل تھا، ان کے لئے اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی، پھر ان کا یہ حال صرف ایمانیات ہی کے بارے میں نہیں تھا، بلکہ جس باب کی جو بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے فرمائی، ان کے دلوں کو اس کا پورا پورا یقین حاصل ہوگیا، اگرچہ ظاہری حالات کے لحاظ سے وہ بالکل بعید از قیاس ہی کیوں نہ ہو۔

مکہ معظمہ کی انتہائی مظلومیت کے دَور میں یہ بات کس قدر بعید از قیاس تھی کہ عنقریب یہاں اسلام کو اقتدار اور غلبہ نصیب ہوگا، اور دشمن طاقتیں اسلام کے مقابلے میں سرنگوں ہوں گی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی اور صحابۂ کرامؓ کے دلوں نے بغیر کسی شک و وسوسہ کے اس پر یقین کیا، ایسا بھی ہوا کہ

کبھی کسی شخص کے بارے میں آپ نے کوئی جزوی بات فرمائی جس کا تعلق نہ ایمانیات سے ہے نہ اصولِ دین سے نہ امت کے کسی اہم مسئلے سے، لیکن سننے والوں نے اس پر بھی ویسا یقین کیا، جیسا یقین آج ہمیں ایمانیات کے بارے میں بھی نصیب نہیں ہے۔ اس کی مثال کے طور پر ایک واقعہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

آپ حضرات میں سے یہ تو بہت سوں کو معلوم ہوگا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بعض خاص حالات اور اسباب کی بناء پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ یا حکم سے شہروں اور آبادیوں سے الگ ربذہ کے مقام پر رہائش اختیار کرلی تھی، یہ مقام مکہ معظمہ سے کوفہ جانے والی سڑک پر چند منزل کے بعد آتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے وہیں ایک جھونپڑا ڈال لیا تھا، اور وہیں اکیلے رہتے تھے، ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت ہی میں ایک سال بیمار پڑے، اور بیماری برابر بڑھتی گئی، یہاں تک کہ زندگی کے خاتمہ کے آثار ظاہر ہوگئے، قدرتی طور پر ان کی بیوی بہت متاثر اور فکرمند تھیں، انھوں نے بیوی کو اس حال میں دیکھ کر فرمایا:— تم کیوں اتنی متفکر و متاثر ہو؟— بیوی جو انھیں کی صحبت یافتہ تھیں انھوں نے عرض کیا، کہ:— اللہ کا جو فیصلہ ہے، وہ ہر ایک کے حق میں نافذ ہونے والا ہے، اور ہر ایک کو یہاں سے کوچ کرنا ہے، اسلئے میری یہ فکرمندی اور پریشانی آپ کی جدائی کے خیال سے نہیں ہے، بلکہ مجھے یہ فکر ہے کہ اگر اللہ کی یہی مشیئت ہے، اور وقت موعود قریب ہی آگیا ہے، تو اس جنگل بیابان میں، میں اکیلی عورت ذات کیا کرسکوں گی، اور کیسے کرسکوں گی۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا:— اس کی فکر بالکل نہ کرو، بالکل مطمئن ہوجاؤ، جب وہ وقت آئے گا، اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو یہاں بھیجے گا، وہی میرے کفن دفن کا سب انتظام کرینگے —— یہاں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ وہ وقت تھا جبکہ حج میں بس چند دن باقی تھے، دو چار دن پہلے تک تو کوفہ کی طرف سے آنیوالے حجاج کے قافلے اس سڑک پر برابر گذر رہے تھے، لیکن حج کی تاریخ چونکہ بالکل قریب آچکی تھی، اسلئے یہ سڑک ایک دو دن سے بالکل خاموش تھی، جن کو کوفہ سے مکہ جانا تھا، وہ حج کے حساب سے مکہ پہنچ چکے تھے، اور حج کے قریب کی وجہ سے اب مکہ سے کوئی کوفہ جانے والا نہ تھا، الغرض اس وجہ سے ایک دو دن پہلے سے یہ سڑک بالکل خاموش تھی، نہ کوئی اِدھر سے اُدھر جانے والا تھا، نہ اُدھر سے اِدھر آنے والا، اسلئے حضرت ابوذرؓ کی محترمہ بیوی نے عرض کیا، کہ:— آپ یہ بات کس بنیاد پر فرما رہے ہیں، دو تین دن سے

سڑک پر تو بالکل آمد ورفت نہیں ہے، اور کوئی امید بھی نہیں ہے، کہ اب جلد ہی کوئی قافلہ اس سڑک سے گذرے گا، ذریعے جن کو مکہ مکرمہ جانا تھا، وہ حج کے حساب سے جاچکے، اور حج ختم ہونے سے پہلے اب کون مکہ سے کوفہ کی طرف چلے گا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے پھر بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ کچھ بھی ہو ایسا ہی ہوگا میرے کفن دفن کیلئے اور میری نمازِ جنازہ پڑھنے کیلئے اللہ کے کچھ بندے ضرور بر وقت پہنچیں گے۔ پھر فرمایا:۔ میں یہ بات اس یقین و وثوق سے اس بنیاد پر کہتا ہوں کہ ایک دفعہ جب حضورؐ کی مجلس میں، میں حاضر تھا، اور میرے علاوہ ہمارے ساتھیوں میں سے نو اور بھی حاضر تھے، الغرض حضورؐ کے علاوہ ہم سب دس تھے، تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا، کہ :۔ تم میں سے ایک وہ ہے جس کا آخری وقت آبادیوں سے الگ ایک جنگل بیابان میں آئے گا، اور اس کی نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین کیلئے عین وقت پر اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو بھیجے گا، میں نے حضورؐ کے اس ارشاد کو یاد رکھا، اور اپنے سب ساتھیوں کو بھی یاد رکھا، میرے علاوہ جو نو تھے اُن میں سے ہر ایک کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچ چکے، اور ہر ایک کا انتقال کسی نہ کسی آبادی میں ہوا، اُن دس میں سے بس میں ہی رہ گیا ہوں، اسلئے مجھے بغیر کسی شک شبہ کے یقین ہے کہ حضورؐ کی یہ بات میرے ہی بارے میں پوری ہوگی، لہٰذا تم بالکل مطمئن ہوجاؤ، اور وہ وقت بہت قریب ہے، اسلئے بس اب اس کی تیاری شروع کرو، فلاں جگہ مشک کے کچھ دانے رکھے ہوئے ہیں، ان کو پانی میں گھول کر خیمہ پر چھڑک دو، یہ اللہ کے فرشتوں کی مہمانی ہے، انھیں خوشبو مرغوب ہے، اور یہ جو تمھاری بکری ہے، اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت پکنے کیلئے رکھ دو، یہ آنے والے اُن بندوں کی مہمانی ہے، جن کو اللہ میری تجہیز و تکفین کیلئے بھیجے گا، انھیں میرا اسلام پہنچانا، اور ساتھ ہی یہ پیام بھی کہ وہ کھانا کھائے بغیر نہ جائیں، اسکے بعد فرمایا کہ جب میری روح پرواز کر جائے تو تم چادر ڈھانک کے سڑک پر چلی جانا، جب اللہ کے کچھ بندے کسی طرف سے آئیں، تو انھیں اطلاع دیدینا کہ ابوذرؓ جو یہاں مقیم تھا، اس کا انتقال ہوگیا، اور آپ ہی کو اسکے کفن دفن کا کام کرنا ہے۔ جب وہ وقت آگیا، تو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق آپ کی بیوی نے چادر اڑھادی، اور سڑک پر آکر کھڑی ہوگئیں، کچھ دیر کے بعد کوفہ کی جانب سے غبار سا اُٹھتا نظر آیا، اندازہ ہوا کہ کوئی قافلہ آرہا ہے، قافلہ بہت تیز رفتاری سے آرہا تھا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور و معروف صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے، جو اپنے گیارہ بارہ ساتھیوں کے ساتھ کوفہ سے مکہ معظمہ کو جارہے تھے، ان کو بہت تاخیر سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ خط ملا تھا کہ

تم حج کے موقع پر مکہ معظمہ آکر مجھ سے ملو، چونکہ دن بہت کم رہ گئے تھے، اسلئے بہت تیز رفتاری کے ساتھ یہ قافلہ منزلیں طے کرتا ہوا مکہ معظمہ کی طرف جارہا تھا، بہرحال جب یہ قریب آئے اور ایک اکیلی عورت کو اس طرح سڑک پر کھڑے دیکھا، تو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے اپنے ناقہ کو روکا، تو انھوں نے اطلاع دی کہ صحابیِ رسولؐ حضرت ابوذر غفاریؓ جو یہاں رہتے تھے، ان کا انتقال ہوگیا ہے، اور ان کی تجہیز وتکفین وغیرہ کا انتظام آپ ہی کرنا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے جیسے ہی نام سنا "سیدنا ابوذر، سیدنا ابوذرؓ" کہتے ہوئے اپنی اونٹنی سے کود پڑے، قافلہ وہیں رُک گیا۔ حضرت ابوذرؓ نے ایک پیام ان آنے والوں کو یہ بھی دیا تھا کہ اگر آپ لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہو، جو کبھی کسی حکومتی عہدے پر نہ رہا ہو، اور اسکے پاس میرے کفن کیلئے کپڑا ہو، تو وہ کپڑا میرے کفن کیلئے دیدیا جائے اور مجھے اسی میں کفنایا جائے ورنہ میری اسی چادر میں مجھے کفنایا جائے۔ ان محترم بیوی نے یہ پیام بھی پہنچادیا، اللہ کی شان گیارہ، بارہ آدمیوں کے اس قافلے میں صرف ایک انصاری نوجوان ایسے تھے جو اس شرط پر پورے اُترتے تھے، اور وہ کبھی کسی حکومتی عہدے پر نہیں رہے تھے، انھوں نے کہا کہ میں اپنے احرام کیلئے یہ دو چادریں لیکر گھر سے چلا تھا، ان کا سوت بھی میری ماں نے اپنے ہاتھ سے کاتا تھا، بہرحال انھوں نے وہ چادریں پیش کردیں، اور وہی حضرت ابوذر غفاریؓ کا کفن بنیں، روایات میں آگے یہ بھی ہے کہ تجہیز وتکفین سے فارغ ہوکر حضرت ابن مسعودؓ مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، تو حضرت ابوذر غفاریؓ کے گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے، اور امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچادیا۔

بس اسی ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو کس درجہ کا یقین و اذعان حاصل تھا۔

میرے محترم بزرگو اور دینی بھائیو!

یہی ایمان ویقین اصل دولت ہے، یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص میراث ہے، یہی دین کی روح ہے، یہی چیز ہے جو آدمی کو نفس کی اور اغراض کی غلامی سے نکال کر اللہ کا اور صرف اللہ کا بندہ بنادیتی ہے، اور پھر اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے، اور اسکے بعد دین کے راستہ کی ہر مشکل اس کیلئے آسان ہوجاتی ہے، صحابۂ کرامؓ کا خاص سرمایہ اور اُن کا اصل جوہر یہی یقین تھا، اور یہی ان کی اصل طاقت تھی، پھر اُس وقت سے لیکر اب تک جتنے خاصانِ اُمت اور اکابرِ دین گذرے ہیں ان کا اصل سرمایہ بھی یہی ایمان ویقین تھا۔

اور جیساکہ میں نے عرض کیا، بس یہی اصل دولت ہے، اور ہمارے پاس اگر یہ نہیں ہے بلکہ صرف عقیدہ ہے، اور کچھ اعمال ہیں تو اسلام کا ایک درجہ تو حاصل ہے لیکن مقامِ ایمان نصیب نہیں ہے، اور یہ اُن بدویوں والا حال ہے، جن کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :" قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم "

میرے محترم بزرگو اور بھائیو!

اسکے بعد میں ذرہ برابر تواضع وانکسار کے بغیر بالکل سچائی سے عرض کرتا ہوں کہ جب میں اپنا جائزہ لیتا ہوں، تو اپنا حال یہی پاتا ہوں کہ ایمان ویقین کا یہ مقام اور حال مجھے نصیب نہیں ہے، ہاں الحمدللہ اسلام کا درجہ نصیب ہے (اور یہ بھی بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ کفر وانکار نہیں ہے، الحاد نہیں ہے، تشکیک نہیں ہے، اسلامی عقیدہ نصیب ہے، کچھ ٹوٹے پھوٹے اسلامی اعمال بھی نصیب ہیں، لیکن یقین واذعان کی وہ اصل دولت جس کا نام ایمان ہے، وہ مجھے حاصل نہیں ہے) اور دینی واخروی نقطۂ نگاہ سے یہ میرا بہت بڑا خسارہ ہے ——— میں آپ سے سچائی سے کہتا ہوں کہ اگرچہ میں کوئی دولت مند آدمی نہیں ہوں، لیکن اللہ کے فضل وکرم سے مجھے زندگی میں وہ آرام وسکون حاصل ہے، جو بہت سے دولت مندوں کو شاید حاصل نہ ہو اسی طرح بغیر کسی اہلیت اور استحقاق کے آپ جیسے بلند مرتبہ حضرات بھی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اسی طرح مجھ پر اللہ تعالیٰ کے اور بھی بے حد وحساب احسانات ہیں، اور اس لحاظ سے میری یہ دنیوی زندگی گویا کامیاب زندگی ہے، لیکن میں اپنے مالک کی قسم کھاکے کہتا ہوں کہ اس حقیقتِ ایمان اور دولتِ یقین کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے میری زندگی دراصل بڑے خسارے کی زندگی ہے، اور اگر میں اسی محرومی کی حالت میں دنیا سے چلا گیا، تو سخت ناکام جاؤں گا، اسلئے اپنی ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت اور اپنے کاموں میں سب سے بڑا کام میں یہی سمجھتا ہوں کہ کسی طرح یقین وایمان کی اس دولت کو حاصل کروں،

لہ یہ بدوی لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، اے پیغمبر! آپ ان سے کہئے کہ تم کو ایمان کا مقام ابھی حاصل نہیں ہوا ہے (بلکہ تمہاری موجودہ حالت بس اسلام والی حالت ہے، اسلئے ایمان کا دعویٰ نہ کرو) بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں" اور دینِ اسلام میں داخل ہوگئے ہیں، اور ایمان جس حقیقت کا نام ہے وہ ابھی تمہارے دلوں میں نہیں اُتری ہے - ۱۲

اس کے لئے میں آپ سے دُعا کا بھی طالب ہوں۔

اسکے بعد میں آپ حضرات کی خدمت میں صفائی سے یہ بھی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر آپ حضرات نے کبھی اس نقطۂ نظر سے اپنا جائزہ نہ لیا ہو، تو ضرور یہ جائزہ لے کر دیکھیں، میرا خیال ہے کہ جائزہ کے بعد آپ میں سے بھی بہت سے حضرات اپنا حال کچھ میرا سا ہی پائیں گے، اور یہ حال خواہ ہم میں سے کسی کا ہو، ہرگز قابلِ اطمینان نہیں ہے، اور ہم میں سے جو کوئی اس حالت میں اس دنیا سے چلا جائے وہ بڑے خسارہ میں ہے۔ — سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی دولت کو عام کرنے تشریف لائے تھے، اور قرآن مجید کی دعوت اور اس کا پیام ہمارے لئے یہی ہے: "یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا" (اے ایمان لانے والو! سچے مومن بن جاؤ، اور حقیقتِ ایمان حاصل کرنے کی کوشش کرو)۔

اسکے بعد میرے اور آپ کے سامنے سوال آتا ہے، کہ یقین و ایمان کی یہ دولت کس طرح حاصل کی جائے؟ — میں عرض کر چکا ہوں، کہ میں خود اس دولت کا سرمایہ دار نہیں ہوں، بلکہ طالب اور متمنّی ہوں لیکن چونکہ اللہ کے صاحبِ یقین بندوں کو دیکھا ہے، اور اُن سے اُن کے تجربات سُنے ہیں، اور اگلوں کے کچھ حالات کتابوں میں پڑھے ہیں، اسلئے اس سلسلہ میں بھی ایک مختصر بات عرض کرتا ہوں، شاید اللہ کا کوئی بندہ وہ فائدہ اٹھاسکے جو اپنی بے عملی اور شومئی قسمت سے میں خود نہیں اُٹھا سکا۔

میرے بزرگو اور دوستو!

اللہ تعالیٰ کی ایک کریمانہ سنّت یہ ہے کہ اگر کوئی بندہ جس کو یقین کی یہ دولت ابھی نصیب نہیں ہے مگر وہ اس کا طالب ہے، تو اگر وہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری والی اہلِ یقین کی سی زندگی گذارنے لگے، اور اللہ کے دین کے راستہ میں اور اسکی رضا طلبی میں اپنی خواہشات اور اپنے مال و جان کو اخلاص کے ساتھ اصحاب یقین کی طرح قربان کرنے لگے، تو اللہ تعالیٰ اُس کو اس دولت سے محروم نہیں رکھتے، اسی طرح طلب صادق کیساتھ کسی صاحبِ یقین بندہ کی صحبت اس مقصد کیلئے ہزاروں برس کی مجرّب اکسیر ہے، اور ہماری یہ دنیا ایسے بندوں سے ابھی خالی نہیں ہوئی ہے — اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ حضرات کو اپنی اس ضرورت کا صحیح احساس اور صادق طلب، اور اسکی سی بےچینی عطا فرمائے، اور جس راستہ پر چلنے سے یہ دولت ملتی ہے، اس پر چلنے کی توفیق دے۔

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

قسط چہارم
آخری قسط

حدیث پرویز

از : عتیق الرحمٰن سنبھلی

(سلسلہ کیلئے دیکھئے الفرقان بابتہ ربیع الاول ۶۹ھ)

الائمۃ من قریش سقیفۂ بنی ساعدہ کی تاریخی روداد میں جو چند در چند پہلو پرویز صاحب نے ذخیرۂ حدیث پر اعتراضات کے نکالے تھے ہم ان میں سے ایک کے سوا سب فارغ ہو چکے ہیں۔ وہ ایک پہلو جو تشنۂ کلام ہے، بقول پرویز صاحب کے تاریخ کا یہ بیان ہے کہ

"جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا، تو حضرت ابو بکرؓ اٹھے، اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ "الائمۃ من قریش" خلافت قریش ہی میں رہے گی۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابو بکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔"

اس پر پرویز صاحب کا اعتراض یہ ہے، جو آپ پڑھ چکے ہیں کہ :۔

"یہ حدیث متفق علیہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے، لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسول اللہ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآن مسلسل اور متواتر نسل اور خون کے تمام امتیازات مٹا کر مساواتِ انسانیہ اور تکریم آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی۔ آپ اس امر کا تصوّر بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسول یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی! یہ ایک روایت

قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرم کے اُسوۂ حسنہ کو باطل قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار و مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حق خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کرلیا، یعنی ہماری تاریخ ایک ہی واقعہ میں خدا کے رسولؐ اور رسول کے صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کرجاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔"

جہاں تک "تاریخ کے اس بیان" کا تعلق ہے اسکی صحت تسلیم کرنے میں تو ہمیں بعض وجوہ سے اشکال ہے، جیسا کہ ہم پہلے اپنے موقع پر اشارۃً اس کا اظہار کرچکے ہیں۔[ل] لیکن یہ ہمیں بہرحال تسلیم ہے کہ "الائمۃ من قریش" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اس لئے پرویز صاحب کا اعتراض علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے، اور ہمیں اُس پر غور کرنا چاہیئے۔

پرویز صاحب کے اعتراض کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جملہ کو ارشاد رسول تسلیم کرنے سے انھیں اس خیال کی بنا پر انکار ہے کہ اس سے نسل و خون کے امتیازات کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور مساواتِ انسانیہ اور تکریم آدمیت کی جو تعلیم قرآن دنیا رہا اور خود حضورؐ عمر بھر اس پر عامل رہے یہ اس کے خلاف ہے ——— لیکن یہ پرویز صاحب کا محض مفروضہ یا ان کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ اولاً تو اس ارشاد کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کو امامت عامہ کے لئے نامزد فرما رہے ہوں، بلکہ اسکی حیثیت (اسکے آگے کے الفاظ (یعنی پوری حدیث) کو مدنظر رکھتے ہوئے) پیشین گوئی کے انداز میں ایک دورخی تنبیہ کی نکلتی ہے کہ ایک طرف قریش اس منصب کے شرائط کو ملحوظ رکھیں، دوسری طرف باقی لوگ اس منصب کے معاملہ میں قریش سے لاحاصل مزاحمت نہ کریں۔

پوری حدیث یوں ہے:-

ل اس سلسلہ میں تیسری قسط میں ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ واقعہ کی روداد جو صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتی ہے وہ اس سے مختلف ہے۔

الائمۃ من قریش (ما عملوا	ائمہ قریش ہی میں سے ہوتے رہیں گے،
ثلاث) اذا حکموا عدلوا	جب تک کہ ان میں تین باتیں رہیں گی ،
واذا عاھدوا وفوا	ایک یہ کہ وہ فیصلوں میں انصاف کرتے
وان استرحموا رحموا	ہوں، ۲ عہد کے پابند ہوں، سوم یہ کہ رحم
فمن لم یفعل ذالک	کے موقع پر رحم کریں۔ پس جو ان میں سے
منھم فعلیہ لعنۃ اللہ	ایسا نہیں کرے گا، اس پر اللہ کی اس
والملائکۃ والناس	کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت
اجمعین لایقبل منھم	ہو گی۔ اور کوئی چیز انھیں اس انجام سے
صرف ولا عدل	نہ بچا سکے گی۔

بتائیے حدیث کے ان پورے الفاظ کو دیکھتے ہوئے کیونکر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "الائمۃ من قریش" کا مطلب حکومت کے لئے قریش کی نامزدگی ہے ــــــ لیکن اگر کسی طرح یہ مان بھی لیا جائے کہ ان الفاظ کا مطلب قریش کی نامزدگی ہی ہے، تب بھی اس سے نسل و خون کے امتیازات کو تسلیم کرنا اور مساوات انسانیہ کے اصول کو نظر انداز کرنا اس وقت لازم آ سکتا تھا جب کہ قریش کو صرف قرشیت کی بنا پر بلا کسی زائد شرط کے حکومت کے لیے نامزد کیا جاتا، اور بلا کسی شرط کے امامت ان کا حصہ قرار دی جاتی۔ لیکن یہاں تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ تین تین شرطیں لگی ہوئی ہیں بلکہ ان کو اگر وہ کھو دیں تو باوجود قرشیت کے ان کا حصہ امامت اور خلافت نہیں بلکہ اللہ کی، اُسکے فرشتوں کی اور تمام بنی آدم کی لعنت ہے۔!

ذرا غور تو فرمایئے! اگر "الائمۃ من قریش" میں قریش کی نامزدگی نسل پرستی کے اصول اور بین الانسان تفریقات و امتیازات کے تخیل کی حامل ٹھیرائی جائے تو ان اگلے الفاظ کے کیا معنیٰ رہجاتے ہیں جن میں قریش کے استحقاق امامت کو بعض خاص اعمال و اوصاف کے ساتھ مشروط کیا جا رہا ہے، اور کہا جا رہا ہے کہ قریش ہزار قریش ہوا کریں لیکن اسلام میں ان کی امامت اسی وقت تک چل سکتی ہے جب تک ان میں عدل گستری۔ عہد کی پابندی اور رحم پروری کے اوصاف رہیں۔ کہیں کہا جا رہا ہے کہ جب تک وہ اللہ کی اطاعت اور راستکے

دین پر قائم رہیں (ما اطاعوا اللہ واستقاموا علی امرہ) کہیں کہا جا رہا ہے کہ جب تک وہ دین کو قائم رکھیں ــــــ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر کہا جا رہا ہے کہ جب وہ یہ شرائط پورے نہ کریں تو مسلمانوں کی امامت کے بجائے ان کا حصہ اللہ کی، اسکے ملائکہ کی اور تمام بنی آدم کی لعنت ہے

دوسری حدیث میں اسی بات کو یوں فرمایا گیا ہے کہ:۔

یا معشر قریش فانکم اھل	اے جماعت قریش! بے شک تمھیں کو اس
ھٰذا الامر مالم تعصوا اللہ	امت کی سربراہی کا کام انجام دینا ہے
فاذا عصیتموہ بعث الیکم	جبتک کہ تم اللہ کی نافرمانی نہ کرنے لگو پس جب
من یلحاکم کما یلحیٰ ھٰذا	تم اُسکی نافرمانی کی روش اختیار کروگے تو وہ
القضیب ــــــ لقضیب	تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا، جو تمھیں اس
فی یدہٖ۔	طرح ادھیڑ کر رکھدینگے جس طرح دیکھو یہ شاخ
	جو میرے ہاتھ میں ہے ادھیڑی جاتی ہے۔

تعالیٰ اللہ! ــــــ کہ

یاروں نے بُت شکن کو بُت ہی بنا کے چھوڑا

جو حدیثیں نسلی برتری کا بت چکنا چور کئے دے رہی ہیں، اور جن کا منشا ہی یہ ہے کہ قریش کہیں قرشیت کے بھلاوے میں نہ رہ جائیں اور یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ امامت وسیادت جو ان کے نصیب میں آرہی ہے انکی قرشیت کی بنا پر اور اس بنا پر ہے کہ اللہ کو انکی نسلی نسبت کی بنا پر ان سے کوئی خاص پیار ہے۔ تعالیٰ اللہ! کہ انھیں حدیثوں کے ایک ٹکڑے میں نسل پرستی کی بو سونگھی جا رہی ہے اور ناموس رسالت کی حفاظت کا روپ بھر کر کہا جا رہا ہے

"یہ کبھی رسول اللہ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟"

ــــــ دہائی دی جا رہی ہے کہ:۔

"ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکر نے انصار و مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حق خلافت کے لیے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری

تاریخ ایک ہی واقعہ میں خدا کے رسول اور رسول کے صحابہ کبارؓ کے متعلق
نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لیے قرآن آیا تھا۔"

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

"الائمۃ من قریش" کیوں؟

عجب معاملہ ہے کہ کہیں "الائمۃ من قریش" کو قرآن کی بنیادی تعلیمات اور رسول اکرم کے اسوۂ حسنہ کے خلاف قرار دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ حدیث کا متفق علیہ ذخیرہ بھی مشکوک ہے تو کہیں اس بنیاد پر یہ غتنہ پرور اصول وضع کرنے کی سعی فرمائی جارہی ہے کہ دین کے اصولوں میں عملی ضروریات کے لحاظ سے ترک و انتشار کا عمل بھی کیا جاسکتا ہے اس لئے ہم آج یہ چاہتے ہیں کہ اس حدیث کی حقیقت اور اس کا راز اچھی طرح واضح کردیں تاکہ لوگوں کے دماغ جو نت نئی تحقیقات وانکشافات سے پریشان ہو رہے ہیں، سکون پالیں اور اس قسم کی شکوک اور اصول آفرینیاں آئندہ اُن کے انتشار ذہنی کا باعث نہ بن سکیں۔

یہ دونوں کوششیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا اس دعوے پر مبنی ہیں کہ "الائمۃ من قریش" ایک دستوری قرارداد، ایک فیصلہ اور نامزدگی کا ایک فرمان ہے ــــــ ہم نے اس دعوے کو رد کرتے ہوئے ابھی کہا تھا کہ اولاً تو یہ سب کچھ نہیں، یہ ایک پیشین گوئی ہے، اگرچہ محض برائے پیشین گوئی نہیں، بلکہ ایک با مقصد پیشین گوئی ہے۔ یعنی اس مستقبل قریب کے واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے قریش اور دوسرے لوگوں کو دو مختلف باتوں پر تنبیہ کرنا مقصود ہے، لیکن اگر کسی طرح مان بھی لیا جائے کہ یہ قریش کی امامت کا ایک فرمان ہے اور دستوری فیصلہ ہے تب بھی اس کا قریش کی قرشیت سے کوئی تعلق نہیں، ورنہ حدیث میں اسکے بعد کے تمام الفاظ بے معنی ہوں گے ــــــ یہی بات ہم نے جولائی اور اگست ۱۹۵۸ء کے الفرقان میں بہت تفصیل کے ساتھ ان صاحب کے جواب میں لکھی تھی جو حدیث الائمۃ من قریش کو قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھر کی تعلیم مساوات کے خلاف قرار دے کر اس سے

دین کے اصولوں میں حکمتِ عملی کے ماتحت ترک و استثناء کے جواز کا اصول ثابت فرما رہے تھے۔ جہاں تک اس مضمون کی حملہ حدیثوں کے سیاق اور الفاظ کا تعلق ہے، ہم نے ایک ایک حدیث کی تحلیل کرکے بتایا تھا کہ سیاق اور الفاظ سے سراسر ہماری تائید ہوتی ہے، ان صاحب سے اسکے جواب میں تو بجز اسکے اور کچھ بنا نہیں کہ انھوں نے بعض بزرگوں کی عبارتیں پیش کردیں کہ دیکھو فلاں بھی اسکو امر اور حکم ہی مانتے ہیں، اور فلاں بھی اور فلاں بھی۔ اور تم ایک نرالے فاضل وقت آئے ہو کہ ایک نئی بات پیدا کر رہے ہو! ـــــ گویا بعینہ وہی رویہ جس سے انھیں ہمیشہ چڑ تھی کہ وہ تو دلیل سے ایک بات کہیں اور اس کا جواب بزرگوں کے اقوال سے دیا جائے ـــــ البتہ ایک اعتراض انھوں نے ہماری اس بات پر (کہ اگر یہ ایک نامزدگی اور قرارداد تھی بھی تو قرشیت کی بنا پر نہیں بلکہ قریش کی اہلیت کی بنا پر تھی) یہ کیا تھا کہ اہلیت کی بنیاد پر بھی کسی ایک قبیلے اور ایک خاندان کو حکمرانی کے لئے نامزد کرنا اصولِ مساوات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔ اسلئے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قریش سے باہر کا کوئی آدمی کتنا ہی اہل کیوں نہ ہو اس منصب پر نہیں آسکتا، اس لئے کہ وہ قرشی نہیں ہے ـــــ

ہم سمجھتے ہیں کہ پرویز صاحب بھی زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکیں گے وہ یہی ہوگی، اس لیے ہم اس سلسلہ میں ایک فیصلہ کن بات کہدینا چاہتے ہیں، جس کے بعد کسی قیل و قال کی گنجائش نہ رہے۔

بہت سی باتیں اپنا ایک خاص پس منظر رکھتی ہیں جس کو نظر انداز کر دیجئے تو بات الجھ جائے گی۔ اور پس منظر کے ساتھ دیکھئے تو اس میں کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوگی۔ ان زیر بحث احادیث کا بھی یہی حال ہے کہ ان کا ایک خاص پس منظر ہے جس کو ملحوظ رکھنے پر ان میں مساوات و عدم مساوات اور قبائلی تفریق و امتیاز کی کوئی بحث پیدا نہیں ہوتی۔

احادیثِ امامتِ قریش کا پس منظر یہ معلوم ہے کہ قریش بنی اسمٰعیل میں سے ہیں، اور بنی اسمٰعیل کا معاملہ یہ ہے کہ ان کو عام امتِ محمدی میں ایک مخصوص مقام حاصل ہے، جس کے یہ دو خاص امتیازات ہیں:-

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اوّلاً بنی اسمٰعیل کی طرف ہے۔ اور اُسکے بعد جمیع دنیائے عرب و عجم کی طرف آپ کی بعثت میں بنی اسمٰعیل اعضا و جوارح کی حیثیت سے آپکے شریک ہیں۔
۲۔ بنی اسمٰعیل جس دین (ملۃ ابراہیمی) سے انتساب رکھتے اور نسلاً بعد نسلٍ اسکے وارث تھے اسکو اسلام نے نظامِ عقائد و اعمال میں مادۂ اصلیہ کی حیثیت حاصل ہے۔ انھیں کے ملّی شعائر انھیں کی عادات اور انھیں کے رسوم و رواج اور صالح مالوفات و معروفات سے کہنا چاہیئے کہ اسلامی دین و شریعت کا ڈھانچہ تیار ہوا ہے۔

ان دونوں باتوں پر قرآن اور زبانِ رسالت ناطق ہے! ـــــ کس طرح؟ ـــــ یہ آپ ... ہمارے بجائے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے سمجھئے۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

ارشاہ صاحبؒ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں باب "الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان" (تمام دینوں کو منسوخ کرنے والے دین کی ضرورت) کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:-

ولما انفرز کل قوم بملۃ	اور جب ہر قوم نے اپنی ایک الگ ملت ٹھرائی۔
و انتحلوا سننا وطرائق	اور کچھ خاص طور طریقے ہر ایک نے اپنا لئے
و ناضلوا دونھا بألسنتھم	پھر ان کی حمایت میں ان کا تعصب جدال و
وقاتلوا علیھا بأسنّتھم	قتال کے رنگ میں ڈھل گیا اور ساتھ ساتھ
ووقع فیھم الجور اما لقیام	یہ بھی ہوا کہ ان میں حقیقت دین سے انحراف
من لا یستحق اقامۃ الملۃ	اور زیغ رونما ہونے لگا۔ خواہ اس وجہ
بھا او لاختلاط الشرائع	سے ان کی پیشوائی نا اہلوں کے ہاتھ میں
الاتباعیۃ ودسّھا	چلی گئی، یا اس وجہ سے کہ کچھ من گھڑت
فیھا او لتھاون حملۃ	باتیں ایجاد ہو کر اصل دین میں مل گئیں یا
الملۃ فاھملوا کثیرا مما ینبغی	اس لیے کہ حاملین ملت نے سہل انگاری
فلم تبق الا دمنۃ لم تتکلم	اختیار کی اور اپنے بعض فرائض انھوں نے

من اوزار وفي ولامت كل ملة
أختها وانكرت عليها وقاتلتها
واختفى الحق، مست الحاجة
الى امام راشد يعامل
مع الملل معاملة الخليفة
الراشد مع الملوك الجائرة
.... وهذا
الامام الذى يجمع الأمم
على ملةٍ واحدة يحتاج
الى اصولٍ اخرى غير الاصولِ
المذكورة فيما سبق ــ منها
انْ يدعو قومًا الى السنةِ
الراشدة ويزكيهم ويصلح
شانهم ثم يتخذهم بمنزلةِ
جوارحه فيجاهد اهل
الارضِ ويفرقهم في الآفاقِ
وهو قوله تعالى "كنتم
خير امّةٍ اخرجت للنّاسِ"

ترک کر دیئے۔ الغرض اصل دین کا نام نشان
تک مٹ گیا ——— اور ہر ملت
کو دوسری ملت پر کیچڑ اچھالنے، برا بھلا کہنے
اور اس سے جنگ آزما ہونے کے سوا کوئی
کام نہ رہا۔ اور پھر قدرتی طور پر حق کا چہرہ
چھپ کر رہ گیا، تو ضرورت ہوئی کہ ایک
امام حق شناس و حق شعار پیدا ہو۔ اور ان
تمام ملتوں کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو
ایک خلیفۂ راشد بگڑے ہوئے اور ستم پیشہ
ملوک و سلاطین کے ساتھ کرتا ہے ......
یہ امام جسے تمام قوموں کو ایک ملت پر
لا کر جمع کرنا ہے اپنے کارِ منصبی کے لئے ان
اصولوں کے علاوہ کچھ دوسرے اصولوں
کا بھی محتاج ہے جو سابق میں بیان ہوئے
ہیں۔

ان خاص اصولوں میں سے پہلا
اصول یہ ہے کہ وہ امام ایک خاص قوم
کو راہِ مستقیم کی دعوت دے۔ اور ہمہ تن
ان میں مشغول ہو کر، اُن کا پورا پورا تزکیہ اور پوری پوری اصلاح کرے، پھر ان کو
اپنا دست و بازو بنا کر اپنی کوششوں اور محنتوں کا رُخ تمام اہلِ ارض کی طرف پھیر
دے اور اپنے ان رفقاء کو عالم میں پھیلا دے۔ یہی حقیقت ہے۔ اللہ کے ارشاد
"کنتم خیر اُمّۃٍ اُخرجت للنّاس" کی۔

۲۔ "نبوت کی حقیقت اور اس کے خواص" کے باب میں تحریر فرماتے ہیں:-

واذا اقتضت الحكمة	اور جب حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہو کہ مفہّمین[1] کے
الالٰهية ان يبعث الى الخلق	طبقے میں سے کسی ایک کو مخلوق کی طرف
واحداً من المفهّمين[1]	مبعوث کرکے اسے لوگوں کے ظلمتوں سے
فيجعله سبباً لخروج الناس	نور کی طرف نکل آنے کا ذریعہ بنائے۔
من الظلمات الى النور	اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر لازم
وفرض الله على عباده	کردے کہ اپنے چہرے (سر) اور اپنے دل
ان يُسلموا وجوههم وقلوبهم	اسکے لئے جھکا دیں۔ اور ملأ اعلیٰ میں ان
له وتأكّد في الملأ الاعلى	لوگوں کے لیے رضامندی ثبت ہوجائے
الرضا عمن انقاد له وانضمّ	جو جھک کر اس مبعوث کا دامن پکڑ لیں
اليه واللعن على من خالفه	اور ان لوگوں کے لیے لعنت ثبت
وناواه فاخبر الناس بذلك	ہوجائے جو اسکی مخالفت پر کمربستہ ہوں۔
والزمهم طاعته فهو النبي	پھر اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس کی خبر دے،
واعظم الانبياء شأناً من له	اور مبعوث کی اطاعت ان پر لازم کردے
نوع آخر من البعثة	تو یہی نبی ہے۔ اور سب سے بلند مرتبہ نبی
ايضاً وذلك ان يكون	وہ ہے جسے اس عام قسم کی بعثت کے
مراد الله تعالى فيه ان	علاوہ ایک اور خاص قسم کی بعثت بھی
يكون سبباً لخروج الناس	حاصل ہوتی ہے۔ اور اس بعثت
من الظلمات الى النور	در بعثت کے معاملہ کی تشریح یوں ہے
وان يكون قومه خير امة	کہ ایک تو اللہ خود اس نبی کو مبعوث
اُخرجت للناس فيكون	فرمائے کہ وہ لوگوں کے ظلمات سے نور
بعثه يتناول بعثاً آخر	کی طرف نکل آنے کا ذریعہ ہو

[1] انسانوں کے اس طبقہ کے لیے شاہ ولی اللہ صاحب کی اصطلاح ہے جن میں سے انبیاء مبعوث ہوتے ہیں۔

والی الاول وقعت الاشارة فی قوله تعالیٰ هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم" الآیة والی الثانی فی قوله تعالیٰ "کنتم خیر امة اخرجت للناس" وقوله صلی الله علیه وسلم "فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین"۔

(ایضاً ص [illegible])

یہ کہ اسکی خاص قوم خیر امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لیے اٹھائی جائے۔ پس اس طرح اس (نبی اعظم) کی بعثت اپنے اندر ایک دوسری بعثت لیے ہوتی ہے۔ (یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو قرآن سے ثابت ہے) چنانچہ پہلی قسم کی بعثت کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہوا ہے کہ "هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم" اور دوسری طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ "کنتم خیر امة اخرجت للناس" نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "(اے میرے اصحاب) تم آسانی پیدا کرنے کے لیے مبعوث کئے گئے ہو سختی اور تنگی پیدا کرنے کے لئے نہیں!"

(۴) "دینِ اسلام اور دین یہودیت و نصرانیت میں اختلاف کے وجوہ و اسباب" پر کلام ہوئے فرماتے ہیں:۔

ومنها ان النبی صلی الله علیه وسلم بعث بعثة تتضمن بعثة اخری فالاولیٰ انما کانت الی نبی اسمٰعیل وهو قوله تعالیٰ "هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم"

اس اختلاف کا ایک سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکے بعد دیگرے دو بعثتوں کے جامع تھے۔ آپ کی پہلی بعثت خاص بنی اسمٰعیل کی طرف تھی۔ جیساکہ ارشاد الٰہی ہے کہ "وہی خدائے عزیز و حکیم ہے جس نے مبعوث فرمایا امیین میں ایک

وقوله تعالى "لِتُنذِرَ قَوْماً مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ" وهذه البعثة تستوجب أن يكون مادة شريعته ما عندهم من الشعائر وسنن العبادات ووجوه الارتفاقات إذ الشرع هو إصلاح ما عندهم لا تكليفهم بما لا يعرفونه أصلاً ونظيره قوله تعالى "قرآناً عربياً لعلكم تعقلون" وقوله تعالى "لو جعلناه قرآناً أعجمياً لقالوا لولا فُصِّلت آياته أأعجمي وعربي" وقوله تعالى "وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه" والثانية كانت إلى جميع أهل الأرض عامة بالاتفاق الراجع.... ....فحصل له بحسب هذا الكمال أحكام أخرى غير أحكام التوراة

(ص ۱۲۲-۱۲۳ ایضاً)

رسول انھیں میں سے" الخ۔ نیز جیسا کہ اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ "تا (کہ اے نبی) تو ڈر کی بات بتائے اس قوم کو جس کے باپ دادا میں کوئی بتانے والا نہیں آیا اور اس بنا پر وہ غافل ہیں"

اور اس بعثت کا تقاضہ یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا مادۂ اصلیہ وہ شعائر عبادات کی وہ شکلیں اور ارتفاقات کے وہ طریقے ہی ہوتے جو بنی اسمٰعیل میں مروج تھے۔ اسلئے کہ شرع نام ہے انھیں چیزوں کی اصلاح کا، جو لوگ اختیار کئے ہوئے ہوں۔ نہ کہ اُن باتوں کے عائد کئے جانے کا جن سے وہ قطعاً ناآشنا ہوں!

—— اور یہ بات ان آیات قرآنی سے بھی سمجھی جاسکتی ہے جو مسئلہ زیر بحث میں نظیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فرمایا گیا ہے "ہم نے یہ قرآن عربی میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھ سکو" —— "اگر ہم یہ قرآن کسی عجمی زبان میں اتار دیتے تو کہا جاتا کہ اسکی آیات ہمارے لیے (ہماری زبان میں) واضح کیوں نہیں کی گئیں خوب ہے یہ بات کہ یہ عجمی زبان ہو درانحالیکہ رسول عربی ہے!" —— اور ہم نے نہیں بھیجا کبھی کوئی رسول مگر اسکی قوم کی زبان میں پیغام دے کر!" (باقی ترجمہ دوسرے صفحہ پر)

(یہ آنحضرتؐ کی پہلی بعثت ہوئی۔) دوسری بعثت آپ کی روئے زمین کے تمام باشندوں کی طرف تھی جس کا خاص مقصد دنیا میں امن و امان اور خلافت راشدہ کا قیام تھا۔ پس اس کمال کے باعث آپ کی شریعت کچھ ایسے احکام پر بھی مشتمل ہوئی جن سے تورات خالی تھی[1]۔

شاہ ولی اللہؒ کی ان تصریحات سے یہ حقیقت بہت واضح اور مدلل طور پر سامنے آجاتی ہے کہ عام امت محمدیؐ میں بنو اسمٰعیل کو ایک مخصوص مقام حاصل ہے، جس کے یہ دو خاص امتیازات ہیں

(۱) یہ کہ ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اولاً بنو اسمٰعیلؑ کی طرف ہے۔ اور اسکے بعد تمام اہل ارض کی طرف آپؐ کی بعثت میں بنو اسمٰعیل اعضاء و جوارح کی حیثیت سے آپ کے شریک ہیں۔

(۲) یہ کہ ــــــ بنو اسمٰعیل جس دین (ملت ابراہیمی) کے نام لیوا تھے اسلام کے نظام عقائد و اعمال میں اسکو بنیادی مادہ کی حیثیت حاصل تھی[2]۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اب اسی کے اندر کی ایک دوسری حقیقت کو نظر میں لائیے!۔

---

[1] یہاں جس بحث میں شاہ صاحب نے حضور کی دوسری بعثت کا ذکر فرمایا ہے اس بحث میں اس دوسری بعثت کا یہ پہلو ذکر کرنے کی ضرورت چونکہ نہیں تھی کہ اس بعثت میں بنی اسمٰعیل بھی اعضاء و جوارح کی حیثیت سے آپکے شریک تھے، اسی لیے شاہ صاحب یہاں اسکے ذکر سے خاموش رہے ہیں۔ ورنہ اس بعثت ثانیہ کا پورا نقشہ یہی ہے جیسے شاہ صاحب کی سابقہ دونوں عبارتیں واضح کر چکی ہیں۔ فَتَنَبَّہْ!

[2] بنو اسمٰعیل کا یہ دوسرا امتیاز خاص طور پر ایسی ظاہر و باہر حقیقت ہے کہ اسکو منوانے کے لیے قرآن کے کسی نص صریح کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر کسی کو یہ کمی محسوس ہوتی ہو کہ شاہ صاحب نے اس پر قرآن کا کوئی صریح بیان نہیں پیش کیا۔ تو ہم اسکے لئے سورۂ حج کے ان الفاظ کا حوالہ دے سکتے ہیں کہ ارشاد ہوا ہے۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ، مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ۔ (اور اللہ نے نہیں رکھی ہے دین میں تمہارے لیے کوئی تنگی۔ بلکہ استوار کیا ہے اس کو تمہارے باپ ابراہیم کی ملت پر)

ـــــــــ اور وہ یہ کہ

عام امتِ محمدیؐ کے اندر بنی اسمٰعیل کو جو خاص حیثیت عامۃً حاصل تھی وہ واقعہ کے اعتبار سے، بنی اسمٰعیل کے اندر قریش کو خاصۃً حاصل ہے ـــــــــ قریش کا قبیلہ، بنو اسمٰعیل کی وہ شاخ ہے جو تمام بنی اسمٰعیل میں ہمارے بیان کردہ امتیازات کا سب سے بڑھ کر اور سب سے اول درجہ پر حامل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق کا سب سے پہلا مخاطب یہی قبیلہ بنا۔ اس لئے کہ یہ خود آپ کا قبیلہ تھا۔ اسی قبیلے سے آپ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اٹھے ـــ پھر قدرتی طور پر وہی آپ کی تلاوت وتعلیم اور تربیت وتزکیہ کا سب سے پہلا حلقہ بنے، وہی آپ کے لائے ہوئے دین کی اشاعت کے کام میں سب سے پہلے درجہ پر سرگرم ہوئے اور انھیں کے پیروں چل کر آپ کی دعوت اِدھر اُدھر بڑھی ـــــــــ پھر قریش ہی کی زبان وہ لسانی زبان تھی جس میں دینِ حق کی تعلیمات نازل ہوئیں ـــــــــ اور قریش ہی اُن شعائر وسنن اور ان عادات وطُرق کے نمائندہ تھے جو اس زمانہ میں دین ابراہیمی کے بچے کھچے نقوش تھے۔ قریش ہی ملت ابراہیمی کے اُس مرکز ـــــــــ خانۂ کعبہ ـــــــــ کے متولی تھے جو ان شعائر وسنن اور عادات واطوار کا مرجع تھا۔ اور انھیں کے حصہ میں اپنے باپ اسمٰعیلؑ کی جانشینی آئی ہوئی تھی۔ غرض وہی تھے جو، تمام عرب ہی میں نہیں بنو اسمٰعیل کے درمیان بھی، دین ابراہیمی پر اتھارٹی (سند) اور اُسکے سب سے زیادہ معتبر حامل ووارث تھے!

یہ ہے احادیثِ امامت قریش کا وہ پس منظر جس پر متنبہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی ان احادیث کو نسلی تفریق وامتیاز کا حامل ٹھہرا کر ان کا سرے سے انکار کر ڈالتا ہے۔ اور کوئی اس مفروضہ "تفریق وامتیاز" کو عملی ضروریات کے ماتحت استثناآت کے قبیل سے ٹھہرا کر ان احادیث سے یہ نظریہ ثابت کرنے لگتا ہے کہ اسلامی تحریک کا کوئی قائد حکمتِ عملی کے طور پر دین کے قطعی اصولوں میں بھی حسب ضرورت استثناآت کر سکتا ہے!

حرفِ مطلب | ذرا غور فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے قائم کئے ہوئے دینی نظام کی سربراہی اور پیشوائی کے لئے ـــ جسے اصطلاح میں خلافت اور امامت سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ اس جماعت اور اس گروہ سے زیادہ کون موزوں اور کون حقدار ہو سکتا تھا، جسے اللہ نے

امت محمدی کی اُس ممتاز نسل میں بھی اوّلیت اور اقدمیت کا شرف بخشا جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوّلاً مبعوث فرمائے گئے، اور جسے باقی تمام دنیا کی طرف آپ کی بعثت میں اعضاء وجوارح کی حیثیت سے آپ کا شریک بنایا گیا تھا؟ کون اس امامت کا حق اُس جماعت اور اُس گروہ سے بہتر طور پر ادا کرسکتا تھا جسے رسول کی دعوت کا اوّلین مخاطب بننے اور اس دعوت کے مؤمنین اولین فراہم کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، جسے سب سے پہلے یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپؐ کی تلاوت آیات اور تعلیم و تزکیہ سے مستفیض ہو ____ اور اس طرح جس کی مدّتِ فیضیابی اور تمام خوش نصیبوں سے ہمیشہ کے لئے بڑھ گئی ____ جسے سب سے پہلے درجہ پر یہ سعادت حاصل ہوئی کہ اُس کے افراد آپؐ کی دعوت کے سب سے پہلے خادم اور آپؐ کے سب سے پہلے رفیق کار و شریک حال و ہمدم و دمساز بنے؟ اور کون اس امانت کا حق اس جماعت اور اس گروہ سے بہتر طور پر ادا کرسکتا اور اس سے بڑھ کر دین کا رمز آشنا ہوسکتا تھا جس کی خاص زبان میں قرآن نازل ہوا اور جس کی خاص زبان میں مشکوٰۃ نبوت سے احادیث صادر ہوئیں، اور جو اُن عادات و شرائع، اُن شعائر و سنن کا نمائندہ حامل و وارث اور ان میں مرجع و سند کی حیثیت رکھتا تھا جن سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظام عقائد و اعمال میں مادّہ اصلیہ کا کام لیا گیا تھا؟ ____ اور کون دین کو قائم رکھنے کی اس ذمہ داری کو اُس گروہ اور اس جماعت سے زیادہ دلچسپی اور طبعی رغبت کے ساتھ اُٹھا سکتا تھا جس کے لیے یہ دین اپنی اصلیت کے لحاظ سے اس کا آبائی دین ہو۔ اور پھر اُسے اپنے آبائی دینی نظام میں عرصہ سے مرکزیت بھی حاصل چلی آرہی ہو اور (اپنے اعتقاد کے مطابق) اس دینی نظام کی اقامت، کا کام وہ گہری دلچسپی کے ساتھ انجام دیتا آرہا ہو؟

پس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فیصلے اور ایک فرمان کی حیثیت سے آپ کا یہ ارشاد ہمارے سامنے آتا ہے کہ اسلامی نظام کی سربراہی میرے بعد قریش میں رہے گی۔ اس نظام کے متولی قریش ہی ہوں گے۔ اور انہی کے لئے اس نظام میں مرکزیت اور پیشوائی کا مقام مخصوص رہے گا۔ الّا یہ کہ وہ ایسا نہ کریں۔ تو یہاں کیا موقع اور محل ہے کہ مساوات و عدم مساوات کی بحث اٹھائی جائے اور اس فیصلہ و فرمان کا رشتہ نسل و نسب کے امتیازات سے جوڑا جائے؟ یہ اگر فیصلہ و فرمان تھا تو قریش کی قرشیت سے اس کا کیا واسطہ؟ اس کا مدار تو تمام تر وہ دوسرے امتیازات تھے جو تقدیر د

حکمت الٰہی سے قریش کے نصیب میں آگئے تھے۔ اور جن کے قریش کے پلّے میں ہوتے ہوئے، کوئی وجہ نہیں تھی کہ اسلامی نظام کی امامت کے معاملہ میں قریش اور غیر قریش کو برابر کر دیا جاتا۔ اور امت کو یہ ہدایت دینے میں تکلف کیا جاتا کہ قریش، جو تاریخی طور پر اس کردار (خلافت نبوت) کے لیے تیار ہوئے ہیں، اس کردار کی ادائیگی انھیں کا خاص حصّہ جانی جائے اور اس میں اُن سے کوئی مناقشہ نہ کیا جائے! ——— خصوصاً جبکہ ان قابل لحاظ امور کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت بھی جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی کہ

النّاس تبعٌ لقریش .صالحھم	عرب کے لوگ مجموعی طور پر قریش ہی کے تابع ہیں
تبعٌ لصالحھم وشرارھم تبعٌ	جو صالح ہیں وہ صالح قریشیوں کے تابع ہیں.
لشرارھم۔	اور جو بد ہیں وہ ان کے بدوں کے!

شاہ ولی اللہؒ کی تائید | یہ توجیہ کوئی خالصۃً ہماری اُپج نہیں بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب جیسی مسلّم شخصیت کے ہاں بھی ہمیں ارشادِ "الائمۃ من قریش" کی فی الجملہ یہی توجیہ ملتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

والسبب المقتضی لھذا	اور اس ارشاد کا موجب یہ تھا کہ وہ (دین)
انّ الحقّ الّذی اظھرہٗ	حق جو اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ علی لسانِ نبیّہٖ صلی اللہ	کی زبان پر ظاہر فرمایا. وہ قریش کی زبان
علیہ وسلم انما جاء بلسان	میں آیا اور اُن کی عادات کے سانچے
قریش وفی عاداتھم وکان	میں رونما ہوا تھا احکام و ضوابط میں
اکثر ما تعین من المقادیر	جو حدیں اور مقداریں متعین
والحدود ما ھو عندھمُ	ہوئیں وہ زیادہ تر وہی تھیں جو اُن
وکان المعدّ لکثیرٍ من الاحکام	میں معروف تھیں، اور اکثر
ما ھو فیھم فھم اقوم بہٖ	احکام کا مادّہ وہی چیزیں تھیں
واکثر النّاس	جو ان میں مروج تھیں۔ پس وہی

تمسکا بذلک۔ الخ	قدرتی طور پر اُس کو سب سے زیادہ
(حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم	قائم رکھنے والے اور سب سے زیادہ
ص۱۴۹ ا مبحث خلافت)	مضبوطی سے اس کو تھامنے والے ہو سکتے تھے۔

اور اسی بات کو ایک دوسری جگہ دوسرے عنوان سے تحریر فرماتے ہوئے تو شاہ صاحب صرف ایک فقرے میں اس رمز آشنائی کا حق ادا کر گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

ولیس التکحل فی العینین کالکحل۔	مصنوعی سرمگینی قدرتی سرمگینی کے برابر نہیں ہو سکتی۔
(جلد اول ص۱۱۹۔ باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان)	

ہم تو سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحبؒ نے قریش کے جن امتیازات کی طرف اشارہ کیا ہے، صرف یہی امتیازات یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ حضورؐ نے اگر اپنی خلافت کے لیے قریش کو نامزد فرمایا تو بجا فرمایا، اور اس میں نسلی و قبائلی تفریق و امتیاز کا کوئی دخل نہیں ——— چہ جائیکہ ہم ان تمام امتیازات کو نظر میں رکھیں جن کی تفصیل ہم نے اوپر کی!

یہ کلام اس تقدیر پر تھا کہ "الائمۃ من القریش" ایک فیصلہ و فرمان نبوی ہو! ——— لیکن ہمارے خیال میں اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ و فرمان نہیں، بلکہ الٰہی تقدیر و حکمت کا ایک فیصلہ تھا جو زبانِ رسالت پر ایک خاص مقصد سے جاری ہوا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے قرآن کی حسبِ ذیل چند آیات شاید مفید ہوں۔

۱۔ ارشاد ہوا ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ	اور جب آزمایا ابراہیم کو اُس کے رب نے چند
بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ	باتوں سے اور اس نے پورا کیا ان باتوں کو۔
جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ	تو فرمایا پروردگار نے کہ میں کردوں گا تجھ کو

وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ
عَهْدِي الظَّالِمِينَ ○
(البقرہ ع ۱۵)

لوگوں کا پیشوا ـــــ کہا اور میری اولاد میں
سے بھی ؟ فرمایا نہیں پہونچتا ہے میرا
قرار ظالموں کو۔

۲۔ اس کے بعد متصلاً ہی حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کی ایک دُعا شروع ہوتی ہے، جو کعبہ کی تعمیر کرتے ہوئے ان بزرگوں کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ
السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا
مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا
أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا
وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ
رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُزَكِّيهِمْ ۔ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ○
(ایضاً)

اے رب ہمارے قبول فرما ہم سے بیشک تو
سننے اور جاننے والا ہے ـــــ اور اے
رب ہمارے کر ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار
اور ہماری اولاد میں بھی بنا ایک امت اپنی
فرمانبردار اور بتا ہم کو ہماری عبادت کے
طریقے۔ اور معاف فرما (ہمارے گناہوں کو)
کہ تو بڑا معاف فرمانے والا رحیم ہے۔ اور
اے رب تو اٹھا ان میں سے ایک رسول
انہیں میں کا کہ پڑھا کرے اُن پر تیری آیتیں اور
سکھائے ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں اور
سنوارے اُن کے ظاہر و باطن کو۔ بیشک تو
بڑا زبردست حکمت والا ہے۔

۳۔ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ
هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ
فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ
أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ
الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَٰذَا

اور محنت کرو اللہ کی راہ میں جیسا حق ہو
اس کی راہ میں محنت کا۔ اُس نے پسند فرمایا
ہو تم کو ـــــ اور نہیں رکھی ہو تمہارے
اوپر کوئی تنگی اور دقت دین میں۔ ملت
ہو تمہارے باپ ابراہیم کی۔ اسی نے رکھا

لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَہِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُہَدَاءَ عَلَی النَّاسِ (الحج۔ع ۹)

تمھارا نام مسلمین پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی ــــــ کہ شہادت دینے والا ہو رسول تمھارے اوپر اور تم ہو شہادت ساری دنیا پر۔

ان آیات میں معنوی لحاظ سے جو باہم ربط نظر آتا ہے، اس کے پیش نظر اگر ہم ان کے مضامین کو ایک ترتیب میں پرو کر بیان کریں تو اس کی شکل یوں بنے گی کہ۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے خوش ہو کر فرمایا کہ
"میں بناؤں گا تجھے لوگوں کا پیشوا!"

(ب) اس پر حضرت ابراہیم نے عرض کی کہ
"اور میری اولاد میں سے بھی!"

(ج) جواب ملا کہ ــــــ ہاں یہ ہو سکتا ہے لیکن یہ واضح رہے کہ
"میرے قول و قرار میں ظالم (نافرمان) ہرگز نہیں داخل ہو سکتے ہیں"

گویا یہ فیصلہ ہو گیا کہ اولاد ابراہیم میں جو فرماں بردار ہوں گے وہ اس امامت کے وارث ہوں گے۔

(د) اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی امامت کا نشان خانۂ کعبہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل سے تیار کرایا تو ان بزرگوں نے اس خدمت کی قبولیت کی دعا مانگتے ہوئے جناب باری میں درخواست پیش کی کہ۔

"اے پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار رکھ ــــــ اور ہماری اولاد میں بھی ایک امت اپنی فرمانبردار بنا! ــــــ اور اپنا ایک رسول انھیں میں سے اٹھا جو انھیں تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے!"

(ہ) اب جب وہ رسول جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیکر میں مبعوث ہو جاتا ہے۔ اور ان میں تعلیم و تزکیہ کا کام کر کے انھیں "امت مسلمہ" بنا لیتا ہے اور ان کے ذریعہ دوسرے بھی اسلام کے دائرہ میں داخل ہو کر امت مسلمہ کے زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس امت مسلمہ سے

خطاب کر کے فرماتا ہے۔

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو پھیلانے میں محنت کا حق ادا کرو۔ اس لیے کہ اللہ نے تمھیں کو اس منصب کی سعادت کے لیے منتخب فرمایا ہو کہ اللہ کا رسول تم پر اس دین کی شہادت ادا کرے۔ اور تم باقی ساری دنیا پر شاہد حق ہو۔"

کوئی شبہ نہیں کہ اس خطاب میں اس وقت کے تمام فیض یافتگان نبوی آجاتے ہیں، مگر اس بیچ میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ ۔	اور نہیں رکھی اس نے تمھارے اوپر دین میں کوئی تنگی اور دقت۔ ملت ہے تمھارے باپ ابراہیم ہی کی تو اسی نے رکھا تمھارا نام مسلمین۔

—— یہ ابراہیم و اسمٰعیل کی اس دعا کو یاد دلاتا ہے جس میں فرمایا گیا تھا "وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ" اور پھر اس کا سلسلہ اس عہد الٰہی سے جڑ جاتا ہو جس میں نسل اسمٰعیلی کی "امت مسلمہ" کے لیے امامت و پیشوائی کا فیصلہ پنہاں تھا۔ اس طرح اس سے یہ بات نکلتی ہو (واللہ اعلم بالصواب) کہ گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم (امام العالمین) کی نیابت مجموعی طور پر ان سبھی مخاطبین کا حصہ ہو، مگر اس نیابت کا مظہر کامل خاص نسل اسمٰعیلی کے "مسلمین" ہی ہیں[1]۔ جو قدرتی طور پر "ابیکم" کا اولین مخاطب اور "سمّٰکم المسلمین" کا اولین مصداق بنتے ہیں۔

یہ عمومی نیابت کی بات ہوئی جو "لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ" کے بعد "وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" سے مستفاد ہوتی ہو۔ لیکن جب اس نیابت کا ایک خاص مظہر اسلام کی اصطلاحی امامت و خلافت بھی قرار پائی جو ظاہر ہو کہ کسی خاص شخص ہی میں مرکوز ہو کر وجود پذیر ہو سکتی ہو تو بنی اسمٰعیل کے لیے ثابت شدہ تمام میاں تو کا بدرجہ اتم جامع ہوتے بلکہ ان کے مابین کچھ مزید امتیازات کا بھی حامل ہونے کی بنا پر (جن کی تفصیل ہم کر چکے ہیں)،

[1] ہمارے عقلی وجوہ بنی اسمٰعیل کے وہی امتیازات ہیں جو حکمت الٰہیہ نے بنی اسمٰعیل کے حصہ میں ڈال دیے تھے۔

اُن کی قریشی شاخ ہی ہو سکتی تھی جس کے افراد میں یہ اصطلاحی "امامت و خلافت" مرکوز ہو کر وجود پذیر ہونی چاہیے تھی۔ اور استحقاق سے قطع نظر عملاً بھی بنی اسمٰعیل کی امامت و خلافت منعقد ہونے کی کوئی شکل اس کے سوا نہ تھی کہ یہ امامت امامتِ قریش کی شکل میں منعقد ہو ۔۔۔ پس اس نقطۂ نظر سے یہ لازم آیا کہ بنی اسمٰعیل کی عمومی امامت کا الٰہی فیصلہ عملاً امامتِ قریش کے فیصلہ کو متضمن ہو۔

پس یہی معنی ہیں ہمارے اس قول کے کہ "الائمۃ من قریش" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ و فرمان نہیں تھا، بلکہ حقیقتاً یہ الٰہی تقدیر و حکمت کا ایک فیصلہ تھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر اس مقصد سے جاری ہوا کہ ایک طرف لوگوں کو بتا دیں کہ

لا یعادیہم (ای قریشاً) اَحَدٌ اِلّا کَبَّہُ اللہ علی وجہہ

(اس معاملہ میں قریش سے کوئی منازعت نہیں کرے گا مگر یہ کہ اللہ اس کو منہ کے بل گرا دے گا)

اور دوسری طرف خاص قریش کو بتا دیں کہ

یہ منصب قرشیت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے کہ قریش ہمیشہ قریش رہیں گے تو ہمیشہ ائمہ دین بھی رہیں گے، بلکہ یہ اجتباءیت "ما اقاموا الدین" کی شرط کے ساتھ مشروط اور اس خاص زمانی قید کے ساتھ مقید و محدود ہے۔

چنانچہ آپ نے اور کھول کر فرمایا

فمن لم یفعل ذٰلک منہم فعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین

(جو ان میں سے اس سے انحراف کرے گا اس کا حصہ لعنت ہو اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور تمام بنی آدم کی!)

۔۔۔۔ اور کھول کر فرمایا

فاذا عصیتموہ بعث الیکم من یلحاکم کما یلحیٰ ھٰذا القضیب

(جب تم اللہ کی حکم عدولی کروگے تو وہ تم پر ایسے لوگ مسلط کرے گا جو تمہاری کھال ادھیڑ کر رکھ دیں گے)

تنبیہ ہم نے شروع کے الفاظ میں بھی اشارہ کر دیا تھا اور اب پھر اس کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اپنے خیال کے مطابق "الائمۃ من قریش" کی اصل حقیقت بتاتے ہوئے ہم نے یہ جو آیاتِ قرآنی پیش کی ہیں اس کی نوعیت استدلال کی نہیں بلکہ محض ایک ذہنی انتقال کی ہو۔ ورنہ ہمارے اس خیال کی اصل بنیاد تو حدیث کا سیاق اور اس کے پورے الفاظ ہیں۔

(باقی آئندہ)

ALFURQAN (Regd. No. A-353) LUCKNOW.